قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

جنوری 2015، قیمت -/15₹

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

مولانا الطاف حسین حالی
شخصیت اور خدمات

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب و غریب خبریں

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

دنیا کے مذاہب ◆ کامکس کہانی ◆ نانی کا صندوق

اردو ایس ایم ایس ◆ اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

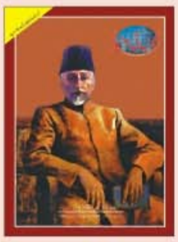

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

مشمولات

ماہنامہ **اردو دنیا** دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:17 شمارہ:01 جنوری 2015

مدیر : ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر : نصرت ظہیر

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: فیض الاسلام فیضی

قیمت -/15 روپے   سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000   شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 22-7-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002

فون: 040-24415194

اداریہ

ہماری بات — 4

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط — 5

انٹرویو

مرزا حامد بیگ — عبدالحی — 8

خصوصی گفتگو

کونسل کے وائس چیئرمین مظفر حسین سے خصوصی گفتگو — شاہد اختر انصاری — 12

کور اسٹوری: حالی صدی

حالی کی شخصیت خودنوشت اور مکاتیب کے آئینے میں — ثنا کوثر — 14

حالی کی انفرادیت: 'یادگار غالب' کے آئینے میں — فریدہ خاتون — 16

حالی بحیثیت تنقید نگار — ندیم احمد 'ندیم' — 19

حالی کی تنقید کا اخلاقی پہلو — آفتاب احمد آفاقی — 23

حالی کی عشقیہ شاعری — شہزاد انجم — 25

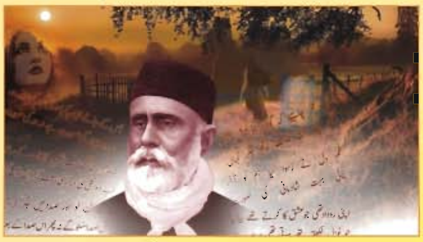

حالی بحیثیت شاعر — جہانگیر احمد — 28

اردو غزل میں حالی کا امتیاز — اشرف لون — 32

حالی- بیداریٔ نسواں کے علمبردار — محمد اقبال — 35

موازنۂ حالی و شبلی — محمد طاہر — 39

یادگار غالب کا آخری باب — الطاف حسین حالی — 42

کلام حالی — الطاف حسین حالی — 45

زبان و تعلیم

ملک میں اردو کے حالات اعداد و شمار کی روشنی میں — عبدالعلیم قدوائی — 48

ادبی مباحث

اردو ناول میں سادیت پسندی — زرینہ خانم — 51

میر کی شاعری میں عشق کا مقام — سلمان بلرامپوری — 54

شہر بین

شہر اردو اورنگ آباد — رفعت سعید قریشی — 56

کریئر

جیت آپ کی مٹھی میں ہے — اسما مسعود — 61

کتابوں کی دنیا

تبصرہ و تعارف — 63

عالمی اردو نامہ

اردو نامہ — ادارہ — 73

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ — 75

ہماری بات

اردو میں تخلیقی عمل کے آغاز کا سراغ بلاشبہ ایک ہزار سال پہلے کے ہندوستانی ادب کی تاریخ میں بھی تلاش کیا جاسکتا ہے لیکن اردو تنقید کی تاریخ سو، سوا سو سال سے زیادہ پرانی نہیں۔ تنقید کے نام پر توصیفی کلمات یا ہجویہ انداز کے جملے اس سے پہلے کی کتابوں، خاص طور سے اردو شعرا کے تذکروں پر مشتمل تصانیف میں یہاں وہاں ضرور مل جاتے ہیں لیکن ادبی تعین قدر کا باضابطہ اور شعوری آغاز حالی، محمد حسین آزاد، امداد امام اثر اور شبلی کی بدولت اور انہی عظمائے ادب کے دور میں ہوا۔ حالی اردو کے پہلے نقاد اور ان کی تصانیف 'یادگارِ غالب' اور 'مقدمۂ شعر و شاعری' اردو کی پہلی باقاعدہ تنقیدی کتابیں ہیں جنھوں نے اردو زبان و ادب پر تنقید کے دروازے وا کیے اور اردو میں تخلیقی ادب کی قدر و قیمت کے تعین اور اس پر بحث کا علمی سلسلہ شروع ہوا۔

گزشتہ ایک صدی میں اردو تنقید نے بڑی تیزی سے اپنا سفر طے کیا ہے۔ اس کے باوجود کئی تشکیک پسند ذہن آج بھی اردو تنقید کو مغربی تنقیدی رویوں اور پیمانوں کے مقابلے میں پس ماندہ مانتے ہیں۔ بلکہ ہمارے بعض دانش وروں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ 'اردو تنقید' نام کی کوئی شے ہے ہی نہیں، یا یہ کہ، اردو میں ابھی تنقید پیدا ہی نہیں ہوئی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس سوچ کو ایک طرح کے انتہا پسندانہ رویے سے زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ یہ امر روز روشن کی طرح عیاں ہو چکا ہے کہ ترسیلی وسیلوں کی فراوانی اور فکری و نظریاتی اختلاط اور متنی ماٰخذ تک رسائی کی سہولتوں سے فیض یاب ہونے کے نتیجے میں اردو تنقید نہ صرف بالغ ہو چکی ہے بلکہ دنیائے ادب کو خود اپنا بھی بہت کچھ دینے کے قابل ہوگئی ہے۔ اردو کے تنقید نگاروں کی فکر اب ان بلندیوں کو چھونے لگی ہے جہاں جدید مغربی نظریوں اور تھیوریوں کی چکا چوندھ سے ان کی بالغ نظری خیرہ نہیں ہوتی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ مغرب کی نئی روشنی کو آنکھ سے آنکھ ملا کر دیکھتے اور پرکھتے ہیں اور جو کچھ اس میں اچھا ہو صرف اسی کو قبول کرتے ہیں۔ میر و نظیر ہوں یا غالب و اقبال، اردو ادب کی تقریباً سبھی عہد ساز ہستیوں کے تخلیقی شعور اور فکر و وجدان کو ہم نے محض مغربی تنقید کے قدیم و جدید پیمانوں کی مدد سے نہیں سمجھا ہے، بلکہ انھیں مشرقی جمالیات اور ہندوستانی تخلیقیت کے ارتقا کی روشنی میں سامنے رکھ کر ہی پوری طرح جانا اور پہچانا ہے۔ ادب میں ترقی پسندی، جدیدیت، ساختیات، پس ساختیات اور مابعد جدیدیت جیسے، یکے بعد دیگرے، مغرب سے آنے والے تنقیدی زاویوں، ادبی تھیوریوں اور تخلیقی رویوں کو ہم نے مشرقی اور ہندوستانی روایتوں اور جمالیاتی قدروں کو ساتھ رکھ کر ہی اپنایا ہے۔

آج جب ہم اردو تنقید کے اس شاندار سفر پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو نقطۂ آغاز مولانا حالی کی ہی ذات ٹھہرتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی مغربی ادب تو کجا، انگریزی زبان کے ادب اور اس کے تخلیقی رویوں سے بھی براہِ راست آشنا نہیں تھے، لیکن فارسی اور عربی زبانوں کے ادب سے اچھی واقفیت رکھنے کی بدولت اتنی استعداد ان میں ضرور تھی کہ وہ اردو زبان و ادب کے تخلیقی موضوعات، اسالیب اور ذہنی رویوں کے اصلاح طلب گوشوں کو نہ پہچان سکیں۔ فطرت سے وابستگی کی خالص ہندوستانی روایت کو اپنا کر ادب کو زندگی سے جوڑ کر دیکھنا اور دکھانا ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے کہ آج بھی اردو ادب کا کوئی نقاد انھیں نظرانداز کر کے دو قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ مولانا حالی کی وفات کے سو سال پورے ہونے پر ایک کور اسٹوری یوں تو دسمبر 2014 کے 'اردو دنیا' میں ہی شائع ہو جانی چاہیے تھی لیکن قومی اردو کونسل کی عالمی اردو کانفرنس کی وجہ سے 'حالی صدی' کی کور اسٹوری اب نئے سال کے پہلے شمارے میں شائع کی جا رہی ہے۔ اس میں ہم نے حالی کی شخصیت اور فکر و فن کو سمیٹنے کی پوری کوشش کی ہے جو امید ہے آپ کو پسند آئے گی۔

مولانا حالی کا انتقال 31 دسمبر 1914 کو ہوا تھا۔ یکم جنوری 2015 سے نیا سال شروع ہو رہا ہے جو ملک و قوم کے لیے نئی امیدیں، نئے خواب اور نئے امکانات لے کر آ رہا ہے۔ آپ سبھی کو نیا سال مبارک ہو۔ 'اردو دنیا' اور قومی اردو کونسل کے تمام اراکین کی دعا ہے کہ ہم سب کو نیا سال راس آئے اور یہ ہمارے تمام نیک ارادوں اور خواہشوں کی تکمیل کا سال ثابت ہو۔ آمین!

(پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین)

آپ کی بات

اخلاق اثر

صادق منزل، چوکی امام باڑہ، بھوپال

دوسری عالمی اردو کانفرنس کے کامیاب انعقاد کے لیے مبارک باد۔ کانفرنس کی رپورٹ مکمل، معیاری اور آنکھوں دیکھی خوبی رکھتی ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی کے کلیدی خطبہ کے آخر میں سرویشور دیال سکسینہ کی نظم میں بانسوں کے پل کا بڑا خوبصورت بیان ہے یعنی وہ زبان جو عوام کی ہے اور پل کا کام کرتی ہے۔ تبصرے کا حصہ بہت اچھا ہے اور نئی مطبوعات اس میں شامل ہیں۔ نومبر کے شمارے میں ہماری بات میں وزیر اعظم کے اعلان کی گونج ہے۔ آپ کی بات میں کرشن بھاوک کا مکتوب خوب ہے۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

سابق ممبر راجیہ سبھا، ریٹائرڈ استاد سیاسیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

'اردو دنیا' کا نومبر 2014 کا شمارہ موصول ہوا۔ مراسلات کے کالم میں جناب کرشن بھاوک کا لفظوں کے استعمال کے بارے میں محققانہ مراسلہ بہت زیادہ پسند آیا۔ بلاشبہ مراسلہ نگار نے تحقیق کا حق ادا کردیا۔ اس شمارے میں اردو کے مشہور افسانہ نگار اور ناول نویس کرشن چندر پر 11 مضامین شائع ہوئے ہیں جس سے ان کی امتیازی تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان میں حسب ذیل مضامین خاص طور سے پسند آئے: اردو کا مقبول ترین افسانہ نگار از سید احمد قادری، کرشن چندر کے افسانوں میں تقسیم کا المیہ از اسلم جمشید پوری، کرشن چندر قلم کا جادوگر از عظیم اقبال، انسانی قدروں کا مرقع نگار: کرشن چندر از صغیر اشرف، کرشن چندر کا طنز ومزاح مشاہیر ادب کی نظر میں از خان حفیظ، زبان وتعلیم کے تحت: مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلیمی خیالات از احمد امتیاز، شخصیت کے تحت: اردو کے خادم قرآن ابو محمد مصلح سہسرامی از پرویز اشرفی، عالمی اردو نامہ کے تحت: اردو کا رسم الخط مکمل اور بہت خوبصورت ہے: خلیل طوقار از کامران غنی۔

کرشن بھاوک

A-201، گلی نمبر K18، گورونانک نگر، پٹیالہ (پنجاب)

نومبر ماہ کا شمارہ حسبِ معمول جاندار وشاندار ہے۔

محی الدین زور کشمیری کا معیاری مضمون کرشن چندر کے فکشن کے عمیق ودقیق ومطالعے کا ضامن وغماز ثابت ہوا ہے۔ اول صفحے 12 پر ہیری پوٹر کے ساتھ لفظ 'سیزر' کی بجائے 'سیریز' اور اگلے صفحے پر ہی ڈرامے کے نام میں 'Wailing' کی جگہ 'Waiting' درکار تھا۔ (13) موصوف نے کشادہ نظر و وسیع الخیال کرشن چندر جی کی کشمیر کی منظرکشی کے بارے میں ایک قابل متنازع رائے کا اظہار کیا ہے کہ انھوں نے ''کشمیر کی خوبصورتی میں 'خیالی رومانس' کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔'' قصہ کوتاہ یہ کہ کرشن چندر ایسے مصنف ہرگز نہ تھے، جو کہ غیر ضروری موضوعات کی خط کشی کرتے رہتے اور اہم و ناگزیر سماجی مسائل سے دانستاً چشم پوشی ہی کرتے رہتے۔ علی احمد فاطمی نے اپنے بلند پایہ مضمون میں کرشن چندر کے دوسرے ناول 'جب کھیتے جاگے' میں اشتراکی بصیرت کو نہایت عمدگی سے نشان زد کرتے ہوئے ان نقاد پر صحیح طنز کیا ہے کہ ''وہ فطرت نگاری میں کھو جاتے ہیں یا اس کی مزاحمت کو خارجیت سے جوڑ کر کمزور کردیتے ہیں۔۔'' وغیرہ۔ اور یہ لوگ محبت کا وسیع نظریہ بھی نہیں رکھتے ہیں۔'' (ص 18)

اس شمارے میں بقول نصرت ظہیر صاحب کرشن چندر سے وابستہ تعارفی اول جملے (ص 11) ہی کی صدفی صد تائید اور توثیق کرتے ہوئے میں بصد احترام یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اردو ادب میں راقم الحروف نے بھی سب سے قبل کرشن چندر کو ہی پڑھا تھا اور آج تک مطالعہ کر رہا ہے۔ رفیعہ شبنم عابدی کے شاعر معین احسن جذبی، مجروح وغیرہ ادبا سے متعلق متعدد مضامین میں ان کی عمدہ نثر، تنقید وتحقیق کا میں ہمیشہ سے مداح وقائل رہا ہوں۔ اس شمارے میں بھی عورت وتانیثیت کے تناظر میں کرشن چندر کے تخلیق شدہ مقالے کی عمدہ نثر کی بھی جتنی تعریف کی جائے، وہ کم ہی رہے گی۔ میرا ایک 'بیش قیمت مشورہ' یا تجویز ہے۔ اگر ادارہ بنگلہ، گجراتی، مراٹھی، تلگو، ملیالم، کشمیری، پنجابی، ہندی وغیرہ دیگر کسی بھی زبان کے ایک شہرۂ آفاق نمائندہ افسانے کا اردو میں ترجمہ کروا کرا سے ہر ایک شمارے کی زینت بنانے کا ایک معمول بنالے، تو یہ آپ کے موقر مجلّے کے قارئین پر ایک بے مثال کرم ہوگا۔

ایم۔ راگھو راؤ

ساؤتھ سول لائنس، چھندواڑا 480001 (مدھیہ پردیش)

کرشن چندر کو ترقی پسند افسانے کے دور کا ایک روشن ستارہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے سماجی اور انسانی مسائل کو موضوعات بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ ان کا کردار قاری پر اس قدر اثر چھوڑ جاتا ہے کہ اس کے اندر خود بہ خود سماج کے عناصر کے خلاف بغاوت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے قاری کو اپنے ساتھ ایک دلچسپ دنیا میں لے جاتے ہیں جہاں وہ اس کو رنگ برنگے نظارے دکھاتے ہیں۔ کرشن چندر نے جن مسائل پر بھی قلم اٹھایا اس میں صاف گوئی سے کام لیا۔ وہ ہمیشہ اپنے افسانوں کے ذریعے اس خیال کا اظہار کرتے رہے۔ کرشن چندر کی تحریریں دل کو چھونے والی ہیں ان کی کہانیاں حقیقی زندگی کی عکاس ہوتی ہیں۔

پرویز اشرفی

D-321، دعوت نگر، اے ایف انکلیو، نئی دہلی

ماہ نومبر کے شمارے کا سرورق جاذب نظر ہے اور جیسا کہ میری عادت ہے اخبار ہو یا رسالہ سب سے پہلے میں اداریہ پڑھتا ہوں۔ لہٰذا مطالعے کا آغاز ہماری بات سے کیا۔ خوب تر ہے۔ چند دن قبل ہی بذریعہ فون مطلع

کردیا گیا تھا کہ ناچیز کا ایک مضمون بھی شامل ہے۔ میرے لیے اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ جس شمارے میں کرشن چندر جیسے عظیم فنکار اور تخلیق کار کا گوشہ شائع ہوا ہے، اُس میں میرا مضمون ...... اللہ کا بے حد شکر گزار اور آپ کا ممنون ہوں۔

نصرت ظہیر نے بجا فرمایا کہ ''ہم جیسوں سے کوئی پوچھے کہ اردو ادب میں سب سے پہلے کسے پڑھا تو اکثر کا جواب ہوگا: کرشن چندر، منشی پریم چند کے بعد اردو ادب میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ادیب وہی تھے۔'' بچپن کے زمانے میں راقم الحروف نے بھی 'کھلونا' بک ڈپو سے شائع بچوں کے لیے رنگین چھوٹی چھوٹی کتابوں کو پڑھا ہے، ان میں بہت سی کرشن چندر کی لکھی ہوئی تھیں۔

جناب محی الدین زور کشمیری نے 'کرشن چندر کے فکشن' کے تحت اُن کی تخلیقی صلاحیت کا مکمل احاطہ کردیا ہے۔ اُنھیں مبارکباد۔ رفیعہ شبنم عابدی کے احساسات بالکل صحیح ہیں کہ ''کرشن چندر کے تانیثی افکار کچھ مختلف ہیں۔ وہ دعوے کے ساتھ کہتے ہیں کہ دُنیا کا ہر کام عورت کے بغیر ادھورا ہے۔ مثلاً کھیتی باڑی کرنا سب سے پہلے عورت نے سیکھا۔ چاول بھی عورت کی دریافت ہے۔ پودوں اور درختوں کے بیج عورت نے دریافت کیے۔ روٹی پکانے کا فن بھی عورت کی ایجاد ہے اور تو اور کرشن چندر کا خیال ہے کہ انسان نے اپنی سب سے پہلی کہانی کسی عورت، نانی، دادی یا ماں سے سنی ہوگی جو اُس کے بچپن میں رات کے اندھیرے اور سناٹے کے خوف سے بچانے اور زندگی کا حوصلہ پیدا کرنے کی غرض سے اُسے سنائی ہوگی۔ اس طرح لوری، گیت، شاعری اور کہانی کے فن کا آغاز عورت کے ہاتھوں ہوا۔''

اسلم جمشید پوری نے کرشن چندر کے افسانوی مجموعے 'ہم وحشی ہیں' پر جامع مضمون تحریر کیا ہے، جس سے کرشن چندر کی فنی صلاحیتوں کی مزید تہیں کھلتی ہیں۔ ان کے علاوہ محمد صابر حسین، عظیم اقبال، صغیر اشرف نے کرشن چندر پر جو تخلیقات رقم کیے ہیں قابلِ تحسین ہیں۔ تاثیر نواز میر کا مضمون کرشن چندر کی ڈرامہ نگاری بہت پسند آیا۔

احمد امتیاز کا مضمون 'مولانا آزاد کے تعلیمی خیالات' مولانا کی ہمہ جہت صلاحیتوں کا احاطہ کرتا ہے اور ملت کو تعلیم کے میدان میں برادرِ وطن سے آگے نکلنے کی تحریک دیتا ہے۔ ادبی مباحث کے کالم میں ظہیر علی صدیقی نے گنجِ غرائب - ایک مخطوطہ پیش کرکے تاریخ و ثقافت سے شغف رکھنے والوں کے لیے جامع مضمون تخلیق کیا ہے۔ اس سے ریسرچ کرنے والے بھی استفادہ کرسکتے ہیں۔

ڈاکٹر فرحین بیگم

مصباح نگر، گلبرگہ

'اردو دنیا' کے تازہ شمارے نظر نواز ہوئے، ہر

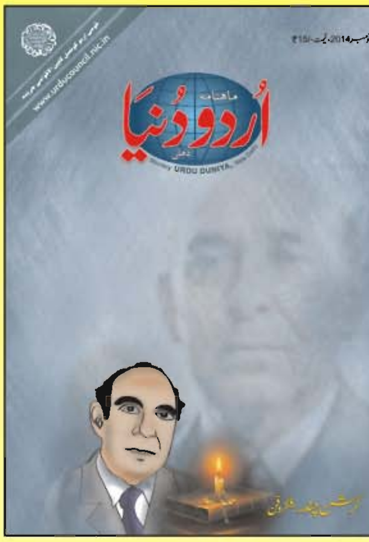

شمارے کی طرح یہ شمارہ بھی نہایت دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ کرشن چندر کے فکر و فن سے واقف کراتا یہ شمارہ ہمارے لیے بہت ہی فائدہ مند رہا اور اس شمارے میں میرا وہاب عندلیب صاحب کی کتاب پر کیا گیا تبصرہ بھی شامل ہے جسے دیکھ کر میری مسرت کی انتہا نہیں رہی۔ میں آپ کی اس حوصلہ افزائی کے لیے بے حد شکر گزار ہوں۔ میرے لیے میرا مضمون آپ کے رسالے کی زینت بننا ہی بڑی مسرت اور حوصلہ افزائی کی بات تھی لیکن چند دنوں پہلے اس تبصرے کے لیے ادارے کی جانب سے معاوضہ ملنے اطلاع ملی ہے جسے دیکھ اور پڑھ کر میری خوشی کی انتہا نہیں رہی۔ میں آپ کی اس نوازش اور حوصلہ افزائی کا دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ میرے تحقیقی کام کے دوران آپ کے رسالے کا مطالعہ میرے لیے بہت فائدہ مند رہا جس کے لیے میں آپ کی اور سارے عملے کی شکر گزار ہوں جن کی کوششوں سے یہ رسالہ پابندی سے منظرِ عام پر آرہا ہے۔

ضیا جعفر

بنگلور (کرناٹک)

نومبر کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس بار آپ نے 'کرشن چندر' پر بڑے خوب صورت انداز میں کئی دانشوروں کی تحریریں پیش کی ہیں۔ رہے کرشن چندر تو وہ میرے محبوب فن کار رہیں۔ میں نے ان کی تخلیقات پڑھ پڑھ کر کچھ لکھنے کی کوشش کی۔ ویسے میں افسانہ نگار ہوں، برسوں پہلے، میں نے بنگلور کے اخبار 'سالار' میں ایک کہانی 'ایک گدھا فلمی نگری میں' لکھا۔ اس کی کئی قسطیں شائع ہوئی جسے قارئین نے کافی پسند کیا۔ یہ تھی میری محبت میں نے کرشن چندر کی کئی کہانیاں پڑھی ہیں ہر کہانی انفرادیت رکھتی ہے۔ کرشن چندر، معمولی سے معمولی واقعہ کو بھی اس انداز سے پیش کرتے کہ قارئین ان کی سحر انگیز تحریر میں کھو جاتا۔ میں آپ سبھی کو مبارکباد دیتا ہوں۔ 'اردو دنیا' نے کرشن چندر پر نمبر نکال کر ان کے چاہنے والوں کے لیے ایک تحفہ دیا ہے۔ ویسے اردو دنیا آئے دن کسی نہ کسی فن کار کے فکر و فن کا جائزہ لیتا رہتا ہے۔

شمس الہدیٰ انصاری (علیگ)

چھوٹے حاجی صاحب، نشاط نگر، واسع پور، دریاباد

'اردو دنیا' نومبر 2014 بروقت ڈاک سے دستیاب ہوا۔ اس قدر Perfect اور Compact ذمے داری میں نے کہیں اور نہیں دیکھی۔ اردو کے عظیم فکشن نگار کرشن چندر کا گوشہ شائع کرکے آپ نے ایک شاندار خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ کرشن چندر کے فکشن کے ضمن میں میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ موصوف کے افسانوں میں فطرت کی رعنائیاں ہر جگہ جلوہ گر ہیں۔ موصوف کے یہاں بظاہر تفریحی لگنے والے افسانوں میں بھی ایک پیغام ہوتا ہے۔ کرشن چندر کا اندازِ تحریر نہایت شگفتہ نیز بے حد خوبصورت ہوتا تھا۔ بسا اوقات موصوف طنز کا تیر چلا کر کردار کو گھائل کردیتے ہیں۔ مولانا آزاد کے تعلیمی خیال کو نثر نگار نے جلا بخشی ہے۔ 'صدیق مجیبی کی شاعری میں استعاراتِ کربلا' شائع فرما کر موضوع کو زندہ جاوید کردیا۔

محمد رفیع انصاری: المدنی

734، بھوسار محلّہ، بھیونڈی (مہاراشٹر)

'اردو دنیا' نومبر 2014 کا شمارہ حسبِ سابق شاندار ہے۔ کرشن چندر کو آپ نے بھرپور خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ بلاشبہ اردو دنیا نے اُس کرشن چندر کو بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے جو خود ہی اپنے قلم کی تخلیق تھا اور آج جو ہمارے بیچ ہوتا تو پورے سو برس کا ہوتا۔ تحریریں تو قیمتی ہیں ہی، کرشن چندر جی کی تصاویر بھی بولتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس شمارے میں احمد وصی صاحب سے مل کر بھی خوشی ہوئی۔

محمد مشرف رضا

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اردو دنیا کا مستقل ممبر نہ ہونے کے باوجود میں اس کا مسلسل قاری ہوں۔ ستمبر، اکتوبر اور نومبر کے شمارے بھی میں نے بڑے شوق و لگن سے مطالعے میں رکھے تو اردو دنیا کا کوئی بھی مضمون دلچسپی سے خالی نہ تھا۔ ستمبر کے ماہنامہ میں ٹیگور اور اقبال جیسے نابغۂ روزگار شعرا اور ہندوستان کے قابل فرزندوں اور اکتوبر کے شمارے میں نظم و نثر کے یکساں بادشاہ علامہ شبلی نعمانی پر خصوصی گوشہ اسی طرح نومبر کے شمارے میں اردو کے ممتاز نثر نگار خاص طور سے افسانے کے لیے مشہور کرشن چندر پر نہایت ہی معلومات افزا مضامین و مقالات قارئین کی خدمت میں پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے لیے اردو دنیا کے تمام ذمے داران قابلِ مبارکباد ہیں۔

کسی بھی شخصیت کے بارے میں خصوصی شمارہ پیش کرنے

سے ان کے لیے خراج عقیدت کا توسب سے بہتر ذریعہ ہوتا ہے اور ہماری طرف سے اسلاف شناسی کا فریضہ بھی انجام پاتا ہے۔ ساتھ ہی قارئین کو استفادے کا ایک بہترین موقعہ مل جاتا ہے اور وہ مستقبل کے لیے ذخیرہ بھی بن جاتا ہے۔

خورشید حیات

16/3 نیو این ای کالونی بلاسپور

اکتوبر 2014 کا اردو دنیا پیش نظر ہے۔ ہندوستان سے شائع ہونے والے ادبی رسائل کے درمیان 'اردو دنیا' کو یہ اولیت حاصل ہے کہ اس نے شبلی نعمانی پر خصوصی گوشہ نکالا۔ آپ سب کا ادب تہذیب جنوں قابل صد رشک ہے۔ شیخ حبیب اللہ کے شبلی نعمانی کو 'فنکار' نے کچھ اس طرح تراشا کہ نومبر 2014 تک سیرت النبی، الفاروق، المامون، الغزالی، شعر العجم، سوانح مولانا روم اور ڈھیر ساری کتابوں کی صورت میں تقریباً ساٹھ ہزار صفحات پر مشتمل اک ذخیرہ چھوڑ کر چلے گئے۔ چاروں دشاؤں میں علم کی قندیلیں اور مسلم نشاۃ ثانیہ کے قمقمے روشن کرنے والے چار حروف کے شبلی ہوں یا پھر حالی، ورق ورق کتاب چہرہ کو جب بھی پڑھا یہ احساس جاگا کہ وہ بھی کیا دن تھے جب سارے چہرے آیات کی صورت لیے باہم مربوط ہو جاتے تھے اور شبلی نعمانی جیسے چہرے جس شہر سے بھی گزرتے نظام تعلیم میں اک نئی تبدیلی کے ساتھ زندگی رنگ چہروں کی روح بیدار ہوتی چلی جاتی تھی۔ ایک آج کا دن ہے جہاں سب کچھ تو ہے مگر ہم اپنے نسب ناموں کو بھول چکے ہیں ماضی کی سنہری روایت کی طرف پیٹھ کیے تیز رفتار زندگی کا حصہ بنتے جارہے ہیں۔ اردو دنیا پریوار، بغیر کسی ڈھول باجے کے ساتھ، سوئے ہوئے شہر میں جاگتی زندگی کا قصہ بیان کرنے کا کام کر رہا ہے۔ قومی اردو کونسل کی پوری ٹیم کو مبارکباد۔ عظمت رفتہ کو جب ہم آواز دیتے ہیں تو شبلی نعمانی کا گول فریم والا چشمہ اس دائرہ کی یاد دلاتا ہے جہاں ہم دائرے میں ہوتے ہوئے بھی دائرہ توڑنے کا ہنر جانتے تھے۔ فرد کی شناخت پہلے سیرت سے ہوا کرتی تھی آج سارا دھیان صورت گری پر ہے۔ نئی نسل کو کلاسک سے جوڑنا بہت ضروری ہے اور یہ کام آپ سب بہت اچھے طریقے سے انجام دے رہے ہیں۔ اس شمارے میں شامل مضامین نے متاثر کیا۔ مگر اک سوال رہ گیا شبلی کی تاریخ پیدائش 1857 میں کب اور کس ماہ میں ہوئی؟

محمود الظفر رحمانی ایڈوکیٹ

جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو اتر پردیش، مقام ٹانڈہ ضلع رام پور

'اردو دنیا' اکتوبر کا شمارہ ملا۔ سرورق شبلی نعمانی کے دیدہ زیب فوٹو سے مزین ہے۔ اس شمارے میں علامہ شبلی نعمانیؒ کی حیات اور خدمات کے معلوماتی مضامین سے نئی نسل کو روشناس کرایا ہے۔ اس کے علاوہ تمام ہی مضامین کو حسین انداز میں سلیقے کے ساتھ پیش کیا ہے نیز جناب خواجہ محمد اکرام الدین نے انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری جناب اطہر فاروقی صاحب کا انٹرویو ''صوبائی اردو اکادمیاں بھی اردو تعلیم کے فروغ کے لیے کام کریں'' بہت پسند آیا۔

مصطفی ندیم خاں غوری

پلاٹ نمبر 4، زرینہ منزل، ورنداون کالونی، قدیم جالنہ (مہاراشٹر)

'اردو دنیا' نومبر 2014 کے ص 7 پر اتفاقاً سب سے پہلے نظر پڑی۔ 'اعتذار' پڑھ کر عجیب سا لگا۔ تمام تر اردو دنیا کو آپ کی اور آپ کے رفقا کار کی قابلیت میں کوئی کلام نہیں۔ دراصل کام کے اژدہام سے ذہن اس درجہ ماؤف ہوجاتا ہے کہ کیا لکھا ہے کچھ بجھائی نہیں دیتا۔ اگر آپ محض اتنا لکھ دیتے کہ 'عربی' کی جگہ 'فارسی' پڑھ لیں تو کافی تھا۔ اسی شمارے کے ص 5 اور 6 پر دی گئی۔ عبارتیں دیکھیں جن میں ستمبر 2014 کے شمارے کے ص 11 کے حوالے سے لکھا تھا۔ تعجب ہوا کہ کبھی کبھی لائق و فائق قارئین سے بھی ایسی باتیں قلم زد ہوجاتی ہیں۔ لفظ 'مواصلت' کے فرہنگِ آصفیہ ترقی اردو بیورو 1987 کے ص 2222 پر چار معنی دیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر لکھنے والا ان میں سے موزوں ترین لفظ مراد لے گا۔ چنانچہ اس لغت میں پہلے دو معنی 'ملنا' اور 'ملاقات کرنا' دیے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے اس لفظ کا استعمال بالکل درست کیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ نصرت ظہیر صاحب نے یہ کہاں لکھا ہے کہ ''اقبال صاحب نے... یہ متنازعہ مصرع کہا تھا'' ہماری رائے میں نکتہ نویسی پر سمجھداری کو فوقیت دینے میں ہی عقلمندی ہے۔

یہ منطق بھی سمجھ سے بالاتر ہے کہ لفظِ 'لغت' اگر واحد ہو تو مونث اور اگر جمع ہو تو مذکر! اِس ضمن میں کسی اصول کا کوئی حوالہ ہے اور نہ یہ تشریح کہ یہ اصول صرف اسی ایک لفظ تک محدود ہے یا ایسے تمام الفاظ پر اس کا یکساں اطلاق ہوگا۔ ویسے غور کیا جائے تو لفظِ 'ساڑی' واحد مونث ہے تو اس کا جمع مذکر کیا ہوگا، اور لفظِ 'چولا' کہیں مونث کا جمع مذکر تو نہیں۔ قدم، اقدام اور اقدامات جیسے الفاظ کے بارے میں موقع بموقع لکھا جاتا رہا ہے کہ جو لفظ مروج ہوجائے وہی صحیح سمجھنا چاہیے (دیکھیے فکر و تحقیق جنوری تا مارچ 2014 قومی اردو کونسل نئی دہلی ص 86) چنانچہ لفظ اقدامات، سیاسیات، معاشیات، سماجیات، ادبیات میں عام طور پر مستعمل ہے۔ اِس لیے اسے قبول کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آنی چاہیے۔ ص 6 کی آخری سطر میں "Printers Devil" کے معنی 'اشاعتی شیطان' لکھے گئے ہیں جب کہ آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری نویں اشاعت 2013 کے ص 1315 پر اس کے معنی 'مطبع میں پیغام رسانی یا بھاگ دوڑ کے کام کرنے والا ملازم'' دیے گئے ہیں۔ اور اسی لغت میں ص 417 پر Printer Devil کے معنی 'چھاپے خانہ کا ہرکارہ' دیے گئے ہیں جو زیادہ موزوں لگتا ہے یا 'مطبع کا ہرکارہ' کہہ لیجیے۔

انوار فلک

جے آئی ٹی کالج، مشرقی چمپارن، موتیہاری، چندن بارہ

میں نے ماہنامہ اکتوبر کے چشمہ علم وادب 'اردو دنیا' سے بہت کچھ سیکھا۔ نابغۂ روزگار ہستی وعبقری شخصیت شمس العلما مولانا شبلی نعمانی کی حیات کے ہر گوشے کو جانا، ان کے فکر وعمل اور شخصیت کے بنیادی عناصر ومحرکات کو پہچانا، ان کی علمی خدمات سے استفادہ کیا۔ لیکن ایک بات آپ سے کہنا مناسب سمجھتا ہوں کہ اگر کسی کی رائے یا عنوان کو حذف واضافہ کے ساتھ شائع کرتے ہیں تو جملے کے باہمی ربط اور اس کے تنظیم وتنسیق کا خیال رکھیں۔ مزید برآں ایک رائے آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں کہ ''شعر و شاعری ایسے سیکھیں'' کے عنوان سے ایک کالم شائع کیجیے کیونکہ شعر وشاعری ہی فن وادب کی معراج ہے۔

مولانا محمد عرفان قادری

استاذ: مدرسہ حنفیہ ضیاء القرآن شاہی مسجد بڑا چاند گنج لکھنؤ

ماہنامہ اردو دنیا ستمبر 2014 کا شمارہ پڑھ کر بے پناہ مسرت ہوئی۔ علامہ ڈاکٹر اقبال اور ٹیگور کی حیات و خدمات پر مشتمل خصوصی گوشہ بہت خوب ہے۔ معصوم عزیز کاظمی کا مضمون بعنوان '20 ستمبر 1857 حالات، واقعات و اثرات' اہمیت کا حامل ہے۔ اس مضمون کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ جمانے کے لیے عیاری سے کام لیا اور اپنے دور اقتدار میں باشندگان ہند پر ظلم وستم ڈھانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ کتابوں کی دنیا، عالمی اردو نامہ، اہم شخصیات کے انٹرویوز، تعلیم وصحت سمیت ماہنامہ کے تمام کالم بے حد معلوماتی ہیں اور قارئین کے ذوق کو تسکین فراہم کرتے ہیں۔ بلاشبہ قومی کونسل نے اردو زبان وادب کو نئی جہت دی ہے اور اس زبان کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے میں تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ اہل مدارس مذکورہ رسائل ومیگزین کا پابندی سے مطالعہ کریں بالخصوص مدارس کے طلباء ماہنامہ بچوں کی دنیا کو مطالعے میں ضرور شامل کریں۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ڈھیر ساری خارجی معلومات اور ذہنی نشوونما کے ساتھ ساتھ ان کی تحریروں کی اصلاح ہوگی اور ہر طرح کے عنوان پر مضمون نگاری کا سلیقہ بھی آئے گا۔

■

عبدالحئ

اردو ہندوستانی تہذیب و تمدن کا استعارہ ہے

مرزا حامد بیگ

مرزا حامد بیگ اردو کے انتہائی سرگرم اور مصروف عمل ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ تخلیق سے تنقید تک ان کا دائرۂ عمل خاصا وسیع ہے۔ ہندوستانی ادب نوازوں کے لیے ان کی شخصیت جانی پہچانی ہے۔ اردو ادب سے تعلق رکھنے والے اکثر سیمیناروں اور کانفرنسوں میں انھیں بڑی محبت اور عزت سے بلایا جاتا ہے۔ 'اردو دنیا' کے لیے دیے ہوئے زیرنظر انٹرویو میں انھوں نے اردو تنقید اور تخلیق دونوں کے تعلق سے اپنے خیالات و نظریات کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ پیش ہیں انٹرویو کے اہم اقتباس:

ڈاکٹر عبدالحی: سب سے پہلے اپنا خاندانی پس منظر بیان کریں۔

مرزا حامد بیگ: میرا آبائی وطن علاقہ چھچھ موضع گرالہ، تحصیل حفرو ضلع کیمبل پور (حال: اٹک) ہے۔ میرا بچپن اور لڑکپن سندھ میں گزرا۔ میری پیدائش کھیم چند بلڈنگ کے ایک فلیٹ، علاقہ صدر کراچی کی ہے۔ وہ یوں کہ میرے والد محترم محمد اکرم بیگ نے جب کیمبل پور سے 1934 میں میٹرک پاس کرلیا تو انگریزوں سے جاگیر اور خطاب یافتہ سر محمد امین، رئیسِ شمس آباد، علاقہ چھچھ نے پنجاب کی انگریز عملداری میں اُن پر سرکاری ملازمت کے تمام دروازے بند کروادیے اور وہ مسلسل بے روزگاری سے تنگ آکر سندھ پولیس میں بھرتی ہوگئے۔ مجھے مصوری کا بھی شوق بچپن سے رہا ہے۔ مصوری میں میرے پہلے استاد شہر دادو کے ماسٹر وریئل تھے۔ ان کی رہنمائی میں 1961 ہی میں، میں نے ویسٹ پاکستان ڈرائنگ ایگزیمیشن پاس کرلیا۔ یہ اس زمانے کے سندھی اخبارات کی ایک خبر بنی کہ بارہ برس کے لڑکے نے یہ امتحان پاس کیا۔

ع ح: آپ ادب کے ساتھ ساتھ دیگر فنون سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ مصوری اور الیکٹرانک میڈیا کے حوالے سے اپنی کارکردگی پر روشنی ڈالیں؟

مرزا حامد بیگ: میں نے نوعمری میں ہی ویسٹ پاکستان ڈرائنگ امتحان ((1961 پاس کرلیا تھا، جب میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا یوں 1968 تک مصوری بھی کرتا رہا۔ لبنیٰ لطیف، انور بیگ اور میری واٹرکلر میں بنائی گئی تصاویر کی ایک کمبائن تصویری نمائش برماشیل کے زیراہتمام آرٹس کونسل، کراچی میں 18 اکتوبر 1967 کو ہوئی۔ اس نمائش کا افتتاح فیض احمد فیض نے کیا تھا۔ مصوری سے شغف کی یادگار میری دو کتابوں 'مصطفی زیدی کی کہانی' اور 'گناہ کی مزدوری' کے ٹائٹل ہیں۔ 1972 سے 1974 تک پی ٹی وی، لاہور سنٹر پر اداکاری اور لاہور ریڈیو پر صداکاری کے علاوہ 1972 ہی میں مشہور ہدایت کار اور فلم ساز رحیم گل کے اسسٹنٹ کے طور پر فیچر فلم 'موسیٰ خاں گل مکئ' بھی مکمل کروائی۔ اکتوبر 1974 میں لیکچرر ہوکر کوہ مری چلا گیا اور اُس کے بعد راولپنڈی میں طویل قیام رہا۔ اس مدت میں پی ٹی وی لاہور، راولپنڈی، اسلام آباد اور پشاور سنٹر کے لیے ڈراما نگاری کی۔ میرے تحریر کردہ ڈراموں میں 'نیند میں چلنے والا لڑکا' (پروڈیوسر: نصرت ٹھاکر)، 'کچھ وی نئیں ہویا' (پروڈیوسر: شاہد مسعود)، 'لاٹ صاحب کی سواری' (پروڈیوسر: شاکر عزیز) اور 'قصہ کہانی' سلسلے کے متعدد ڈرامے (پروڈیوسر: قمبر علی شاہ)

اُسی زمانے کی یادگار ہیں میرے تحریر کردہ افسانے ’زمین جاگتی ہے‘ کو ایوب خاور نے پی ٹی وی لاہور سنٹر کے لیے ’کھوہ‘ کے عنوان سے پروڈیوس کیا تو پی ٹی وی کے دس سالہ دورانیہ میں پروڈیوس کردہ ڈراموں میں اسے بہترین ڈراما کا ایوارڈ ملا۔

ع ح: آپ کے اہل خانہ پولس میں تھے، آپ خود بھی پہلے پہل پولس کی ملازمت میں رہے ساتھ ہی فنون لطیفہ سے بھی وابستگی رہی، افسانہ نگاری سے کس طرح دلچسپی پیدا ہوئی؟

مرزا حامد بیگ: افسانہ لکھنے کی طرف مجھے سندھ کے ایک سابق بیوروکریٹ تھانورداس چندانی لائے۔ 1966 کی بات ہے، میں میٹرک کا طالب علم تھا اور ایک شام پارک میں بیٹھا کرشن چندر کا کوئی ناول پڑھ رہا تھا۔ چندانی صاحب نے میرے قریب آ کر پوچھا کیا پڑھ رہے ہو؟ میں نے بتا دیا تو انھوں نے دریافت کیا: ”رابندناتھ ٹیگور کو پڑھا ہے؟“ یہ نام میرے لیے بالکل نیا تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا تو بولے: ”ٹیگور کو پڑھو کل تمھارے لیے ٹیگور کی کوئی کتاب لیتا آؤں گا۔ انگریزی میں ہوگی، لیکن اُسے انگریزی ہی میں پڑھو گے تو مزہ آئے گا۔“ اگلے روز انھوں نے مجھے ٹیگور کے افسانوں کا مجموعہ 'The Hungry Stones' لا کر دیا۔ میں انگریزی کے مضمون میں کمزور تھا۔ پر کوشش کر کے چند افسانے پڑھ ڈالے اور ان میں سے ایک مختصر افسانہ ترجمہ بھی کرنے کی کوشش کی۔ چند دن بعد ٹیگور کے رومانی طرز میں ایک افسانہ خود بھی لکھا ’ریل کا ڈبہ‘ لیکن وہ کہیں چھپنے کو نہیں بھیجا۔ میرا پہلا مطبوعہ افسانہ ’وہ ٹوٹا مکان جس سے یادوں کے محل قائم ہیں‘ تھا۔ جو ’مشعل‘ اٹک 1970 میں شائع ہوا۔ پھر ’لفظ‘ لاہور 1972 میں ایک افسانہ چھپا۔ ’افسانہ وافسوں کی حشیشی رات‘ اُسی سال ’افکار‘ کراچی میں ’زمین جاگتی ہے‘ بھی چھپا۔

ع ح: اردو ادب خصوصاً فکشن میں آپ کی خدمات بیش بہا ہیں اور آپ مسلسل مصروف رہنے والوں میں شمار کیے جاتے ہیں، ہمیں یہ بتائیں کہ ان دنوں ادب کے حوالے سے آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟

مرزا حامد بیگ: میں نے حال ہی میں اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں فارسی میں تحریر کردہ صوفیا کا ایک تذکرہ ایڈٹ کیا ہے، ’ظواہر السرائر‘ از حضرت میاں محمد عمر چمکنی‘ اس تذکرے کو مرتب کرتے وقت میرے پیشِ نظر نسخۂ خلیل الرحمن داؤدی اور نسخۂ حافظ محمود شیرانی رہے ہیں۔ اس کے علاوہ میرے تنقیدی مضامین کا تازہ ترین مجموعہ ’اردو ادب کی شناخت‘ کے عنوان سے آیا ہے۔ نیز ٹرانسلیشن فلاسفی سے متعلق ایک ضخیم کتاب ’اردو ترجمے کی روایت‘ دسمبر 2013 میں شائع ہوئی ہے۔ ابھی حال ہی میں ریختہ والوں نے چار افسانوں کے مجموعے: گمشدہ کلیات، تار پر چلنے والی، گناہ کی مزدوری اور جانکی بائی کی عرضی، اور 2 تنقیدی کتابیں اپنی ویب سائٹ پر اپلوڈ کی ہیں۔ اور عالمی اردو ٹرسٹ، دہلی کے علاوہ ایم آر پبلشر دہلی نے ضخیم کتاب اردو افسانے کی روایت شائع کی ہے۔

ع ح: علامتی یا تجریدی افسانے قارئین کو بہت زیادہ متاثر نہیں کر سکے؟ کیا ہمارا قاری افسانہ نگار کی ذہنی سمجھ تک نہیں پہنچ سکا؟ آپ کا کیا خیال ہے؟

مرزا حامد بیگ: علامت اور تجرید سے کام لینے والے افسانہ نگار کا مسئلہ عوام میں مقبولیت کبھی نہیں رہا۔ اس لیے کہ عام قاری تو رومانی کہانیاں اور سسپنس پڑھتا ہے۔ وہ تو ابھی تک منٹو کے ’پھندنے‘ اور ’سرکنڈوں کی پیچھے‘ کرشن چندر کا ’غالیچہ‘، میرزا ادیب کا ’درونِ تیرگی‘ اور راجندر سنگھ بیدی کا ’گرہن‘ بھی ٹھیک طرح ہضم نہیں کر پایا۔ لہٰذا سریندر پرکاش کا افسانہ ’بازگوئی‘ اور بلراج مین را کا افسانہ ’کمپوزیشن: دو‘، ’انٹروورٹ‘ اور ’وہ‘ جیسی دوہری معنویت کی تحریریں عام قاری کے لیے اجنبی ہیں اور اجنبی رہیں گی۔

ع ح: اردو ادب کو اچھی تنقید میسر آئی ہے؟ آپ کے خیال میں ایک نقاد کو کیسا ہونا چاہیے؟

مرزا حامد بیگ: الیف۔ آر لیوس، ٹی ایس ایلیٹ، محمد حسن عسکری، شمس الرحمن فاروقی، فضیل جعفری اور وارث علوی کی طرح کا۔ جب کہ ناول سے متعلق ہمارے ہاں ای۔ ایم فورسٹر کی طرح کا کام بھی کہاں دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے بیشتر ناقدین تو ناموں کی کھتونیاں تیار کرتے ہیں اور ان میں بھی گدھے، گھوڑے کا فرق روا نہیں رکھتے۔

ع ح: موجودہ ناقدین ادب پر آپ کی کیا رائے ہے؟

مرزا حامد بیگ: ارے زیادہ تر ناقدین یونیورسٹیوں کے پروفیسر حضرات ہیں جن کا آب و دانہ اور شان و شکوہ تقریباتی تنقیدوں پر قائم ہے۔ تحسینِ باہمی کا ایک سلسلہ ہے اور اس کا کوئی انت نہیں۔ ان لوگوں کے پاس وقت کہاں ہے پڑھنے کا۔ دیگر مصروفیات میں الجھے رہتے ہیں۔

ع ح: ادب میں نقاد کا اہم رول ہوتا ہے۔ صحیح تنقید کے بغیر کوئی بھی فن پارہ شاہکار کا درجہ نہیں حاصل کر سکتا۔ نقاد کے رول پر گفتگو کریں:

مرزا حامد بیگ: ادا اس کام میں اس وقت شریک ہوتا ہے جب وہ Working Art کو پرکھنے کے علاوہ شارح کا کام بھی کرے۔ ہمارے اکثر ناقدین اس Extra Effort سے پہلو بچاتے ہیں، لہٰذا ہم ایمسن اور ایف آر لیوس کا تخلیقی سطح پر شرح کا وہ معیار کہاں سے ڈھونڈ کر لائیں۔

ع ح: افسانہ لکھتے وقت کسی اسکول کی پیروی بھی آپ کے پیش نظر رہتی ہے؟

مرزا حامد بیگ: یں فرانسیسی زوال پذیر تخلیق کاروں سے بہت متاثر ہوں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے Huysman نے اپنے ایک تخلیق کردہ افسانوی کردار انتی کے ساتھ بٹھا کر میری تربیت کی ہے۔ پھر یہ کہ بجمن پریٹ کو داد دیتے نہیں تھکتا۔ ان کی تحریروں میں علامتی ابعاد تھا۔ ایک نیا پن تھا۔

ع ح: افسانوں میں تکنیک کا عمل دخل کس حد تک ہوتا ہے؟ آپ کی کیا رائے ہے؟

مرزا حامد بیگ: رے ابتدائی افسانوں کو لیجیے: افسانہ ’زمین جاگتی ہے‘، ’ایکٹ: یادگار محفوظ‘ اور ناولٹ: ’تار پر چلنے والی‘ موضوع کی نہیں تکنیک کی عطا ہیں۔ ’گم شدہ کلمات‘ میں شامل مغل تہذیبی پس منظر کے حامل افسانوں میں ساٹھ کی دہائی کے افسانہ نگاروں بالخصوص سریندر پرکاش، بلراج مین را، انور سجاد، خالدہ اصغر اور بلراج کومل کے باہم متحارب تکنیکی تجربات سے اخذ کردہ نتائج کے ساتھ ساتھ میری سینما بینی اور مصوری کے دیرینہ تجربے کے ساتھ فلم میکنگ کا عملی تجربہ بھی شامل تھا۔ میرے افسانوں میں یہ ایک طرح سے ردِ عمل تھا

1966 کی بات ہے، میں میٹرک کا طالب علم تھا اور ایک شام پارک میں بیٹھا کرشن چندر کا کوئی ناول پڑھ رہا تھا۔ چندانی صاحب نے میرے قریب آ کر پوچھا کیا پڑھ رہے ہو؟ میں نے بتا دیا تو انھوں نے دریافت کیا: ”رابندناتھ ٹیگور کو پڑھا ہے؟“ یہ نام میرے لیے بالکل نیا تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا تو بولے: ”ٹیگور کو پڑھو کل تمھارے لیے ٹیگور کی کوئی کتاب لیتا آؤں گا۔ انگریزی میں ہو گی، لیکن اُسے انگریزی ہی میں پڑھو گے تو مزہ آئے گا۔“ اگلے روز انھوں نے مجھے ٹیگور کے افسانوں کا مجموعہ 'The Hungry Stones' لا کر دیا۔ میں انگریزی کے مضمون میں کمزور تھا۔ پر کوشش کر کے چند افسانے پڑھ ڈالے اور ان میں سے ایک مختصر افسانہ ترجمہ بھی کرنے کی کوشش کی۔ چند دن بعد ٹیگور کے رومانی طرز میں ایک افسانہ خود بھی لکھا ’ریل کا ڈبہ‘ لیکن وہ کہیں چھپنے کو نہیں بھیجا۔ میرا پہلا مطبوعہ افسانہ ’وہ ٹوٹا مکان جس سے یادوں کے محل قائم ہیں‘ تھا

اُس بندھے ٹکے فارمولا افسانے کا، جو ہم سے پہلے لکھا گیا اور اس افسانے کی تعریف میں اردو تنقید کے ثقہ نقاد رطب اللسان رہے۔ اس ضمن میں مزید وضاحت کردوں کہ راجندر سنگھ بیدی کے دو افسانے 'جوگیا' اور 'سونفیا' کے ادغام سے اتنی طاقت پیدا ہوسکتی ہے کہ ہم کاغذ پر قلم سے رنگ بکھیر کر پینٹنگ بنا سکتے ہیں اور بیدی ہی کے دو افسانوں 'اپنے دکھ مجھے دے دو' اور 'ایک رات ایم چورستے کے پاس کیا ہوا' کے ادغام سے نقشِ چغتائی از عبدالرحمن چغتائی کی ٹکر کی تصویریں بنائی جاسکتی ہیں۔ بعینہ میں نے افسانے لکھتے ہوئے قدیم وجدید حقیقت پسند اور تجرید کار پینٹرز کے کام کو بھی اپنی نظر میں رکھا اور کیمرہ کی آنکھ کو بھی استعمال کیا۔

میرے افسانوں میں آپ کو حقیقت پسندانہ اپروچ بھی ملے گی جیسے افسانہ کاتک کا ادھار، صید زبوں، بابے نور محمدے کا آخری کبت، جانکی بائی کی عرضی اور لالہ جسونت کی حویلی میں ، لیکن کہیں کہیں ایسا بھی ہوگا کہ حقیقت یکا یک تجرید میں ڈھل گئی جیسے: کنڈیاں لائن اور نیند میں چلنے والا، کایا مشکی گھوڑوں والی بگھی کا پھیرا میں۔ پھر کچھ افسانے تجریدی بھی ہیں جیسے دھوپ کا چہرہ اور کچھ علامتی بھی جیسے زمین جاگتی ہے، گناہ کی مزدوری، برجِ عقرب، سانڈنی سوار، نقالوں کی رات، مغل سرائے وغیرہ۔

ع ح: آپ کے افسانے ماضی پرستی کا شکار نظر آتے ہیں۔ آپ کے افسانے پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کے ذہن اور دل ودماغ میں کوئی پھانس چبھی ہوئی ہے۔ کیا کہیں گے آپ؟

مرزا حامد بیگ: بے شک، میرے افسانوں میں نوسٹلجیا موجود ہے اور وہ میرے تخلیقی عمل میں پیش قدمی کرتے ہوئے لشکر کے میمنے یا میسرے کے طور پر آگے بڑھتا ہے لیکن میرے تخلیق کردہ کرداروں کا دکھ، ہٹ دھرمی یا غصہ میرا نہیں، میرے پرکھوں کا ہے جس کا جنم میرے اجتماعی لاشعور سے ہوا۔ میرے افسانوں میں موجود نوسٹلجیا کا دائرہ بہت پھیلا ہوا ہے، محض ایک ہجرت کے تجربے تک محدود نہیں۔ میں اپنے پیچھے رہ گئے گلی محلے یا بزرگوں کے مدفن یاد نہیں کرتا۔ میرے افسانوں کا نوسٹلجیا تہہ در تہہ کئی بیتے زمانوں سے متعلق ہے۔ شاید ماوراالنہر سے متعلق بھی جب کہ ملک ترکستان اور حالیہ ازبکستان کا وہ علاقہ جسے میں نے تاحال نہیں دیکھا۔ میرے پرکھوں کا وطن میرے ننھیال اور ددھیال کے بزرگوں کا تعلق ملک ترکستان سے تھا۔

ع ح: اپنے پہلے افسانوی مجموعہ کو داراشکوہ کے نام کرنے کی وجہ؟

مرزا حامد بیگ: شاہجہان کا بیٹا شہزادہ داراشکوہ مقتول، مذہبی کٹر پن اور تنگ نظری کے مقابل آزاد خیالی اور علم کا استعارہ ہے۔ بابر سے شاہجہاں تک مغل فرمانرواؤں نے بلا تفریق مذہب وملت ہندوستان میں جو بھائی چارے کی فضا قائم کی تھی۔ اس کا تسلسل داراشکوہ ہی قائم رکھ سکتا تھا۔ اس خطے کی یہی ضرورت تھی جسے ہم آج محسوس کرسکتے ہیں۔ اسی لیے میں نے اپنا پہلا افسانوی مجموعہ 'گمشدہ کلمات' داراشکوہ کے نام کیا۔

ع ح: آپ جاگیردارانہ نظام کے سخت مخالف نظر آتے ہیں۔ آپ کے افسانوں میں اس نظام کے خلاف ایک بغاوت نظر آتی ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے؟

مرزا حامد بیگ: یں نے اپنے آبائی علاقہ چھچھ اور اندرونِ سندھ میں جاگیردارانہ نظام کا بہت قریب سے مطالعہ کیا۔ میں نے جابر اور قہار مرشد کے حضور پیری مریدی کے سلسلوں میں مرید کے عجز اور بے بسی کا مشاہدہ بھی کیا۔ میرے ددھیال میں راہ چلتے مسافروں کو اجازت نہ تھی کہ وہ مغل حویلی کے قریب سے گزرتے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر گزریں۔ یہ میں بیسویں صدی کے نصف اول کی بات کررہا ہوں۔ ہالہ (سندھ) کے نواح میں ایک چہار دیواری ایسی بھی دیکھی جس میں بڑے بڑے جنگلی سور محض اس لیے رکھے گئے تھے کہ نافرمان ہاری کو بطور سزا کے اُس چہار دیواری میں لڑھکا دیا جائے اور جنگلی سور اسے اپنی لمبی لمبی خاروں کے ساتھ اُدھیڑ کر رکھ دیں۔ میں نے اندرون سندھ میں یہ بھی دیکھا ہے پیر سائیں کے حکم کے تحت شجاع بھنبھرو جیسے بڑے ڈاکو نے حر ہونے کے ناطے خود کو گولیوں کی بوچھار کے سامنے کردیا کہ پیر سائیں راضی رہیں۔

اردو ادب میں اس نوع کا کام کرنے والوں کا شمار ایک ہاتھ کی انگلیوں پر کیا جاسکتا ہے۔ اس خصوص میں پہلا نام تو میں اپنے دادا استاد محمد حسن عسکری کا لوں گا۔ ان سے پہلے محمد علی ردولوی نے یہ کام کیا۔ اس خصوص میں قاضی عبدالستار کا نام بھی نمایاں ہے۔ یہ تو ہوئے اردو فکشن کے گریٹ ماسٹرز۔ اس فقیر کی بھی کوشش ہوتی ہے کہ کچھ ایسا ہی اپنے معاصرین سے الگ کر کے دکھائے۔

ع ح: آپ کی کہانیوں میں کبھی کبھی جملے کافی طویل ہوتے ہیں اس کے پیچھے کون سی سوچ کارفرما ہے؟

مرزا حامد بیگ: جی ہاں۔ مجھے اس سے انکار نہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ تخلیقی سطح پر وہ کسوٹی کیا ہوگی جس پر کس کر یہ بتایا جاسکتا ہے کہ کون شخص زبان داں ہے اور کون نہیں؟ گو اس ضمن میں جانچ پرکھ کے کئی ایک معیارات ہیں۔ شاعری میں الگ اور نثر میں الگ۔ جن میں سے ایک معیار یہ بھی ہے کہ کون ہے جو جملہ اسلوبیاتی روایت سے آگاہ ہے اور متواتر زبان کی نزاکتوں پر نظر رکھتے ہوئے اپنے افکار کو مختلف اور گوناگوں انداز سے لفظوں کی معرفت سامنے لانے کی مشق و مزاولت بہم پہنچاتا ہے۔ اس حوالے سے بڑا نثر نگار وہی شمار کیا جائے گا جو طویل اور پیچیدہ جملے لکھنے پر قادر ہو لیکن 'اور'، 'اگر'، 'لیکن' وغیرہ لگا کر نہیں۔ ہمارے ہاں 'چھوٹے چھوٹے' اور 'رواں جملوں' کی تحسین بے جانے بڑے جانے بڑے نثر نگار پیدا نہیں ہونے دیے جب کہ عالمی ادب میں اسی خوبی کے پیش نظر فرانسیسی ناول نگار ستاں دال کے ناول 'The Scarlet and Black' کے بارے میں ایذرا پاؤنڈ نے کہا تھا کہ اس ناول کی نثر کا مرتبہ شاعری سے بلند ہے۔ بالخصوص طویل جملہ تراشنے کے ضمن میں ستاں دال سے بھی بہتر امثال ہمیں گستاؤ فلابیئر کے ناول 'Madame Bovary' میں مل جاتی ہیں۔ اردو ادب میں اس نوع کا کام کرنے والوں کا شمار ایک ہاتھ کی انگلیوں پر کیا جاسکتا ہے۔ اس خصوص میں پہلا نام تو میں اپنے دادا استاد محمد حسن عسکری کا لوں گا۔ ان سے پہلے محمد علی ردولوی نے یہ کام کیا۔ اس خصوص میں قاضی عبدالستار کا نام بھی نمایاں ہے۔ یہ تو ہوئے اردو فکشن کے گریٹ ماسٹرز۔ اس فقیر کی بھی کوشش ہوتی ہے کہ کچھ ایسا ہی اپنے معاصرین سے الگ کر کے دکھائے۔ بالکل اسی طرح، جیسے گستاؤ فلابیئر کی موجودگی میں موپاساں نے اس نوع کی مشق جاری رکھی۔

ع ح: کیا اردو افسانہ عالمی معیار کو پہنچ چکا ہے؟ ہمارے یہاں عالمی سطح پر کون سے نام رکھے جاسکتے ہیں؟

مرزا حامد بیگ: عالمی معیار سے ناواقف لوگ ہی کہہ سکتے ہیں کہ آج کا اردو افسانہ عالمی معیار کو پہنچ چکا ہے۔ میں نے عالمی معیار کے افسانوں کی انتھالوجیز پڑھی ہیں اور ان میں سے چند افسانوں کو اردو دنیا سے متعارف بھی کروایا ہے یہ سوچ کر کہ لوگوں کو پتا چلے کہ عالمی معیار ہوتا کیا ہے۔ ایک افسانے کا ترجمہ تو مظفر علی سید کے اسی پراجیکٹ کے لیے کیا تھا جسے 'افکار' کراچی کے خاص نمبر کی صورت شائع ہونا تھا۔ وہ افسانہ تھا ابیوسے نکول کا 'زندگی حسین ہے' اور افسانہ نگار کا تعلق ہے سیرالیون سے۔ اتنے چھوٹے سے پسماندہ ملک کا اتنا بڑا افسانہ نگار۔ دوسرا افسانہ تھا عالم شاہ خاں کا، جسے ہندی سے خود ان کی مدد کے ساتھ ترجمہ کیا۔ عنوان: 'کرائے کی کوکھ' ان دو افسانوں کو پڑھ کر کون کہے کہ ہم ان جیسا افسانہ لکھ لیتے ہیں۔ پھر اسی پر موقوف نہیں۔ ہندی کے افسانہ نگار کملیشور کا افسانہ ہے: اتنے اچھے دن، سبحان اللہ۔ اردو افسانے کی سطح پر 1940 تا 1960 کی درمیانی مدت ایسی تھی جب غلام عباس، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، بلونت سنگھ اور قاضی عبدالستار نے شاہکار افسانے تخلیق کیے۔ روایت سے انحراف، تکنیکی تجربات اور نئی نفسی کیفیات کو رقم کرنے کے سلسلے میں 1960 تا 1980 کی

درمیانی مدت بھی اتنی ہی اہم ہے جب انتظار حسین، سریندر پرکاش، بلراج مین را، محمد سلیم الرحمن، انور سجاد، خالدہ حسین، اسد محمد خاں، منشایاد، قمر احسن، سلام بن رزاق، نیر مسعود اور احمد داؤد نمایاں دکھائی دیے۔

ع ح: ہندوستان اور پاکستان میں تخلیق، تنقید و تحقیق میں کون سے نام آپ کے خیال میں اہم اور ممتاز ہیں؟

مرزا حامد بیگ: افسانہ نگار تو وہی ہیں، جن کے نام میں نے ابھی کچھ دیر پہلے گنوا دیے۔ البتہ 1980 کے بعد بھارت سے ایک اہم افسانہ نگار ابھر کر سامنے آئے سید محمد اشرف۔ ناول میں قرۃ العین حیدر کا جواب نہ پاکستان میں پہلے تھا، نہ اب ہے۔ ان کا موازنہ تو ہندوستان ہی کے عالمی شہرت یافتہ ناول نگاروں وکرم سیٹھ اور ارون دھتی رائے سے بھی نہیں بنتا۔ آخرالذکر دونوں، ان کی برابری نہیں کرتے۔ افسوس، قاضی عبدالستار کو تاریخی ناول کھا گیا۔ اے کاش وہ 'شب گزیدہ' ہی کی لائین پر آگے بڑھتے لیکن تاریخ سے پہلو بچا کر۔ باقی ہندوستان اور پاکستان کے ناول نگار ایک ہی سطح کے ہیں۔ تنقید کے میدان میں ہندوستان کا پلڑا بھاری دکھائی دیتا ہے۔ اُدھر اسلوب احمد انصاری، شمس الرحمن فاروقی، گوپی چند نارنگ، فضیل جعفری، وارث علوی، شمیم حنفی، ابوالکلام قاسمی، قاضی افضال حسین اور مہدی جعفر کا کام اہمیت کا حامل ہے۔ جب کہ پاکستان میں محمد حسن عسکری، سلیم احمد، سجاد باقر رضوی، جیلان کامران، مظفر علی سید، وزیر آغا اور شمیم احمد کے بعد ہم تنقید کے میدان میں بہت ہیٹے دکھائی دیتے ہیں۔ تحقیق کی سطح پر ہندوستان میں قاضی عبدالودود، مالک رام اور امتیاز علی عرشی کے بعد بھی کچھ لوگ موجود رہے اور ان کا کام اہمیت کا حامل ہے جیسے قدرت نقوی، تنویر احمد علوی، جن کا کچھ مدت پہلے انتقال ہوا۔ پھر خلیق انجم ہیں جب کہ ہمارے ہاں صرف اور صرف جمیل جالبی۔ غزل کی صنف ایسی ہے جس میں پاکستان بلاشبہ ہندوستان سے بہت آگے ہے۔ ظفر اقبال، احمد مشتاق، انور شعور، قدیر قیصر، افضال احمد سید، احمد جاوید، خواجہ رضی حیدر، صابر ظفر، محمد اظہار الحق، خالد اقبال یاسر، شاہدہ حسن، محمد خالد، سلیم کوثر، لیاقت علی عاصم، اجمل سراج، شاہین عباس، اختر عثمان، احمد کامران، اکبر معصوم، ادریس بابر، احمد نوید، قمر رضا شہزاد؟ افضال نوید اور سید اذلان شاہ جیسے غزل گو ہندوستان میں ڈھونڈے سے نہیں ملتے۔ اُدھر شہریار، محمد علوی اور بشیر بدر کے بعد عرفان صدیقی جیسا اہم شاعر پیدا ہوا اور وہ بھی جلد ہی اٹھ گیا۔ اب ہندوستان کے قابلِ توجہ غزل گو شعرا میں محض دو نام ہیں، فرحت احساس اور احمد محفوظ۔ فرحت احساس ستر کے دہے سے متعلق ہیں اور احمد محفوظ اسّی کے دَہے کے۔

ع ح: اردو کے اہم ناولوں پر اظہار خیال کریں؟ ہمارے یہاں یہ کہا جاتا رہا ہے کہ شاہکار ناول کم لکھے گئے ہیں۔

مرزا حامد بیگ: اسلوب احمد انصاری صاحب نے تو میر امن کی 'باغ و بہار' کو بھی شامل کر کے اردو کے پندرہ اہم ناول شمار کیے ہیں: توبۃ النصوح، فردوس بریں، امراؤ جان ادا، میدانِ عمل، ایسی بلندی ایسی پستی، آگ کا دریا، اُداس نسلیں، آنگن، آبلہ پا، ایوانِ غزل، راجہ گدھ، کاروانِ وجود، دشت سوس اور 'آگے سمندر ہے'۔ یوں میرے خیال میں جیلانی بانو کے 'ایوانِ غزل' اور انتظار حسین کے 'آگے سمندر ہے' کو رعایتی نمبر مل گئے۔ ممتاز مفتی کا 'علی پور کا ایلی' بے شک اُن کی آپ بیتی پر مبنی سہی لیکن ناول تو ہے۔ قرۃ العین حیدر کا 'گردش رنگ چمن'، شوکت صدیقی کا 'خدا کی بستی'، الطاف فاطمہ کا 'دستک نہ دو' اور شمس الرحمن فاروقی کا 'کئی چاند تھے سر آسماں' اس فہرست میں شامل کیے جانے چاہئیں۔ یہ الگ حصہ ہے کہ ہمارے ہاں عظمت کا معیار کیا ہے؟

ع ح: اردو میں مغربی ادب سے ترجمے کی شاندار روایت رہی ہے۔ ترجمے کی روایت اور اہمیت پر روشنی ڈالیں؟

مرزا حامد بیگ: اب محمد حسن عسکری، ظ انصاری، ممتاز

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ کونسل کے رسالہ 'اردو دنیا'، 'بچوں کی دنیا' اور 'فکر و تحقیق' اتنی بڑی تعداد میں چھپتے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو کا قاری موجود ہے۔ میں بس یہی کہنا چاہوں گا کہ اردو زبان و ادب سے رشتہ جوڑیں اور آپ تہذیب یافتہ بنتے چلے جائیں گے اردو ہندوستانی تہذیب و تمدن کا استعارہ ہے اور برصغیر کی مٹی میں اردو بسی ہوئی ہے۔ یہی وہ زبان ہے جس نے تمام دنیا کے اردو پسند ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا ہے۔

شیریں اور شفیق الرحمن جیسے فکشن کے مترجمین تو رہے نہیں اور نہ بیشتر مترجمین کو ترجمہ کی فلاسفی کی شُد بد ہے۔ زمانہ حال میں ہمارے ہاں شاہد حمید نے ٹالسٹائی کے ناول 'War and Peace' دوستوفسکی کے 'The Brothers Karamazov' اور جین آسٹن کے 'Pride and Prejudice' کو ترجمہ کرتے ہوئے پتہ ماری ضرور کی، لیکن مادام سواری، ماپی ڈِک، سرخ و سیاہ اور آخری سلام کے تراجم از محمد حسن عسکری، در شہوار از ممتاز شیریں اور انسانی تماشا از شفیق الرحمن والی بات اب دیکھنے کو نہیں ملتی۔ دوسری بات یہ کہ اب مؤسسہ فرینکلن، لاہور جیسا کوئی ادارہ بھی نہیں رہا۔ جو ترجمے کے فروغ کا باعث بنتا۔ ماضی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ذیلی ادارے مکتبہ جامعہ کے شائع کردہ تراجم میں 'آلپس کے گیت' ترجمہ: قرۃ العین حیدر، 'زندگی کی لہر' از ساؤمنگ، ترجمہ: محمد خلیق، 'انٹینی اور کلوپٹرا'، ترجمہ: منیب الرحمن اور 'شکست ناتمام' از جان اسٹین بک، ترجمہ: زہرا سیدین، یادگار تراجم ہیں۔ مجلس ترقی ادب، لاہور نے حکایاتِ 'پنجاب از آر سی ٹمپل' ترجمہ: میاں عبدالرشید، 'مجرم کون؟' از جے بی پرسٹلے، ترجمہ: اظہار کاظمی، 'آر یو آر' از کارل چپیک' ترجمہ: پطرس بخاری و امتیاز علی تاج ترجمہ کروا کر شائع کیے۔ اسی طرح ترقی اردو بیورو (حال: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی) کے شائع کردہ تراجم میں 'شعریات' از ارسطو، ترجمہ: شمس الرحمن فاروقی، 'توضیحی لسانیات' از ایچ اے گلیسن (جونیئر) ترجمہ: عتیق احمد صدیقی اہم کام ہے لیکن یہ تو سب ماضی کی باتیں ہیں۔

مولانا آزاد یونیورسٹی حیدرآباد (دکن) میں ٹرانسلیشن اسٹڈیز کے شعبے کی کارگزاری سے میں واقف نہیں۔ ادھر حال ہی میں ہم نے یونیورسٹی آف گجرات، پنجاب، پاکستان میں ٹرانسلیشن اسٹڈیز کا شعبہ قائم کیا ہے۔ دیکھیے جو بن پڑا کریں گے۔ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور کا ذیلی ادارہ تالیف و ترجمہ تو ایک طرح سے دم توڑ گیا۔ یہی حال گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور کی سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی کا ہے۔

ع ح: ابھی آپ قومی اردو کونسل کی عالمی اردو کانفرنس میں شریک ہوئے اور آپ نے ترجمے کے حوالے سے کافی پرمغز مقالہ بھی پیش کیا۔ اس کانفرنس پر آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

مرزا حامد بیگ: قومی اردو کونسل کی یہ عالمی اردو کانفرنس اپنے آپ میں بے مثال ہے اور میں یہاں یہ دیکھ کر حیران تھا کہ اردو کے اس جشن میں تینوں دن بڑی تعداد میں سامعین موجود تھے۔ میرا ماننا ہے کہ جب تک اردو سے ایسے محبت کرنے والے زندہ ہیں اردو کبھی مر نہیں سکتی اور کانفرنس کے بعد تو یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو کا مستقبل روشن ہے۔

ع ح: اردو دنیا کے قارئین کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

مرزا حامد بیگ: مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ کونسل کے رسالے 'اردو دنیا'، 'بچوں کی دنیا' اور 'فکر و تحقیق' اتنی بڑی تعداد میں چھپتے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو کا قاری موجود ہے۔ میں بس یہی کہنا چاہوں گا کہ اردو زبان و ادب سے رشتہ جوڑیں اور آپ تہذیب یافتہ بنتے چلے جائیں گے اردو ہندوستانی تہذیب و تمدن کا استعارہ ہے اور برصغیر کی مٹی میں اردو بسی ہوئی ہے۔ یہی وہ زبان ہے جس نے تمام دنیا کے اردو پسند ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا ہے۔ آپ اردو زبان سے ہی محبت و اخوت کی تاریخ رقم کر سکتے ہیں۔ اردو کو اپنی روزمرہ کی زندگی کے ہر شعبے میں استعمال کریں یہی میری درخواست ہے، التجا ہے، گزارش ہے۔

■

Email: ahaijnu@gmail.com

شاہد اختر انصاری

قومی اردو کونسل کے چیئرمین
پدم شری مظفر حسین سے خصوصی گفتگو

شاھد اختر انصاری: سب سے پہلے شعبہ ادارت کی جانب سے آپ کو کونسل کا وائس چیئرمین بننے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اپنے تعلیمی پس منظر اور صحافتی زندگی پر روشنی ڈالیں؟

مظفر حسین: بہت بہت شکریہ۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں یہاں دہلی میں اردو کے اتنے بڑے ادارے میں موجود ہوں اور مجھے اردو کی خدمت کرنے کا موقع ملا ہے۔

میری پیدائش راجستھان کے ایک گاؤں بجولیا میں 27 جولائی 1945 کو ہوئی۔ میں نے اپنے صحافتی کیریر کی شروعات کالج کی تعلیم کے دوران کی تھی، اندور سے نکلنے والے روزنامہ 'سنکیت' سے وابستگی ہوئی، ساتھ ہی نئی دنیا میں بھی لکھتا رہا۔ میری بنیادی تعلیم مدھیہ پردیش میں ہوئی، اس کے بعد میں نے ممبئی یونیورسٹی سے وکالت کی تعلیم حاصل کی ساتھ ہی صحافت کا کورس بھی کیا۔ جب میں ممبئی گیا تو وہاں دیگر اخبارات کے لیے بھی لکھنا شروع کیا اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ انقلاب جس وقت تاڑدیو سے شائع ہوتا تھا اور فیچر ایڈیٹر جناب عرفان صاحب ہوا کرتے تھے، ان دنوں اتوار کے لیے مخصوص طریقے سے میرے فیچر شائع ہوتے تھے۔ آج میرا ہفتہ وار کالم 42 سے زائد اخبارات میں شائع ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی، ہندی، مراٹھی، گجراتی اور کنڑ اخبارات میں ہر ہفتے میرے کالم شائع ہوتے ہیں۔ مشہور دیوگری سماچار جو اورنگ آباد سے نکلتا تھا وہ میری ہی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اب تک میری گیارہ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، میری مشہور زمانہ کتاب Insight into Minoritism پر مجھے پدم شری اعزاز حاصل ہوا۔ میری کتاب 'اسلام اور شاکاہار' پر اہنسا ڈیمڈ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری بھی دی ہے۔ مجھے اب تک ریاستی اور قومی سطح پر کل 23 ایوارڈ مل چکے ہیں۔ ہندی ادب میں ساہتیہ رتن ڈگری لینے کا اعزاز بھی مجھے حاصل ہے۔

ش ا: اردو زبان میں آپ نے بعد میں لکھنا شروع کیا۔ اردو کی جانب آپ کس طرح راغب ہوئے؟

مظفر حسین: اردو زبان نہ صرف ہندوستانی ذہن و تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے بلکہ یہ زبان دنیا کی سبھی زبانوں میں سب سے شیریں زبان ہے۔ حال کے برسوں میں بڑی تعداد میں غیر اردو داں طبقہ اردو زبان کے قریب آیا ہے اور یہ زبان روز بروز مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔

ش ا: قومی اردو کونسل کا چیئرمین بننے پر آپ کی ترجیحات کیا کیا ہیں؟

مظفر حسین: دیکھیے! میں نے اپنے افتتاحی اجلاس میں بھی یہ بات کہی تھی اور آج بھی دوہرا رہا ہوں کہ اردو زبان و ادب ہماری وراثت ہے اور ہماری شناخت ہے ہمیں اسے محفوظ رکھنے کے لیے ہر ممکن جتن کرنے ہوں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اردو کی ایک گیلری بنائی جائے جس میں اردو زبان و ادب سے متعلق تاریخی اور ادبی وراثتوں کو محفوظ کیا جائے۔ میں جب سے کونسل کا چیئرمین بنایا گیا ہوں اس دن سے میرے عزائم ہیں کہ میں اردو کی پوری خدمت کرنے کی کوشش کروں گا۔ کونسل میں آنے کا تجربہ نہایت خوشگوار ہے اور یہاں کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب کے ساتھ کام کرنے کو میں اپنی خوش بختی تصور کرتا ہوں۔ ان کا نام ہی اکرام ہے۔ جو کرم کی جمع ہے۔ وہ خود میں واحد ہیں اور خود میں جمع ہیں۔ اردو کے لیے انھوں نے جو کام کیے ہیں میں ان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر ان کاموں کو آگے بڑھاؤں گا۔

ش ا: مادری زبان کی اہمیت پر اظہار خیال کریں؟

مظفر حسین: میرا ماننا ہے کہ مادری زبان سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے اور بچوں کو سب سے پہلے تعلیم اسی زبان میں دی جانی چاہیے۔ یہ وہ زبان ہے جسے بچہ ماں کی گود میں سیکھتا ہے، یہ ہی وہ زبان ہے جسے بچہ اپنی پوری زندگی یاد رکھتا ہے۔ مادری زبان ہمارے لیے اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے جتنی آنکھ کے لیے کارنیا اور جسم کے لیے چمڑی۔ مادری زبان میں تعلیم کا حق ہمیں حاصل ہے اور ہمیں اپنے حق کو حاصل کرنے سے کوئی نھیں روک سکتا۔

ش ا: اردو رسم الخط کی اہمیت پر گفتگو کریں؟

مظفر حسین: ہمارا رسم الخط دنیا کے سارے رسم الخط میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔ ہمارے یہاں ق بھی ہے ک بھی، ن بھی ہے اور نون غنہ بھی، ش ہے، ث ہے، س ہے اور ص بھی۔ جبکہ انگریزی میں یا دوسری زبانوں کے حروف تہجی میں ان کے لیے صرف ایک ہی حرف ہے۔ یہ خوبی اردو رسم الخط میں ہی ہے، ہماری زبان جتنی صاف اور نیچورل ہے اتنی کوئی دوسری زبان نھیں۔ اردو زبان ہندوستانی تہذیب و تمدن کا استعارہ ہے۔ آج پوری دنیا ترقی کی نئی تاریخ رقم کر رہی ہے اور ہم چاند پر مریخ پر اور دیگر سیاروں پر دنیا بسانے کی سوچ رہے ہیں۔ جب ہندوستان اپنی دنیا بسائے گا، ہم وہاں اردو زبان کا تحفہ لے کر جائیں گے۔

ش ا: اردو صحافت کے موجودہ معیار پر روشنی ڈالیں؟

مظفر حسین: اردو صحافت کا معیار ہمیشہ سے بلند رہا ہے اور یہ صحافت اپنے آغاز سے ہی ہندوستان کے تمام نشیب و فراز سے وابستہ رہی ہے۔ تکنیک کے سہارے، ہم اردو صحافت کر مزید بلندیوں سے ہمکنار کرا سکتے ہیں۔ اردو اخبارات کا سرکولیشن دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ موجودہ وقت میں ہندوستان کے طول و عرض سے اردو اخبارات شائع ہو رہے ہیں اور اردو داں طبقہ ان اخبارات کو پڑھتا ہے۔

ش ا: اردو کی ترویج واشاعت اور اس کی ترقی کے لیے عالمی سطح پر اردو کی نئی بستیوں میں کس طرح کام کریں گے؟

مظفر حسین: اردو زبان کا جو پھیلاؤ آج پوری دنیا میں ہوا ہے وہ یقینا قابل تعریف ہے۔ آج ہر انسان کے دل و دماغ میں اردو کا پیار بڑھ رہا ہے۔ ہمیں ایسے میکنزم کی ضرورت ہے جس سے اردو کو عالمی سطح پر تقویت دی جا سکے۔ ہمیں اردو کے گلوبل ویلیج کو مزید توسیع دینے کی ضرورت ہے۔

ش ا: اردو کا مستقبل آپ کی نظر میں؟

مظفر حسین: اردو کے مستقبل کی جب بھی بات کی جاتی ہے تو میں برملا کہتا ہوں کہ اردو کا مستقبل اس ملک میں بے حد تابناک ہے۔ اردو کے لیے جو پیار اور محبت یہاں کے باشندوں میں ہے وہ اردو کی ترویج واشاعت اور ترقی کی ضامن ہے۔ آج اردو زبان نہ صرف ملک کے دور دراز کے علاقوں میں بلکہ عالمی سطح پر بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے، اس سے اردو کی مقبولیت اور اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

■

Dr. Shahid Akhtar Ansari, 38/7, Noor Nagar, New Delhi - 110025

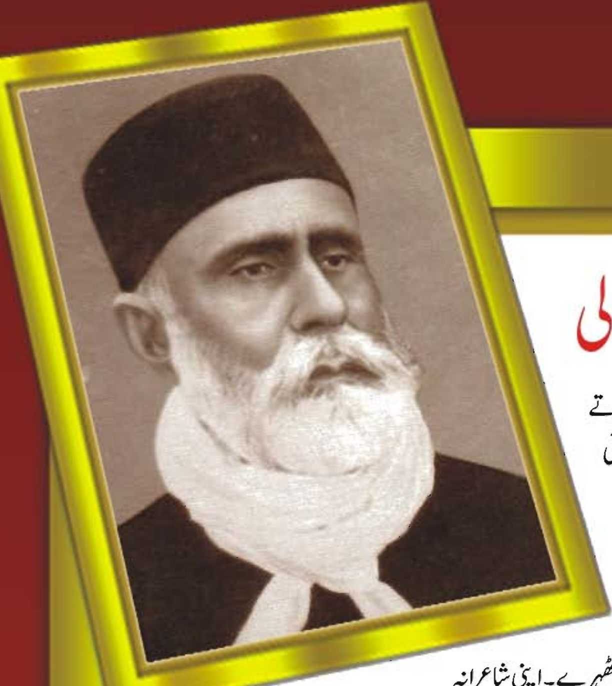

اردو تنقید کے جدِّ عالی: خواجہ الطاف حسین حالی

خواجہ الطاف حسین حالی، غالب کے شاگرد تھے اور حالی سے پہلے 'خستہ' تخلص فرماتے تھے۔ لہٰذا مولانا کی وفات کے سو سال مکمل ہونے پر 'حالی صدی' کا جو شور اِن دنوں سنائی دے رہا ہے اُس پر غالب کے ایک شعر کو یوں بھی دہرایا جاسکتا ہے کہ:

حالی خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

شعری جمالیات، تصوف و فلسفہ اور عاشقی و قلندری کے رموز سے گہری واقفیت کے باوجود اس پائے کے شاعر وہ کبھی نہیں بن سکے کہ بحیثیتِ شاعر ان کی صدی منانا لازم ٹھہرے۔ اپنی شاعرانہ حیثیت کا موصوف کو تھوڑا بہت خود بھی اندازہ تھا کہ معاصر شعرا کے سامنے وہ کچھ ہلکے پڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ اپنا دیوان بھی خود ہی مرتب کیا کہ پتہ نہیں ان کے بعد کسی کو یہ خیال آئے نہ آئے۔ نثر جتنی تھی ناصحانہ تھی! یا پھر اس کا زیادہ تر استعمال مولانا نے شیخ سعدی، مرزا غالب اور سید احمد خاں کی مدح سرائی میں کیا تھا۔ یوں، آج کے حساب سے دیکھا جائے تو حالی اردو کے ایک اوسط درجے سے ذرا اوپر کے ادیب تھے اور بس!

لیکن غالب، شیفتہ اور سرسید کی صحبتوں سے ادب کو ناقدانہ نظر سے دیکھنے پرکھنے کی جو تحریک حالی کو ملی اس نے انھیں کچھ سے بہت کچھ بنا دیا۔ ان کی شخصیت اردو تنقید کے اوّلین شجرِ سایہ دار کی صورت میں سامنے آئی۔ 'مقدمۂ شعر و شاعری' نے اردو میں تنقید نگاری کی بنیاد رکھ دی جس کی بنا پر آج حالی کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ اردو ادب کا بڑے سے بڑا پارکھی بھی، پہلے ان کے آستانے کو چومتا ہے پھر قدم آگے بڑھاتا ہے۔ کوئی کتنا بھی اعلیٰ درجے کا نقاد کیوں نہ ہو حالی کو سلام کیے بغیر اپنی بحث کو کسی درست نتیجے تک نہیں پہنچا پاتا۔

لاکھ کہہ لیجیے، مولانا کو بہت اچھی انگریزی نہیں آتی تھی۔ مغربی ادب کو انھوں نے پڑھنے کی طرح نہیں پڑھا تھا۔ جو پڑھا تھا وہ ناکافی تھا۔ مغرب کے تنقیدی افکار تک ان کی رسائی نہیں تھی۔ کارل مارکس کے نظریات اور صنعتی انقلاب کے آغاز نے فلسفے اور ادب پر جو اثرات مرتب کیے تھے ان کی پوری اطلاع حالی کو نہیں ملی تھی جبکہ دہلی سے ہزاروں میل دور رہنے والے مارکس اور ان کے دوست اینگلز اُسی زمانے کی باہمی خط و کتابت اور مضامین میں 1857 کی عظیم ہندوستانی بغاوت سے ہمدردی رکھنے کے باوجود نہ صرف اس کے ناکام ہونے کی پیش گوئی کر چکے تھے بلکہ بغاوتِ ہند کی ناکامی کے اسباب کی نشان دہی بھی انھوں نے پہلے ہی کر دی تھی۔ مگر مغرب سے لاعلمی یا عدم دل چسپی کا یہ حال صرف حالی کا نہیں بلکہ اس دور میں اردو کے تمام مشاہیر ادب کا تھا۔ غالب تو انگریزی ابجد سے بھی ناواقف تھے۔ یہی حال مومن اور ذوق کا تھا۔ لیکن مغربی افکار سے کامل یگانگت کا فقدان ہی حالی کے لیے 'زحمت میں رحمت' Blessing in disguise کا سبب بن گیا۔ انھوں نے فطرت سے وابستگی کو اعلیٰ ادب کی اہم ترین بنیاد قرار دیا، جس کی روایت ہندوستانی ادب میں زمانۂ قدیم سے چلی آتی ہے اور جسے بعض نقاد انگریزی ادب کی روایت اور وراثت بتا کر بحث کو بھٹکا دیتے ہیں۔ یہی صورت حقیقت نگاری کی بھی ہے جس پر حالی نے سر والٹر اسکاٹ اور ملٹن کے ناموں کا حوالہ دیتے ہوئے زور دیا تھا، حالانکہ کبیر اور نظیر کو پڑھیے گا تو پتہ چلے گا کہ یہ وصف بھی ہندوستانی ادبی قدروں سے کبھی اچھوتا نہیں رہا ہے۔

بہرحال جو بھی ہو، حالی آج صرف مسدس حالی کی وجہ سے یاد نہیں کیے جاتے۔ ان کی ناقدانہ حیثیت اس سے کہیں زیادہ مقدم ہے۔

آئندہ صفحات میں ہمارے قلم کاروں نے حالی کی شخصیت اور ان کے فکر و فن کی تمام جہات کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان مضامین سے تفہیم حالی کے نئے دروازے کھلیں گے یا نہیں کھلیں گے یہ تو یقین سے نہیں کہا جاسکتا، لیکن ان کے مطالعے سے ہمارے اکیسویں صدی کے اردو قاری کو انیسویں صدی کے ایک عہد ساز ادیب کو جاننے اور سمجھنے میں خاصی مدد ملے گی یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے۔ آپ کے ردعمل کا ہمیں انتظار رہے گا!

نصرت ظہیر

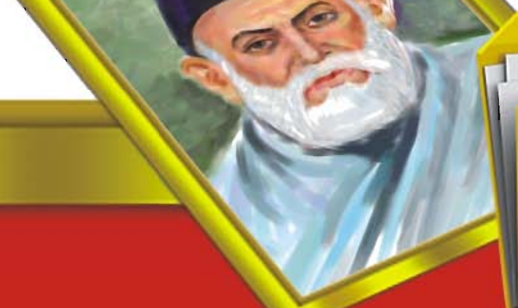

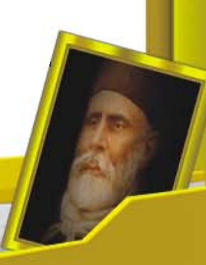

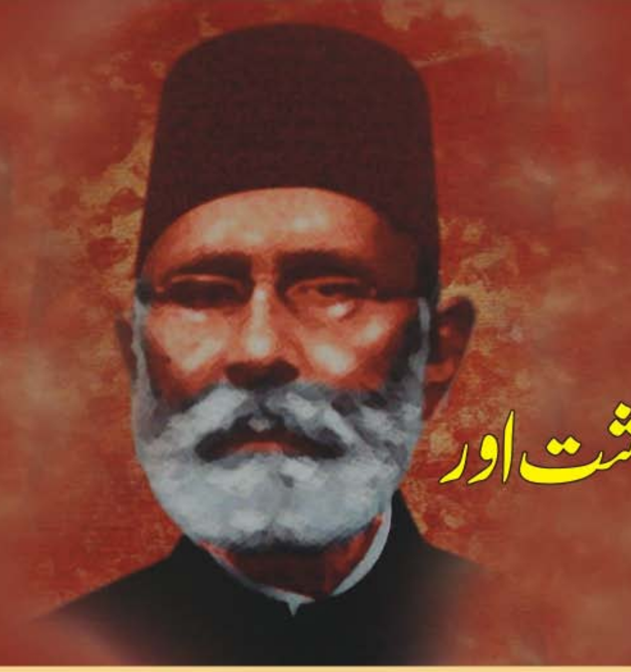

حالی کی شخصیت خودنوشت اور مکاتیب کے آئینہ میں

ثنا کوثر

اٹھارویں صدی اردو ادب کی ترقی کا دور ہے۔اس صدی میں کہانی، داستان، مثنوی، شہر آشوب اور غزل وغیرہ کا چلن عام تھا۔انیسویں صدی نے اردو ادب کو دیگر تحریکات کے ذریعے نئی صنفوں سے روشناس کرایا۔داستان سے ناول اور ناول سے افسانہ وجود میں آیا۔اسی طرح شاعری میں غزل کے موضوعات میں بھی تبدیلی آئی۔مصرع طرح کے برعکس موضوع کو توجہ دی گئی 1857 کے غدر سے محض سماجی انقلاب نہیں آیا بلکہ ادب میں بھی زبردست تبدیلی آئی۔ادب برائے زندگی کے نعرے بلند کیے جانے لگے۔حقیقت نگاری کو ادب میں شامل کرنا ضروری سمجھا گیا۔قوم کے رہنما جنھوں نے معاشرے کی ترقی کے لیے ادب کو اہمیت دی اور اسی کے ذریعے اصلاحی مشن شروع کیے۔سر سیّد احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد، علاّمہ شبلی نعمانی، مولوی ذکاء اللہ، وقار الملک، محسن الملک اور خواجہ الطاف حسین حالی نے اردو شعر و ادب کی بیش بہا خدمتیں انجام دیں۔جس کے اثرات آج بھی پوری طرح اردو ادب پر نمایاں ہیں۔

خواجہ الطاف حسین حالی کا شمار انیسویں صدی کی اہم شخصیات میں کیا جاتا ہے۔حالی اردو تنقید کے بابا آدم، پہلے سوانح نگار، جدید شاعری کے علمبردار، شاعر، تاریخ نویس اور یہی نہیں انسان دوستی کی اہمیت سے بھی بہت مشہور ہیں، اردو ادب ان کی گرانبار نعمتوں کا احسان مند ہے۔حالی کا زمانہ 1837 سے 1914 تک ہے ایک صدی مکمل ہونے کے باوجود ان کی شخصیت کے تمام پہلو کو یکجا نہیں کیا جاسکا ہے۔لیکن آج بھی دیگر یونیورسٹی میں تحقیقی کام جاری و ساری ہے۔یہ بات ہر کسی کے لیے قابل قدر ہوگی کہ وفات کے 100 برس بعد بھی ان کی شخصیت اس ستارے کی طرح ہے جس کا وجود سورج کے طلوع ہونے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتا۔ ہزاروں شاعر، نقاد اور سوانح نگار ہوئے لیکن حالی ہی ان کی ادبی فکر کی بنیاد بنے۔مقدمہ شعر و شاعری (1893) ہو، مسدس حالی (1879) ہو یا ان کی سوانح ہوں اردو ادب کا کوئی بھی مصنف ان سے اچھوتا نہیں رہ سکتا۔اس مضمون میں ہم حالی کی شخصیت کا جائزہ ان کی خودنوشت (’حالی کی کہانی خود ان کی زبانی‘ جو انھوں نے 1901 میں ’نواب عماد الملک بہادر‘ کو لکھ کر حیدرآباد بھیجی تھی جسے بعد میں دیوان حالی میں اور ترجمہ حالی کے عنوان سے مقالات حالی میں شامل کیا گیا) اور ’مکاتیب حالی‘ سے لیں گے۔

حالی سر سیّد کے جانشیں تھے اور ان کے تمام ارادوں، منصوبوں اور تحریکوں میں ہمیشہ ساتھ رہتے تھے۔ایسا نہیں کہ سر سیّد مشہور تھے تبھی ان کے ساتھ رہتے ہوں بلکہ حالی اپنا قدم سوچ سمجھ کر اٹھاتے تھے۔کوئی بھی شخص تنہا رہ کر انقلاب نہیں لا سکتا ان کے ارادوں کو سر سیّد کے خیالات نے جلا بخشی۔مذہبی خیالات اور مغربی افکار میں حالی اور سر سیّد ایک تھے لیکن تعلیم نسواں کے سلسلے میں حالی، سر سیّد سے جدا نظر آتے ہیں۔

سر سیّد، ممتاز علی کو تعلیم نسواں کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

”آپ کا ایک لمبا پرائیویٹ خط کئی دن سے میرے سامنے رکھا ہوا ہے میں اس کے جواب لکھنے کی فرصت ڈھونڈ رہا تھا۔اس وقت اس کا جواب لکھتا ہوں۔میری نہایت دلی آرزو ہے کہ عورت کو بھی نہایت عمدہ اور اعلی درجہ کی تعلیم دی جاوے۔مگر موجودہ حالت میں کنواری عورتوں کو تعلیم دینا ان پر سخت ظلم کرنا اور ان کی تمام زندگی کو رنج و مصیبت میں مبتلا کر دینا ہے... یہ ہی باعث ہے کہ میں نے عورت کی تعلیم میں کچھ نہیں کیا۔“ 1

سر سیّد احمد خاں دوسرے خط میں، جو ممتاز علی نے ہفتہ وار اخبار ’تہذیب النسواں‘ کی اجازت کے لیے لکھا تھا، اس کے جواب میں لکھتے ہیں کہ:

”آپ چاہیں میرا مشورہ پسند نہ کریں مگر میں یہی کہوں گا کہ آپ عورتوں کے لیے اخبار جاری نہ کریں۔آپ یقین کریں کہ آپ اسے جاری کر کے پچھتائیں گے اور تکلیف نقصان اور سخت بدنامی کے بعد بند کرنا پڑے گا... میری رائے میں اگر کوئی اخبار مستورات کے لیے جاری کیا جائے تو اس کا نام تہذیب النسواں ہونا چاہیے۔“ 2

حالی ابتدا سے ہی تعلیم نسواں کے بہت بڑے حامی تھے۔ایسا نہیں کہ سر سیّد تعلیم نسواں کو ضروری نہ مانتے ہیں لیکن اس وقت حالات ایسے نہیں تھے کہ عورتوں کو تعلیم یافتہ کیا جائے اور مرد ذات کا بڑا حصہ جو قوم کے آنے والے مستقبل تھے ان کو نظر انداز کیا جائے۔اسی لیے سر سیّد پہلے لڑکوں کے لیے تعلیم کا پختہ انتظام کرنا چاہتے تھے۔حالی بھی سر سیّد کی اس بات کو نظر انداز نہیں کرتے لیکن تعلیم نسواں کو ضروری مانتے ہیں۔مناجات بیوہ، چپ کی داد، مجالس النسا، اور بیٹیوں کی نسبت سے قطعات بھی لکھے جن میں انھوں نے عورتوں کی بدحالی کی تصویر کھینچی ہے اور اس کی وجہ تعلیم کا نہ ہونا مانا ہے۔’چپ کی داد‘ میں عورت کی تعلیم سے محرومیت کی دردناک تصویر کھینچتے ہیں:

جب تک جیو تم علم و دانش سے رہو محروم یاں
آئی ہو جیسی بے خبر ویسی ہی جاؤ بے خبر
تم اس طرح مجہول اور گم نام دنیا میں رہو
ہو تم کو دنیا کی نہ دنیا کو تمہاری ہو خبر

1870-71 میں حالی لاہور گئے اور انجمن پنجاب کے مشاعروں میں شرکت کر کے ان میں جان ڈال دی۔آزاد سے زیادہ حالی کی نظمیں مشہور ہوئیں۔بہت سے نقاد نے تو حالی کو ہی نظم جدید کی تحریک کا علمبردار مانا ہے۔لیکن حالی اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں کہ:

”لاہور ہی میں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کی ایما سے مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے پرانے ارادے کو پورا کیا۔یعنی 1874 میں ایک مشاعرہ کی

بنیاد ڈالی۔''[3]

محمد حسین آزاد جن کی شخصیت سے کوئی بھی ناواقف نہیں ہے، 1880 میں جب انھوں نے آب حیات مرتب کی تب حالی سے ہی غالب کے ایک شعر :

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

کے معنی پوچھے تھے حالی اس کے جواب میں لکھتے ہیں کہ:

''سر ہونے کے معنی جہاں تک میں نے سمجھے ہیں، کھلنے کے ہیں۔ والعلم عنداللہ۔ شاید شاعر کی یہ مراد ہے کہ وصل کی تیاری کے وقت جو معشوقہ کی زلفیں سر گوندھنے کے لیے کھلتی ہیں دیکھیے وہ وقت کب آتا ہے۔ ظاہر ہے اس وقت عمر ختم ہوجائے گی۔''[4]

آزاد نے آب حیات میں مومن خان مومن کا مکمل حال نہیں لکھا اس بات پر بھی بہت سی تنقیدیں کی گئیں اس کے متعلق بھی حالی نے آزاد کو ایک خط میں لکھا ہے کہ:

''آپ لوگوں کی یاوہ سرائی پر کچھ التفات نہ کیجیے ... اور اپنا کام کیے جائیے۔ نکتہ چینیوں کے خوف سے مفید کام بند نہیں کیے جاسکتے۔'' [5]

اسی طرح آزاد نے حالی کو قواعد کے متعلق خط لکھا تھا جس میں چند سوالات کے جواب مانگے تھے۔ حالی نے بہت ہی ہمدردی کے ساتھ ان کے جواب دیے اور لسانیات کے ماہر آزاد کو قواعد کی جانکاری فراہم کی۔

یہ حالی کی انسان دوستی کی بہترین مثالیں ہیں کہ انھوں نے اپنے زیادہ تر معاصرین کی کتابوں پر تبصرے کیے ان کی مدد اور اصلاح کی لیکن ان ہی معاصرین نے حالی کو کبھی نہیں سراہا۔ وہ کبھی کسی سے تعلقات خراب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ:

''ہم عصروں اور ہم چشموں کی رقابت پرانی چیز ہے... مولانا اس چیز سے بری معلوم ہوتے ہیں۔ محمد حسین آزاد اور مولانا شبلی کی کتابوں پر کیسے اچھے تبصرے لکھے ہیں اور جو باتیں قابل تعریف تھیں ان کی دل کھول کر داد دی ہے۔ مگر ان بزرگوں میں سے کسی نے مولانا کی کسی کتاب کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔'' [6]

شبلی کی تمام تصنیفات کو حالی نے سراہا اور ان کی کاپیاں دوسروں کو بھی بہم پہنچائی تا کہ لوگ ان کی تصنیف سے استفادہ کریں۔ 'ظفر علی خاں' اپنا رسالہ 'دکن ریویو' نکالتے تھے۔ اس میں بہت سے لوگوں کے پرچے شائع ہوتے، مولانا شبلی کی کتاب پر بھی تبصرہ کیا گیا تھا جس میں بہت نکتہ چینی سے کام لیا گیا۔ جب حالی کی حیدرآباد میں ظفر علی خاں سے ملاقات ہوئی تب انھوں نے اس کے متعلق سنجیدگی کے ساتھ کہا کہ:

''میں تنقید سے منع نہیں کرتا۔ تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید کریں گے تو ہماری اصلاح کیوں کر ہوگی۔ لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اڑانا منصب تنقید کے خلاف ہے۔''[7]

شبلی نے حیات جاوید کو مکمل سوانح عمری نہیں مانا ہے اور اس کے متعلق ان کی رائے ہے کہ:

''حیات جاوید سرسید کی ایک رخی تصویر ہے۔ انھوں نے اس کے انداز تحریر کو مدلل مداحی قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ حیات جاوید کو میں لائف نہیں بلکہ کتاب المناقب سمجھتا ہوں اور وہ بھی غیر مکمل۔'' [8]

حالی نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، نہ ہی کوئی بے جا تنقید کی ہے، بلکہ انھوں نے ہمیشہ ان لوگوں کو سراہا ہے جو ان پر تنقید کرتے تھے۔ حالی کے غزل کے متعلق جو خیالات ہیں اور وہ اس کو سنڈاس سے بدتر قرار دیتے ہیں لیکن وہ معیاری غزل پر کبھی تنقید نہیں کرتے۔ 1980 کے ایک خط میں حالی، شبلی کے مجموعہ کلام 'دستہ گل' کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''کوئی کیونکر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے سیرت النعمان، الفاروق اور سوانح عمری مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں۔ غزلیں کا ہے کو ہیں شراب دو آتشہ ہے ...خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں... میرا ارادہ تھا کہ اپنا فارسی کلام نظم ونثر جو کچھ ہے اس کو بھی چھپوا کر شائع کردوں مگر دستہ گل دیکھنے کے بعد میری غزلیں خود میری نظر سے گر گئیں۔''[9]

حالی حساس شخصیت کے مالک تھے اور انسان دوستی کے بہت بڑے پیکر بھی۔ وہ کبھی مشہور نہیں ہونا چاہتے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ اپنی تصنیف کو تالیف اور مرتبہ لکھا ہے۔ ان کی بہت سی مخالفتیں ہوئیں مگر ان میں برداشت کا مادّہ بہت زیادہ تھا۔ ان کی شفقت کی ایک مثال یہ کہ حسرت موہانی نے اپنے رسالے 'اردوئے معلّٰی' میں حالی کے متعلق بہت کچھ غلط لکھا تھا جسے مولوی عبدالحق نے 'چند ہم عصر' میں نقل کیا ہے:

''علی گڑھ کالج میں کوئی عظیم الشان تقریب تھی، نواب محسن الملک مرحوم کے اصرار پر مولانا حالی بھی اس میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے... ایک صبح حسرت موہانی دو دوستوں کو ساتھ لیے ہوئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اتنے میں سیّد صاحب (زین العابدین) موصوف نے بھی اپنے کمرے سے حسرت کو دیکھا۔ ان مرحوم میں لڑکپن کی شوخی ابھی باقی تھی، اپنے کتب خانہ میں گئے اور اردوئے معلّٰی کے دو تین پرچے اٹھا لائے... اس کے بعد سید صاحب مصنوعی حیرت بلکہ وحشت کا اظہار کرکے بولے ارے مولانا! یہ دیکھیے آپ کی نسبت کیا لکھا ہے؟ اور کچھ اس قسم کے الفاظ پڑھنا شروع کیے، سچ تو یہ ہے کہ حالی سے بڑھ کر مخرب زبان کوئی ہو نہیں سکتا اور وہ جتنی جلدی اپنے کو اردو کی خدمت سے روکیں اتنا ہی اچھا ہے۔ فرشتہ صفت حالی ملکہ نہیں ہوئے... کئی روز بعد ایک دوست نے حسرت سے پوچھا کہ حالی کے خلاف اب بھی کچھ لکھو گے؟ جواب دیا جو کچھ لکھ چکا ہوں اسی کا ملال اب تک دل پر ہے۔''[10]

حالی کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ ان کے مرنے کے بعد کوئی بھی ان کے کلام کو صحیح طرح سے تو کیا سرسری طور پر بھی مرتب نہیں کرے گا۔ اسی لیے انھوں نے آخر وقت تک اپنا زیادہ تر کلام مرتب کرکے شائع کرا دیا تھا۔ اصول فارسی جو انھوں نے فارسی طلبا کے لیے، بہت امیدوں سے لکھی تھی اسے آج تک کسی نے شائع نہیں کرایا، اور ابتدائی تصانیف بھی ایک مرتبہ کے علاوہ دوسری مرتبہ شائع نہیں ہوئیں۔ حالی نے ان کا تذکرہ اپنے خط میں کیا ہے جو انھوں نے 15 اگست 1910 میں مولانا ظفر علی خاں کے نام لکھا تھا:

''اپنا کلام نظم ونثر اردو وفارسی وغیرہ مرتب کرنا چاہتا ہوں مگر نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ کسی سے امید نہیں کہ میرے بعد کوئی اس کو بوجوہ دلخواہ نہ سہی، سرسری طور پر ہی مرتب کردے۔''[11]

حالی کی اسی اخلاق پسندی نے ان کے تعلقات میں کبھی بھی فرق نہیں آنے دیا، انھوں نے ہر طور سے مذہب اور تہذیب میں اخلاق کو ترجیح دی۔ وہ ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے انھوں نے جس میدان میں بھی قدم رکھا اس میں اپنے نقوش قائم کیے۔ ادبی اعتبار سے حالی کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ لیکن وہ اس میدان میں بھی انسانیت کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ اقبال بھی اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

مشہور زمانے میں ہے نام حالی
معمور مئے حق سے ہے جام حالی

حواشی اور کتابیات

1. مکتوبات سرسیّد، مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، مجلس ترقی اردو ادب لاہور 1969ص 2. 81-380 ایضاً ص 3. 382 مقالات حالی، ترجمہ حالی، حصّہ اوّل جامعہ پریس دہلی 1934ص 4. 68-267 مکاتیب حالی، مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، اردو مرکز لکھنو 1950ص 5. 17 مکاتیب حالی، مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، اردو مرکز لکھنو 1950ص 18 6. چند ہم عصر، مولوی عبدالحق، انجمن پاکستان کراچی 1953ص 7. 157 چند ہم عصر، مولوی عبدالحق، انجمن پاکستان کراچی 1953 ص 8. 159 حیات جاوید تلخیص، مولانا الطاف حسین حالی، اعلی پریس دہلی 1977ص 9. 39 مکاتیب حالی، مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، اردو مرکز لکھنو 1950ص 10. 42 چند ہم عصر، مولوی عبدالحق، انجمن پاکستان کراچی 1953ص 60-159

■

Sana Kausar, Research Scholar, Dept of Urdu, Aligarh Muslim University, Aligarh - 202002 (UP)

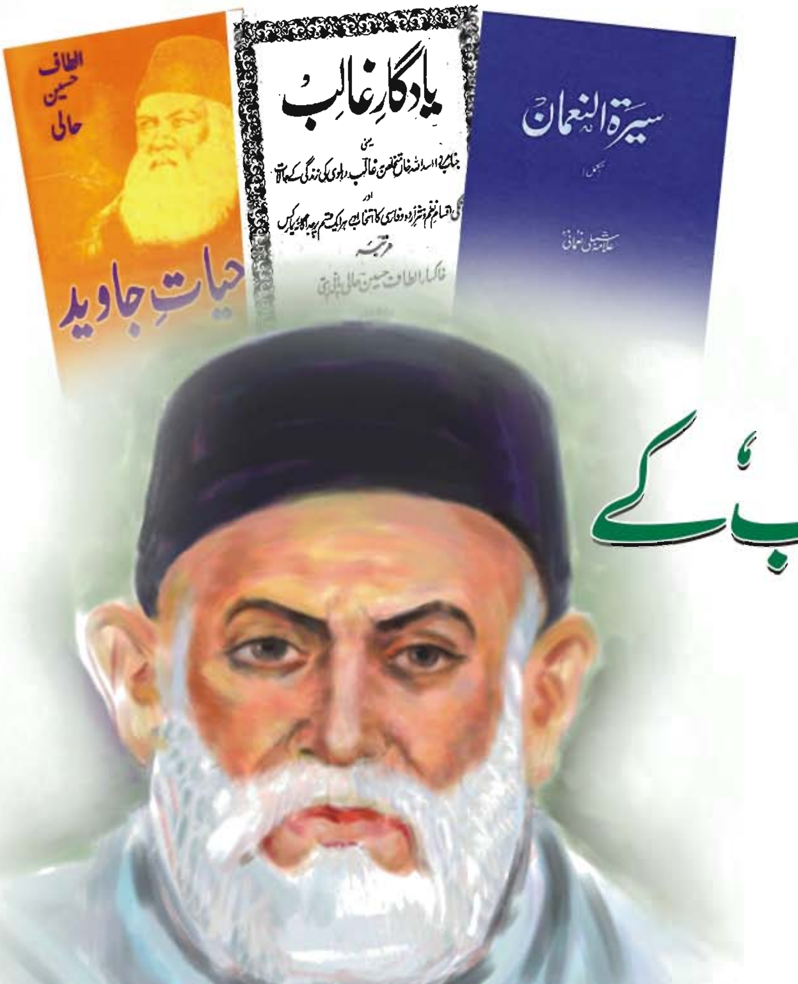

فریدہ خاتون

حالی کی انفرادیت

'یادگارِ غالب' کے آئینے میں

اردو نثر کی تاریخ میں خواجہ الطاف حسین حالی کو منفرد سوانحی اور تنقیدی نثر لکھنے کی وجہ سے اہم مقام حاصل ہے۔ انھوں نے اردو ادب کے دامن کو 'حیات سعدی' 1884 'یادگار غالب' 1896 اور 'حیات جاوید' 1901 جیسی اہم سوانحی کتابوں سے آراستہ کیا۔ حالی اور ان کے عہد سے ہی اردو میں صنف سوانح نگاری کی روایت کا آغاز ہوا، ان کے معاصرین میں مولانا شبلی نعمانی نے المامون، سیرت النعمان، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم اور 'ملکہ وکٹوریہ کی سوانح عمری' قلمبند کی۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالی کا عہد سوانحی ادب کے لیے سازگار رہا اور ان کے دور میں ادبی، مذہبی اور سیاسی شخصیات پر سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ شبلی نعمانی کی سوانح عمریوں میں مذہبیت اور تاریخیت کا غلبہ ہے، اس لیے ان کی بیشتر سوانح عمریوں کو 'سیرت' کی حیثیت دی جاتی ہے جبکہ شمس العلما ذکاء اللہ نے سیاست کو بنیاد بنا کر سوانح نگاری کو فروغ دیا۔ مولانا حالی وہ واحد سوانح نگار ہیں جنھوں نے نہ تو مذہبی شخصیت کو سوانح نگاری کا وسیلہ بنایا اور نہ ہی کسی سیاسی شخصیت کی زندگی کے حالات لکھ کر اس صنف کی آبیاری کی، بلکہ خالص ادبی شخصیات کی زندگی کے حالات تحریر کر کے سوانح نگاری کی صنف کو ادبی رنگ سے چمکایا۔ چنانچہ 'حیاتِ سعدی' میں فارسی کے ممتاز شاعر شیخ سعدی علیہ الرحمہ کی زندگی کے حالات، 'حیات جاوید' سرسید احمد خاں کے احوال وکوائف اور ان کے کارناموں کی روداد سناتی ہے۔ شیخ سعدی، مرزا غالب اور سرسید احمد خاں کے حالاتِ زندگی اور کارناموں کی تفصیل صداقت کے ساتھ پیش کر کے مولانا حالی نے اردو سوانح نگاری کی تاریخ میں منفرد درجہ حاصل کیا۔ 'یادگار غالب' ہمہ جہت انفرادیتوں سے مربوط مولانا حالی کی ایسی سوانحی کتاب ہے جس میں پہلی بار کسی اردو شاعر کی زندگی کے حالات اس قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے اور دوسرے حصّے میں ان کے کلام پر منصفانہ تنقید کر کے جدید اصول تنقید کو رواج دیا گیا۔

مولانا حالی کے عہد تک تذکروں کی روایت عام تھی۔ انھوں نے سوانحی رجحانات کو نہ صرف تذکروں سے اخذ کیا بلکہ محمد حسین آزاد کی شاہکار تصنیف 'آب حیات' اور سرسید کی لکھی ہوئی کتابیں 'جام جم'، 'سلسلۃ الملوک' اور 'آثار الصنادید' بھی خاص طور سے ان کے پیش نظر تھیں۔ حالی کے عہد تک عربی اور فارسی میں سوانحی اور تاریخی کتابیں دستیاب تھیں جن کے مطالعے کے بعد حالی کا سوانحی رجحان تشکیل پانے لگا۔ انھوں نے تذکروں کی اختصار نویسی سے پرہیز کرتے ہوئے شخصیت کی زندگی کے دلچسپ اور اہم حالات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی جانب توجہ دی اور عقیدت مندانہ رویے کے فروغ اور بیجا تعریف اور مبالغے سے پرہیز برتتے ہوئے خالص حقیقت پسند رویہ اختیار کیا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرسید سے رفیقانہ انسلاک کی وجہ سے ان میں جہاں بے شمار خوبیاں پیدا ہوئیں وہیں حقیقت پسندی کی خصوصیت بھی سرسید کی دین ہے۔ قابل ذکر امر یہ ہے کہ شیخ سعدی اور غالب کے سوانح لکھتے ہوئے حالی نے کوئی سخت ناقدانہ رویہ اختیار نہیں کیا۔ لیکن سرسید کے سوانح میں جہاں موقع ملا وہ تنقیدی نقطہ نظر اختیار کرتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ یہ خود سرسید کا پسندیدہ انداز تھا۔ تاہم حالی کی تنقید میں اعتدال پسندی اور میانہ روی ہے جس سے منصفانہ اور عادلانہ تنقیدی نظریات کی بنیاد پڑی۔ مولانا حالی کی سوانحی کتب میں مواد، اظہار اور حقائق کی پیشکش کا جو طرز ہے وہ اردو ادب کے لیے بالکل نیا انداز ہے۔ ممکن ہے انگریزی ادب میں سوانح نگاری کے رجحانات کا بھی انھیں اندازہ ہوا ہو، کیونکہ لاہور کے گورنمنٹ بک ڈپو کی ملازمت کے دوران انگریزی ادب اور اس کی اصناف کی صورت حال کو سمجھنے کا انھیں موقع ملا تھا۔

سوانحی کتاب کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس میں سوانح نگار

نہ صرف تاریخی تسلسل کے لحاظ سے شخصیت کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتا ہے بلکہ شخصیت پر اثر انداز ہونے والے عوامل کی بھی نشان دہی کرتا ہے 'یادگار غالب' کے مواد اور متن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے 'تدریجی ارتقا' پر خصوصی توجہ دی ہے اور غالب کی زندگی کے تمام اہم گوشوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ 'یادگار غالب' بالارادہ اور منصوبہ بند طریقے سے تحریر کی گئی۔ 'آب حیات' میں محمد حسین آزاد نے اپنے استاد شیخ ابراہیم ذوق کے حالات کا ضرورت سے زیادہ تفصیل سے ذکر کیا تھا جبکہ استادِ سخن 'مرزا غالب' کو کم اہمیت دی گئی۔ مولانا حالی نے اپنے استاد کی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھنے کے لیے بڑے اہتمام کے ساتھ سوانح عمری تحریر کی جس میں سوانح تحریر کرنے کے لیے درکار تمام وسیلے بطور خاص بروے کار لائے گئے 'یادگار غالب' میں مولانا حالی نے اپنے استاد محترم مرزا غالب کے سوانحی حالات کو مربوط اور منضبط انداز میں یکجا کیا ہے۔ مرزا غالب نے آگرہ میں پیدائش کے بعد دہلی میں بھر پور زندگی گزاری تھی۔ بادشاہت کے خاتمے اور تاج برطانیہ کے دور میں انھوں نے تکالیف جھیلی تھیں۔ کمپنی بہادر کے ناز سہے اور غدر کے حالات میں بے چارگی کے ساتھ انھیں زندگی گزارنی پڑی تھی۔ 'یادگار غالب' میں غالب کی زندگی کے حالات کے ساتھ نشیب و فراز کا گہرائی کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ کامیاب سوانح وہ سمجھی جاتی ہے جس میں حالات کی بدلتی کیفیتوں کی عکاسی ہو اور 'یادگارِ غالب' میں ان تمام عوامل کی واضح نشاندہی موجود ہے۔ غالب کے حالات بچپن سے وفات تک تمام حقائق کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے یادگارِ غالب سوانحی صنف کی نمائندہ ایک بہترین تالیف ہے۔

سوانح حیات میں 'پیشکش' کو اپنی مرضی کے تابع نہیں بلکہ حالات اور واقعات کے تابع رکھا جاتا ہے۔ مولانا حالی نے مرزا غالب کے سوانحی حالات کو اس کے فطری رنگ میں پیش کیا ہے۔ یادگارِ غالب کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا حالی فن سوانح نگاری کے رموز سے خوب آگاہ تھے اور یہ وصف 'یادگار غالب'' کو سوانحی اصولوں پر کار بند کتاب قرار دیتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالقیوم نے اپنی تصنیف میں لکھا ہے:

''حالی کو واقعات سمیٹ کر نتیجہ نکالنے کا سلیقہ اور پھر انھیں اعتدال و خلوص کے ساتھ پیش کرنے کا جو ملکہ ہے اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔''

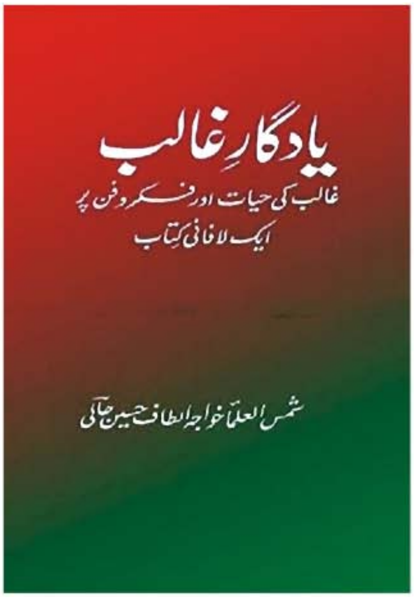

یعنی 'یادگار غالب' مولانا حالی کی اعتدال پسندی اور اخلاص کی بہترین مثال ہے۔

حالی کمزوریوں کی نشاندہی بھی کرتے ہیں لیکن انھوں نے اچھائیوں کو شعوری طور پر ابھارنے کی کوشش کی ہے جیسا کہ ایک جگہ لکھتے ہیں ''مرزا کی لغزشیں خلقت کو دکھانی مقصود نہیں بلکہ انصاف اور حق پسندی کی شریف خصلت، جس کے بغیر انسان کبھی ترقی نہیں کر سکتا، مرزا کی ذات میں دکھانا مقصود ہے۔'' اس طرح حالی نے 'یادگارِ غالب' میں اصلاحی جذبے کے زیر اثر سوانح نگاری میں ادبی و شاعرانہ شخصیت کو اجاگر کیا ہے اور مرزا غالب کے طنز و ظرافت کے نمونے پیش کر کے مردہ دل سوسائٹی کو خوشی کا موقع فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ 1857 کے بعد دہلی پر چھائی ہوئی مردہ دلی کو اپنی تحریروں سے دور کرنے کا یہ زرین موقع مولانا حالی نے 'یادگارِ غالب' کے ذریعے حاصل کیا۔

مرزا غالب کی زندگی کے تمام کارناموں کا احاطہ کرتے ہوئے حالی لکھتے ہیں:

''اگر چہ مرزا کی زندگی میں کوئی بڑا کام ان کی شاعری اور انشا پردازی کے سوا نظر نہیں آتا مگر صرف اسی کام نے ان کی لائف کو دارالخلافہ کے آخری دور کا مہتم بالشان واقعہ بنا دیا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس ملک میں مرزا پر فارسی نظم و نثر کا خاتمہ ہو گیا۔''

مولانا حالی نے مرزا غالب کے سوانحی حالات کو اکٹھا کرنے کے لیے جس انداز سے جستجو کی اور اس کے حصول کے بعد اسے جس ترتیب اور سلیقے کے ساتھ 'یادگار غالب' میں بکھیرا ہے، وہ ان کا اپنا خاص سلیقہ ہے۔ خطوط جو انسان کی نجی زندگی کے عکاس ہوتے ہیں حالی نے ان سے مدد لی ہے۔ اور غالب کے دوستوں اور قریبی تعلق رکھنے والوں سے انھوں نے معلومات اکٹھا کیں دیباچہ یادگار غالب میں لکھتے ہیں:

''میں نے مرزا کی تصنیفات کو دوسروں سے مستعار لے کر جمع کیا اور جس قدر اس میں ان حالات اور اخلاق و عادات کا سراغ ملا، قلمبند کیا۔ جو باتیں اپنے ذہن میں محفوظ تھیں یا دوستوں سے زبانی معلوم ہوئیں۔ ان کو بھی ضبط تحریر میں لایا۔''

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا حالی نے سوانح لکھنے کے لیے بنیادی مآخذ سے استفادہ کیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''اسے مرزا کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیے کہ انہیں حالی جیسا شاگرد نصیب ہوا جس کے قلم نے ن کی شاعری اور زندہ دلی کا پیغام جدید ہندوستان کے کانوں تک پہنچایا۔''

اسی طرح 'یادگارِ غالب' کی اولیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شیخ اکرام لکھتے ہیں:

''غالب کی دلفریب شخصیت اور شاعرانہ عظمت کو پہلی بار حالی نے بے نقاب کیا جو علی گڑھ کا رکنِ رکین تھا۔ اور جس کی تالیف 'یادگارِ غالب' میں اس تحریک اور اس کے رہنماؤں کی میانہ روی' واقفیت پسندی' لن ترانیوں سے اجتناب یہ سب باتیں پوری طرح عیاں ہیں۔''

اردو کی سوانحی کتب میں یادگارِ غالب کو کئی وجوہ کی بنیاد پر اہمیت حاصل ہے۔ عام طور پر سوانحی کتب میں مدح سرائی کا عنصر غالب ہوتا ہے، شخصیت کے معائب سے پردہ پوشی کی جاتی ہے اور طبیعت اور فطرت کے خلاف مبالغہ آمیز انداز میں محاسن بیان کیے جاتے ہیں جس کی وجہ سے 'ہیرو ورشپ' کا رجحان فروغ پاتا ہے۔ اردو کی اکثر سوانحی کتابیں ان خصوصیات سے وابستہ ہیں جبکہ 'یادگارِ غالب' کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا حالی

حالی کمزوریوں کی نشاندھی بھی کرتے ھیں لیکن انھوں نے اچھائیوں کو شعوری طور پر ابھارنے کی کوشش کی ھے جیسا که ایک جگه لکھتے ھیں "مرزا کی لغزشیں خلقت کو دکھانی مقصود نھیں بلکه انصاف اور حق پسندی کی شریف خصلت، جس کے بغیر انسان کبھی ترقی نھیں کر سکتا، مرزا کی ذات میں دکھانا مقصود ھے۔" اس طرح حالی نے 'یاد گار غالب' میں اصلاحی جذبے کے زیر اثر سوانح نگاری میں ادبی وشاعرانه شخصیت کو اجاگر کیا ھے اور مرزا غالب کے طنز وظرافت کے نمونے پیش کر کے مردہ دل سوسائٹی کو خوشی کا موقع فراھم کرنے کی کوشش کی ھے۔

نے نہ تو مرزا غالب کی غیر ضروری مدح سرائی کی اور نہ ان کے معائب سے روگردانی کی۔ اس کے علاوہ مبالغہ آمیز تعریف سے گریز برتا۔ غالب حالی کے استاد تھے اور اس عہد کے نامور شاعر۔ غالب حالی کے ہیرو بھی تھے۔ ہیرو کی شخصیت اور فن پر اس انداز سے لکھا کہ ان پر ہیرو ورشپ کا الزام نہ لگ سکا۔ حالی نے نہ تو ان کی پرستش کا لہجہ اپنایا اور نہ غیر ضروری مبالغے سے کام لے کر انھیں دوسروں سے برتر بتایا۔ 'یادگار غالب' کی انفرادیت کا یہ سب سے روشن پہلو ہے اور یہ وہ اوصاف ہیں جن کی وجہ سے 'یادگار غالب' میں توازن کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔

فن سوانح نگاری کے اہم خدوخال میں شخصیت کے محاسن اور معائب دونوں کا تذکرہ ضروری ہے۔ مشرقی سوانح نگاروں نے اکثر محاسن کا ذکر کیا اور معائب کی پردہ پوشی کی جبکہ مغربی دنیا میں انسان کی خوبیوں اور خرابیوں دونوں کا ذکر لازم ہے یادگار غالب میں مولانا حالی نے جہاں مرزا غالب کے محاسن بیان کیے ہیں وہیں ان کے معائب کا بھی ذکر کیا ہے لیکن معائب کے ذکر کے دوران عقیدت کو ملحوظ رکھ کر احتیاط سے کام لیا ہے۔ یادگار غالب میں بے شمار محاسن کے ساتھ غالب کی مے خواری، قمار بازی اور مذہب سے دوری کا تذکرہ بھی بڑی احتیاط اور بے باکی کے ساتھ کیا گیا ہے قاری ان معائب اور غالب کی دوسری کمزوریوں کے تذکرے میں ایک خاص طرح کی دلچسپی محسوس کرتا ہے۔ یہ دراصل حالی کے اندازِ بیان کا جادو بھی ہے۔ یوں بھی غالب کی ان کمزوریوں سے قاری میں نفرت کا نہیں بلکہ ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور ان واقعات پر رک کر دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ہے۔ یوں بھی شاعروں کی بے اعتدالیوں، کمزوریوں اور کوتاہیوں سے متعلق واقعات کا تذکرہ اور ان کا مطالعہ اردو کے قاری کا ایک دلچسپ موضوع ہے۔ حالی نے جہاں کہیں غالب کی کمزوریوں کا ذکر کیا ہے انہوں نے کمال ہوشیاری اپنے قلم اور ذہن سے یہ بات نہیں لکھی بلکہ خود غالب کی تحریروں اور خطوط کے حوالے سے لکھی ہے۔ گویا ان عیوب کی نشان دہی حالی نے کی لیکن غالب سے اقبال کروالیا ہے۔

مولانا حالی نے جب 'حیات سعدی' لکھی تو اس وقت ان کی عمر 49 سال تھی جبکہ کہ 'یادگار غالب' کی اشاعت پر ان کی عمر تقریباً 60 سال تھی اور 'حیات جاوید' کی اشاعت کے وقت ان کی عمر 64 سال تھی 'حیات سعدی' میں مولانا حالی نے معرب اور مفرس اسلوب اختیار کیا جبکہ 'حیات جاوید' میں مولانا حالی کے اسلوب پر انگریزی کا غلبہ نظر آتا ہے چنانچہ وہ انگریزی الفاظ لائف، لکچر، اسپیچ وغیرہ اپنی تحریر میں بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔ ان دو کتابوں کے مقابلے میں 'یادگار غالب' کے اسلوب پر غور کیا جائے تو وہ سادہ، آسان اور عام فہم نظر آتا ہے اس میں نہ تو حیاتِ سعدی کی طرح عربی و فارسی تراکیب کی بھرمار ہے اور نہ جابجا انگریزی الفاظ کا استعمال۔ سیدھا سادا اردو کا اسلوب 'یادگارِ غالب' کی اہمیت بڑھانے کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ اسی بنیاد پر یہ کہا جاتا ہے کہ یادگارِ غالب کی انفرادیت اس کی سادہ زبان، اور اظہار کا متوازن رویہ ہے۔ حالی کے تینوں تذکروں کے مطالعے سے نہ صرف حالی کے اسلوب میں تبدیلیوں کے خواص کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سرسید کے رفقا نے زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر کس طرح اپنی زبان اور اسلوب میں تبدیلیوں کو گوارا کیا۔

سلاست، روانی اور بے ساختگی جہاں تحریر کا وصف ہے وہیں وضاحت وبلاغت کی وجہ سے بھی اظہار کی انفرادیت جلوہ گر ہے۔ مولانا حالی نے 'یادگارِ غالب' میں زبان کے لطف کو پوری طرح ملحوظ رکھا۔ محاوروں، تشبیہات اور استعاروں کا بھی سہارا لیا اور سبک، رواں، پرتاثیر اور نغمگی سے لبریز لفظیات بھی استعمال کیے۔ قید کی زندگی کو غالب نے جس نادر تشبیہ کے ذریعے بیان کیا ہے مولانا حالی نے اسے ویسے ہی پیش کر دیا کہ ''پہلے گورے کی قید میں تھا۔ اب کالے کی قید میں ہوں۔'' مرزا غالب کی تشبیہات 'مہر نیم روز' اور 'ماہِ نیم ماہ' کی وضاحت کرتے ہوئے حالی نے ثابت کیا ہے کہ یادگار غالب جیسی سوانحی کتاب میں بھی تشبیہات کا موزوں استعمال ہوسکتا ہے بلکہ استعاروں کے استعمال سے بھی گریز نہیں کیا ہے۔

مولانا حالی پانی پت سے تعلق رکھتے تھے جہاں اودھی کا غلبہ تھا اور مرزا غالب کا تعلق آگرہ سے تھا جہاں برج بھاشا کا اثر تھا۔ مولانا حالی نے 'یادگارِ غالب' دہلی میں لکھی۔ یادگارِ غالب کی نثر پر نہ تو برج کا اثر دکھائی دیتا ہے اور نہ اودھی کا۔ بلکہ ساری تالیف دہلوی طرز نثر کی آئینہ دار ہے۔ خالص کھڑی بولی کے اثرات اپنا جلوہ دکھاتے ہیں۔ مولانا حالی نہ تو مسجع و مقفیٰ نثر استعمال کرتے ہیں اور نہ ہی لائیوں، فرمائیوں جیسے مقامی الفاظ کی نشستوں سے کام لیتے ہیں۔ یادگارِ غالب میں دہلویت کار چاؤ ہے۔

دہلی کی نثر پر کئی قسم کے رجحانات کا غلبہ رہا۔ غالب کے خطوط اور مولانا حالی کی نثر سے قبل تحریر کی جانے والی دہلی کی نثر روایات کی پاسدار تھی اور ایسا اسلوب اختیار کرنا باعث فخر سمجھا جاتا تھا جس میں تفہیم گنجلگ ہوجائے اور قاری کے ذہن کا امتحان لیا جائے۔ ایک اعتبار سے دہلی کے اسلوب پر پہیلیاں بجھانے والا طرز غالب تھا۔ یادگار غالب کے اسلوب کی تازہ کاری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کتاب کو تحریر کیے ہوئے زائد ایک سو بیس سال گزر گئے لیکن اس کی نثر کی شادابی اور تازہ کاری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ حالی کی نثر کا مطالعہ کیا جائے تو وہ سرسید کی نثر سے زیادہ آسان اور پرتاثیر ہے اسی لیے اس نثر کی تازگی آج تک برقرار ہے۔ یادگار غالب، عظیم شاعر اور پرکشش شخصیت کے مالک، غالب پر لکھی گئی پہلی مفصل کتاب ہے۔ غالب کی عظمت اور شاعرانہ انفرادیت کے بارے میں حالی نے سب سے پہلے لکھا اور اس طرح مدلل متوازن، موثر اور دلکش انداز میں لکھا کہ ایک زمانہ غالب پر لکھی گئی ہر کتاب پر حالی کی کتاب کا اثر قائم رہا۔ اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود غالبیات کے سرمائے کی یہ سب سے نمایاں کتاب ہے اس میں بیان کردہ غالب کے سوانح اور ان کی شاعری کے تنقیدی جائزے پر برسوں سے اظہار خیال جاری ہیں۔ ناقدین نے یادگار غالب میں اظہار کردہ باتوں سے کہیں کہیں اختلاف تو کیا لیکن کلی طور پر اس کو رد نہیں کیا اور اس کے حوالے سے بحثیں آج بھی جاری ہیں۔ یادگار غالب میں حالی نے محض سوانح قلم بند نہیں کیے بلکہ غالب کے جذبات کی بھی عکاسی کی ہے۔ اس کتاب کا قاری غالب کی زندگی کے اتار چڑھاؤ میں خود کو جذباتی طور پر شریک محسوس کرتا ہے۔ غالب پر بے شمار کتابیں شائع ہونے کے باوجود یادگارِ غالب کو اپنی انفرادیت کے باعث ایک مقام امتیاز حاصل ہے۔

■

Dr. Fareeda Khatoon, C/O Sheesh Manzil, Textile Center, Tower Chowk, Darbhanga - 846004 (UP)

اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود غالبیات کے سرمائے کی یہ سب سے نمایاں کتاب ہے اس میں بیان کردہ غالب کے سوانح اور ان کی شاعری کے تنقیدی جائزے پر برسوں سے اظہار خیال جاری ہیں۔ ناقدین نے یاد گار غالب میں اظہار کردہ باتوں سے کہیں کہیں اختلاف تو کیا لیکن کلی طور پر اس کو رد نہیں کیا اور اس کے حوالے سے بحثیں آج بھی جاری ہیں۔ یاد گار غالب میں حالی نے محض سوانح قلم بند نہیں کیے بلکہ غالب کے جذبات کی بھی عکاسی کی ہے۔ اس کتاب کا قاری غالب کی زندگی کے اتار چڑھاؤ میں خود کو جذباتی طور پر شریک محسوس کرتا ہے۔ غالب پر بے شمار کتابیں شائع ہونے کے باوجود یاد گارِ غالب کو اپنی انفرادیت کے باعث ایک مقام امتیاز حاصل ہے۔

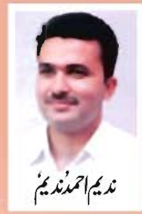

ندیم احمد ندیم

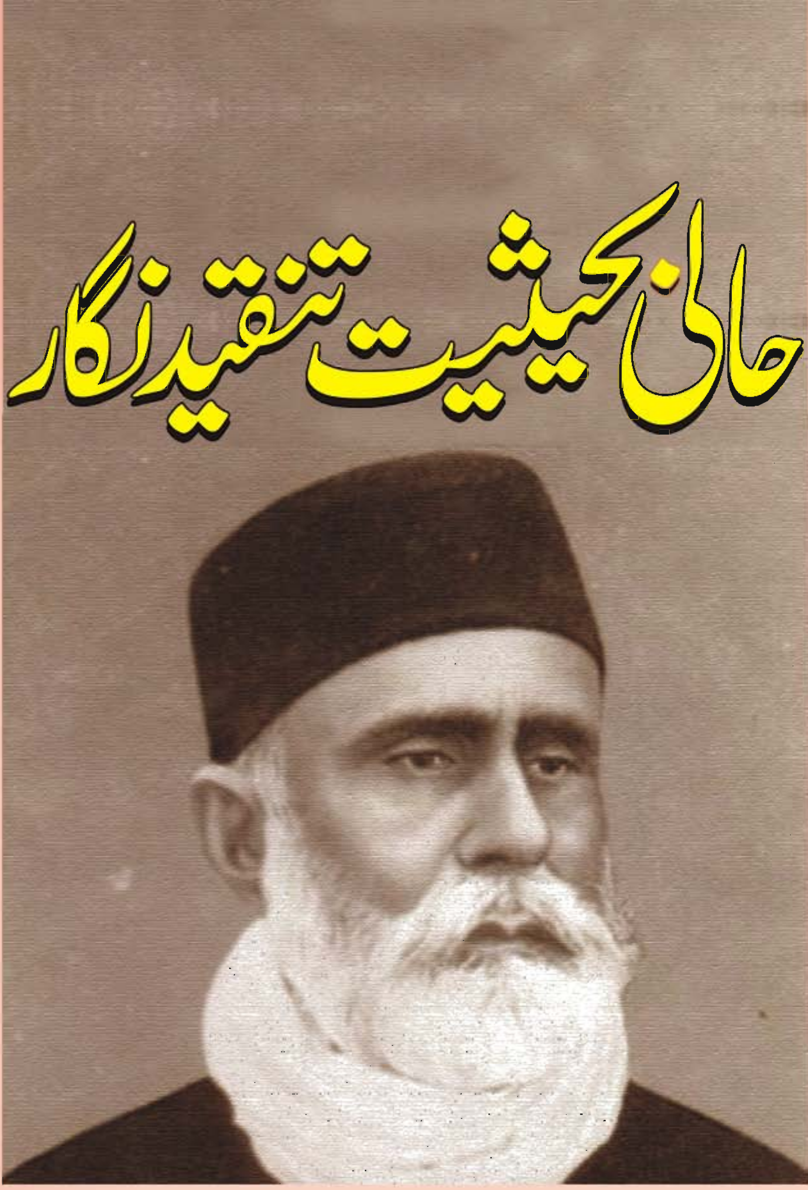

حالی بحیثیت تنقید نگار

الطاف حسین حالی کی شخصیت کو اُردو زبان وادب میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے ادب کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ وہ ایک جدید طرز کے قادرالکلام شاعر، انشا پرداز، سوانح نگار، خاکہ نگار اور ایک نقاد کے طور پر سامنے آئے۔ حالی نے ہی اردو ادب میں جدید شاعری، سوانح نگاری اور باقاعدہ تنقید کی شروعات کی لیکن یہاں ہمارا مقصد اُن کو ایک تنقید نگار کے طور پر پرکھنا ہے اس لیے مطالعے کو تنقید کے دائرے میں ہی مرکوز رکھا جائے گا۔

یہ واضح حقیقت ہے کہ ایک فنکار یا ادیب اپنے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اُس کا معاشرتی، سماجی اور تاریخی ماحول اس کے فن پر اثرانداز ہوتا ہے۔ اسی لیے کہا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی فنکار اپنے ماحول کے پیچ وخم سے واقف ہے، اگر اُس کی انگلیاں نبضِ کائنات پر ہیں نیز اُسے زندگی کا فہم وادراک ہے تو اس کی یہی آواز ایک آفاقی آواز بن جاتی ہے۔ اس لیے بہتر ہوتا ہے کہ کسی قلم کار کے فن کا جائزہ لیتے وقت اُس کے ظاہری اور باطنی ماحول کو سمجھا جائے تاکہ فن کی صحیح تفہیم وتشریح ممکن ہوسکے۔ آیئے حالی کی خدمات کا جائزہ لینے سے قبل اُن کے ادبی ماحول پر نظر ڈالتے ہیں۔

الطاف حسین حالی 1837 میں غیر منقسم پنجاب کے تاریخی شہر پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں عربی، فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اُس کے بعد دہلی کا رُخ کیا اور باقاعدہ طور پر تعلیم حاصل کی۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ وہاں کے ادبی ماحول نے بھی حالی کی رہنمائی کی۔ وہاں انھیں غالب، شیفتہ اور آزاد جیسے شاعروں اور ادیبوں کی صحبتوں سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔

حالی کا عہد اردو کا عہدِ زرّیں مانا جاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اُردو ادب کے اُفق پر نئی سیاسی، سماجی اور ادبی تحریکات نظر آرہی تھیں۔ ایک طرف حالی کے اُستاد مرزا غالب نے اپنے خطوط سے جدید طرز کی نثر لکھنے کی بنیاد ڈالی تو دوسری طرف شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد اور حالی کے ہی ہمعصر محمد حسین آزاد نے 'آبِ حیات' 1868 کے ذریعے اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ کو پانچ ادوار کے حوالوں کے ذریعے پیش کرنے کی کوشش کی۔ سماجی اور تعلیمی بیداری کے لیے حالی کے عہد میں ہی سرسیّد احمد خاں نے علی گڑھ سے اصلاحی تحریک شروع کی۔ فکشن کے حوالے سے دیکھا جائے تو عہدِ حالی ہی میں ڈپٹی نذیر احمد کے ناول توبۃ النصوح، ابن الوقت، مراۃ العروس وغیرہ نیز منشی گمانی لعل کا ناول 'ریاضِ دلربا' وہ محرکات ہیں جو اُردو ادب میں نئی بیداری اور نئے تجربات کے لیے زمین ہموار کر رہے تھے۔ اس نئی ادبی فضا میں حالی نے جہاں موضوعاتی شاعری اور نظم گوئی کی طرف خصوصی توجہ دی اور اپنے عہد کے شاعروں کو متوجہ کرکے ادب برائے زندگی کی شروعات کی وہیں اُردو تنقید نگاری کی داغ بیل بھی ڈالی۔

حالی کی ادبی تحریکات کو اُن کے اُستاد غالب کی بھی بھرپور سرپرستی حاصل رہی۔ غالب کی صحبت میں حالی کی ملاقات نواب شیفتہ سے ہوئی جو غالب کے تلامذہ اور خاص دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ حالی کے کلام میں پائی جانے والی سادگی، حقیقت پسندی اور مبالغے سے احتجاج میں شیفتہ کی صحبت کو بھی کافی دخل ہے۔ 1868 میں حالی کی ملاقات سرسیّد احمد خاں سے ہوئی۔ قوم کی اصلاح کا جو مشن سرسیّد لے کر چلے تھے حالی نے بھی اُسے قبول کیا اور سرسیّد کی تحریک سے وابستہ ہوگئے۔ اسی دوران حالی کو پنجاب بک ڈپو، لاہور میں کام کرنے کا موقع ملا۔ اس کام سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ حالی کو انگریزی ادب پڑھنے کا بھی موقع ملا۔ اس طرح انھیں اُردو ادب میں نئی نئی گنجائشیں نظر آنے لگیں۔ انھوں نے انگریزی ادب کے تنقیدی اصولوں کا بھی مطالعہ کیا اور انھی کے اثر سے انھیں اُردو ادب کی نظرِ ثانی کی تحریک ملی۔

سرسید احمد خاں کے مشہور زمانہ رسالے' تہذیب الاخلاق' میں قوم کی اصلاح کے ساتھ ساتھ شعر وادب کی اصلاح پر بھی مضامین شائع ہو رہے تھے۔ اسی دوران حکومت پنجاب کے کرنل ہالرائیڈ اور محمد حسین آزاد کی کوششوں سے ادب برائے زندگی کی تحریک کے تحت 'انجمن پنجاب' کا قیام عمل میں آیا جس کے زیر اہتمام ایسے مشاعروں کا آغاز ہوا جس میں غزلوں کی بجائے نظمیں پڑھی جانے لگیں۔ حالی نے بھی اس انجمن سے وابستہ ہوکر اولاً برکھارُت، نشاطِ اُمید، حُبّ وطن، مناظرۂ رحم وانصاف جیسی فکر انگیز اور بامقصد نظمیں پیش کرکے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ سرسیّد احمد خاں نے اُن کی شاعری کے بامقصد ہونے کا اعتراف کیا اور حوصلہ افزائی کی۔ اسی سے تحریک پاکر حالی نے مسدّس 'مدوجزرِ اسلام' لکھی جس میں مسلمانوں کے دورِ عروج کو بیان کرتے

ہوئے اُن کی موجودہ بدحالی کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ غرض اس ماحول نے حالی کی تنقیدی صلاحیتوں کو اُبھرنے کا موقع فراہم کیا۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ حالی کو عربی و فارسی ادب پر بھی دسترس تھی اور اپنی ملازمت کے دوران ترجموں کے ذریعے انھوں نے مغربی ادب کے تنقیدی اصولوں سے بھی آشنائی کر لی تھی جس سے یونانی اور لاطینی فنِ شعر و تنقید سے بھی بالواسطہ آگاہی میسّر ہوئی۔ اس وسیع و عمیق مطالعے اور تجربے نے اُن کے قلم کو پختگی اور جدّت عطا کی، جس کے نتیجے میں اپنے عہد کے شعر و ادب پر حالی نے اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار کیا اور اصلاحِ شعر کے لیے کارآمد مشورے بھی دیے۔ اسی خیال کے پیشِ نظر، جب وہ ناہن (موجودہ ہماچل پردیش) میں قیام پذیر تھے تو انھوں نے اپنے تمام تر ماخذات اور تجربات کو بروئے کار لاتے ہوئے 'مقدمہ شعر و شاعری' لکھنے کا قصد کیا، جس میں انھوں نے اصلاحِ سخن اور فنِ تنقید کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہ مقدمہ مع دیوان 1893 میں منظرِ عام پر آیا۔ مقدمے کے ماخذوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں:

''مقدمے کے عربی ماخذوں میں جلال الدین سیوطی کی 'مزہر'، ابن خلدون کی 'مقالاتِ علم و ادب'، ابن رشیق کی 'کتاب العمدۃ' اور 'رسالہ غلۃ' کے فائل قابل ذکر ہیں۔ اُردو ماخذوں میں سب سے بڑا ماخذ 'آبِ حیات' ہے، جس کا اثر جا بجا کتاب میں نظر آتا ہے۔''

حالی نے 'مقدمہ شعر و شاعری' اپنے دیوان کے لیے بطور مقدمہ لکھی تھی لیکن وہ ہمارے ناقدینِ ادب کے نزدیک اس قدر منفرد اور گراں قدر ثابت ہوئی کہ انھوں نے اس کو اُردو ادب کی مستند تنقیدی کتاب کے طور پر تسلیم کیا اور حالی کو باقاعدہ تنقید کا بانی مان لیا کیونکہ حالی سے پہلے جو تنقید ملتی ہے وہ یا تو بیاضوں کی شکل میں ہے یا پھر تذکروں کی صورت میں اور ایک عرصے تک اُردو تنقید انہی تذکروں میں گم رہی۔ اس طرح کے تذکروں میں میر تقی میر کے تذکرے 'نکات الشعرا' کو نقشِ اوّل تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ قائم چاند پوری کے تذکرے ریختہ گویاں سے ہوتا ہوا محمد حسین آزاد کی کتاب 'آبِ حیات' تک پہنچتا ہے۔ کچھ ناقدین 'آبِ حیات' کو تذکروں اور باقاعدہ تنقید کی درمیانی کڑی بھی مانتے ہیں۔ اس طرح اُردو تنقید کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے یعنی تذکروں کی تنقید، محمد حسین آزاد کی تنقید، حالی اور حالی کے بعد کی تنقید نگاری۔

تذکروں میں عام طور پر شعرا کا مختصر سا تعارف مختصر سا انتخاب اور آخر میں تذکرہ نگار کی رائے شامل ہوتی تھی، وہ بھی کسی ٹھوس ثبوت یا اصول کی بنیاد پر نہیں بلکہ خالص ذاتی پسند یا ناپسند کے طور پر، لیکن آزاد نے پہلی دفعہ اس روش کو ترک کرتے ہوئے اپنی کتاب میں نئے گوشوں کو اُجاگر کیا۔ انھوں نے اپنی کتاب کو پانچ ادوار میں تقسیم کرتے ہوئے شعرا کے کلام و کوائف کا جائزہ پیش کیا۔ شعر و شاعری کے اصولوں پر بحث کے ساتھ ساتھ انشا پردازی اور زبان و بیان پر بھی خاص توجہ دی۔ اس طرح اُردو ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ہوا۔

محمد حسین آزاد کی تصنیف 'آبِ حیات' کے بعد اُردو ادب میں باقاعدہ طور پر تنقید کی شروعات حالی کے 'مقدمہ شعر و شاعری' سے مانی گئی ہے۔ اس کے علاوہ حالی کی دوسری تصانیف حیاتِ جاوید، یادگارِ غالب اور حیاتِ سعدی جو کہ سوانح عمریوں کے طور پر مشہور ہیں، ان میں بھی جا بجا تنقیدی اشارے ملتے ہیں۔ ساتھ ہی حالی کے گراں قدر مضامین اور تبصرے بھی موجود ہیں جو مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے

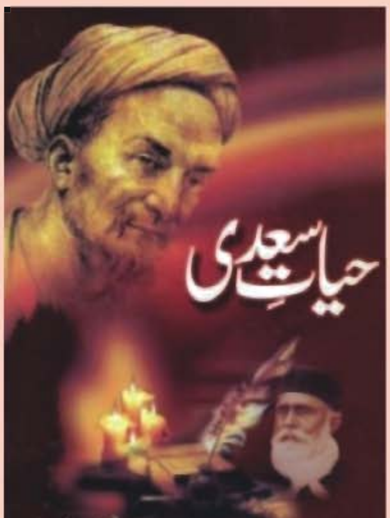

اور بعد میں انجمن ترقی اُردو نے ان کو 'مقالاتِ حالی' کے نام سے دو حصوں میں شائع کیا۔ ان مقالات میں بھی ان کا تنقیدی شعور جھلکتا ہے اور عملی تنقید کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔

'یادگارِ غالب' مرزا اسد اللہ خاں غالب کی سوانح عمری ہے جس میں ان کی زندگی کے اہم اور دلچسپ واقعات کو قلمبند کیا گیا ہے اور ساتھ ہی اس کتاب کے دوسرے حصے میں اُن کے کلام پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ حالی اپنے تنقیدی زاویہ نظر کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''مرزا نے ریختہ میں جو روش اختیار کی تھی ظاہر ہے کہ وہ کسی طرح مقبولِ خاص و عام نہیں ہوسکتی تھی۔ لوگ عموماً میر، سودا، میر حسن، جرأت اور انشا وغیرہ کا سیدھا سادھا اور صاف کلام سننے کے عادی تھے۔ جو محاورے روز مرہ کی بول چال اور بات چیت میں برتے جاتے تھے انھیں کو جب اہلِ زبان وزن کے سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھتے تھے تو ان کو زیادہ لذت آتی تھی اور زیادہ لطف حاصل ہوتا تھا۔ شعر کی بڑی خوبی یہی سمجھی جاتی ہے کہ ادھر قائل کے منھ سے نکلا اور اُدھر سامع کے دل میں اُتر گیا، مگر مرزا کے ابتدائی ریختے میں یہ بات بالکل نہ تھی جیسے خیالات اجنبی تھے ویسی ہی زبان غیر مانوس تھی۔ فارسی زبان کے مصادر، فارسی کے حروف ربط اور توابع فعل جو کہ فارسی کی خصوصیات میں سے ہیں، ان کو مرزا اُردو میں عموماً استعمال کرتے تھے اکثر اشعار ایسے ہوتے تھے کہ اگر ان میں ایک لفظ بدل دیا جائے تو سارا شعر فارسی زبان کا ہوجائے۔''

حالی نے یہ کتاب تقریباً 1897 میں لکھی۔ اس کتاب میں کلامِ غالب پر تبصرہ کرتے ہوئے حالی نے لگ بھگ ان ہی اصولوں سے استفادہ کیا ہے جو 'مقدمہ شعر و شاعری' میں بیان کیے گئے ہیں۔ حالانکہ یہاں پر حالی کا مقصد خالص تنقیدی مطالعہ نہیں ہے بلکہ یہاں انھوں نے صرف انتخاب اور پھر اس کی تشریح کو ہی توجہ کا مرکز بنایا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں لیکن موجودہ تنقیدی قوانین کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ کسی فن پارے کی تفہیم و تشریح کرنا بھی تنقید ہی کی ایک قسم ہے یعنی 'یادگارِ غالب' کی اہمیت نہ صرف سوانح عمری کے طور پر ہے بلکہ یہ ایک تنقیدی تصنیف بھی ہے جس میں جا بجا تنقیدی اشارے ملتے ہیں۔

بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق لکھتے ہیں:

''یہ حالی کا طفیل ہے کہ ہم غالب کی سچّی قدر کرواتے ہیں، اس کی یاد میں جلسے ترتیب دیتے، اس کے کلام پر مضامین لکھتے، اس کے دیوان کی شرحیں چھاپتے ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا، یادگار نے غالب کو زندہ کر دیا ہے۔''

'حیاتِ سعدی' (1882) میں بھی شیخ سعدی کے کوائف کے ساتھ ساتھ اُن کے کلام پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کو تنقیدی نقطۂ نظر سے کافی اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس سے پہلے فارسی شعرا عام طور پر زبان و بیان یا لفظی خوبیوں پر ہی زور دیتے تھے لیکن اُس کے معنی یا خیال کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ حالی نے اس سمت میں نیا اضافہ کیا۔ انھوں نے شیخ سعدی کے کلام کی خوبیوں کو واضح کرنے کے لیے ان کا موازنہ دوسرے شعرا سے کیا۔ سعدی کا کلام روز مرۂ زندگی کا پیغام ہے، حق کی آواز ہے، زندگی کے مسائل کی تلاش ہے، سماج میں ہو رہے ظلم و ستم کے خلاف ایک نعرۂ حق ہے۔ غرض انھوں نے عام انسانی زندگی کی حقیقت کو بے نقاب کیا ہے۔ ان خصائص کی بنیاد پر حالی نے سعدی کو مدلل طور پر ایک عظیم شاعر تسلیم کیا ہے۔

'حیاتِ جاوید' (1901 میں شائع ہوئی ایسی کتاب

ہے جو ایک سوانح حیات کے ساتھ ساتھ حالی کے تنقیدی ذہن کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔ حالی نے اس کتاب کو بھی دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصّے میں انھوں نے سر سیّد احمد خاں کے حالاتِ زندگی کو مفصل انداز میں بیان کیا ہے اور دوسرے حصّے میں ان کی خدمات، تالیفات اور طرزِ تحریر کا تنقیدی محاسبہ کیا ہے حالانکہ اس کتاب کو لکھتے وقت حالی کا زیادہ دھیان ان کی قومی و ملّی خدمات کو اجاگر کرنے پر ہی رہا لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ اظہارِ خیال ان کے ادبی پہلوؤں پر بھی ملتا ہے۔ جس کو ہم تنقید کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔

ان مستند کتابوں کے علاوہ حالی نے مختلف عنوانات پر تبصرے اور تقریظیں بھی لکھیں جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہیں اور بعد میں ان کو انجمن ترقی اُردو نے 'مقالاتِ حالی' کے نام سے دو حصّوں میں شائع کیا۔ ان مقالات میں سر سیّد احمد خاں اور اُن کے کام، انبیا، تدبیر، مزاح، کیا مسلمان ترقی کر سکتے ہیں، اخبار نویسی اور اس کے فرائض، دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے، حسب اور نسب، مسلمانوں میں عملی قوت کیوں نہیں رہی، زبان گویا، سر سیّد کی مذہبی خدمات، قرآن مجید میں اب نئی تفسیر کی گنجائش باقی ہے یا نہیں، قومی جلسوں میں نظموں کی بھرمار، دیوان حافظ کی فائلیں وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان تبصروں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ حالی نے اِن میں صرف تعریفی انداز ہی نہیں اپنایا بلکہ جو چیز ان کو ناگوار گزری ہے اُس کی طرف بھی جرأت مندی سے اشارہ کیا ہے جو تنقید کی طرف مثبت قدم تھا۔ حالی لکھتے ہیں:

''مصنف نے وہ فرائض جن کو زمانے کا مذاق نئی تصنیف میں اس طرح ڈھونڈتا ہے جس طرح پیاسا پانی کو، کس حد اور کس درجہ تک ادا کیے ہیں۔ پس جب کسی کتاب پر ریویو لکھ رہے ہوں تو ہم کو یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ مصنف کی رائے جزئیاتِ مسائل میں فی نفسہٖ کیسی ہے کیونکہ اس کا فیصلہ کرنا پبلک کا کام ہے نہ کہ ریویو لکھنے والے کا۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ کتاب کا عنوان کیا ہے؟ ترتیب کیسی ہے؟ طریق استدلال مذاق وقت کے موافق ہونا چاہیے یا جو مصنف نے اپنے ذہن میں ملحوظ رکھا ہے وہاں سے حاصل ہو سکتا ہے یا نہیں۔''

اِن تصانیف کے علاوہ جس کتاب نے حالی کو ایک معتبر اور مستند نقاد کے طور پہچنوایا وہ 'مقدمہ شعر و شاعری' کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ حالی کا یہ مقدمہ 1893 ایک منفرد کتاب ہے کیونکہ اسی کے ذریعے باقاعدہ اُردو تنقید کی شروعات ہوئی اور جس کے اعلیٰ اور مستند ہونے کا اعتراف ہمارے بیشتر ادیبوں اور نقادوں نے کیا، جس کا مختصر اجمال یوں ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق لکھتے ہیں:

''یہ صرف ان کے دیوان کا مقدمہ نہیں بلکہ اُردو فن تنقید کا پہلا مقدمہ ہے۔''

پروفیسر محمود شیرانی نے اس کی تعریف و توضیح ان الفاظ میں کی ہے:

''حالی نے ایک زبردست مقدمہ شعر و شاعری پر لکھا جس سے شاعری کے متعلق ان کے صحیح مذاق، تعمق نظر اور وسعت معلومات کا پتہ چلتا ہے۔''

عبدالرحمٰن بجنوری لکھتے ہیں:

''(دیوان حالی) کا مقدمہ فن شاعری اور اُردو شاعری پر زبان اُردو میں سب سے اعلیٰ پایہ کی تنقید ہے۔''

مہدی افادی اُن کے مقدمے کو لافانی قرار دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''میرے ذہن میں حالی کی عظمت 'دیوانِ حالی' کے اُس حصّے سے ہے جو مقدمہ شاعری کی حیثیت سے لکھا گیا

ہے۔ وہ 228 صفحے قطعاً غیر فانی ہیں اور غالباً آج تک کسی نے اس موضوع پر چند سطریں بھی اس طرح نہیں لکھیں۔''

ڈاکٹر عبادت بریلوی کا انداز کچھ یوں ہے:

''حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں سب سے پہلے شعر و ادب، اس کی اہمیت، ضرورت اور ان میں تبدیلی کے متعلق اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔

یہ بحث فلسفیانہ انداز میں کی گئی ہے اور حالی نے اپنے خیالات کے اظہار میں مدلّل پیرایۂ بیان اور خاصی تفصیل سے کام لیا ہے اور ان ہی خصوصیات نے مقدمہ شعر و شاعری کو تنقید کی ایک مستقل کتاب بنا دیا ہے۔''

مندرجہ بالا نگارشات سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ حالی کے مقدمے کی عظمت و اہمیت کا اعتراف بلاشبہ ہمارے بیشتر ادیبوں اور ناقدین نے کیا ہے۔ حالی ایسے پہلے نقاد ہیں جنھوں نے اپنے تنقیدی نظریات کو ایک منظم اور مربوط شکل میں پیش کیا ہے۔ حالی نے روایتی انداز سے ہٹ کر عملی تنقید کے نمونے پیش کیے۔ انھوں نے اپنے ماحول، حالات اور واقعات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ادب کا جائزہ لیا۔ 'مقدمہ شعر و شاعری' کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے شعر کے لیے بامقصد اور تعمیری ہونا ضروری قرار دیا۔ آل احمد سرور نے ایک جگہ لکھا ہے کہ حالی سے پہلے ہماری شاعری دل والوں کی شاعری تھی، حالی نے 'مقدمہ شعر و شاعری' کے ذریعے اُسے ایک ذہن دیا اور ہماری بیسویں صدی کی تنقید اُن کی اسی ذہنی قیادت کے زیرِ اثر چلتی نظر آتی ہے۔ حالی کی خاصیت یہ ہے کہ انھوں نے فنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ شعر کی اہمیت اور ماہیت کو بھی واضح کیا۔ اُن کے نزدیک شاعری ایک کارآمد تحفہ ہے جو خدا نے انسان کو دیا۔ اس سے بڑے بڑے کام لیے جا سکتے ہیں۔ حالی کے نزدیک شاعر ایک بہت بڑی شخصیت کا مالک ہوتا ہے جس کی ہر دور میں پزیرائی ہوئی ہے۔ اس کے لیے حالی نے مشرق سے مغرب تک کے شاعروں کی مثالیں دی ہیں۔

حالی کے 'مقدمہ شعر و شاعری' کی بڑی خاصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی بات کو پختگی دینے کے لیے جگہ جگہ مثالیں اور دلیلیں پیش کی ہیں۔ اس سے مقصود مختلف شعری اسالیب کی وضاحت اور فن شاعری کی باریکیوں کو اُجاگر کرنا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے نہ صرف مشرقی شعریات سے استفادہ کیا ہے بلکہ جا بجا مغربی نظریات کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ حالی کے نزدیک شعر کا اثر محض عقل کے ذریعے نہیں بلکہ ذہن و ادراک کی بلندی کے ذریعے ہی شعر سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے اور ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ شاعری سوسائٹی یا ماحول کے تابع ہوتی ہے، یہاں پر اُن کے نظریات میں تھوڑا الجھاؤ بھی دکھائی دیتا ہے۔

حالی کے نزدیک سب سے ضروری اور مقدم چیز جو ایک شاعر کو غیر شاعر سے ممیّز کرتی ہے وہ ہے تخیّل یا قوت متخیلہ۔ جس قدر کسی شاعر میں یہ قوت زیادہ یا کم ہوگی اُسی قدر اس کی شاعری اعلیٰ یا ادنیٰ ہوگی یعنی یہ شاعری کی جان ہے۔ تخیّل کی تعریف کرتے ہوئے حالی لکھتے ہیں:

''یہ وہ طاقت ہے جو شاعر کو وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد کرتی ہے اور ماضی و مستقبل اس کے لیے زمانہ حال میں کھینچ لاتی ہے۔ وہ آدم اور جنت کی سرگزشت اور حشر و نشر کا بیان اس طرح کرتا ہے کہ گویا اس نے تمام واقعات اپنی آنکھ سے دیکھے ہوں۔''

حالی کے مطابق اچھی شاعری کے لیے دوسری اہم شرط

ہے مطالعۂ کائنات ہے یعنی شاعر کو اپنے موجودہ ماحول کے ساتھ ساتھ مختلف افکار و نظریات پر غور کرتے رہنا چاہیے تاکہ اُسے زندگی کا مکمل فہم و ادراک حاصل ہو سکے اور خاص طور پر وہ انسانی نفسیات کے پیچ و خم کو سمجھنے کے قابل ہو سکے، لکھتے ہیں:

''شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ نسخۂ کائنات اور اس میں سے خاص کر نسخۂ فطرتِ انسانی کا 'مطالعہ' نہایت غور سے کیا جائے۔ انسان کی مختلف حالتیں جو زندگی میں اس کو پیش آتی ہیں ان کو تعمق کی نگاہ سے دیکھنا، جو امور مشاہدہ میں آئیں اُن کو ترتیب دینے کی عادت ڈالنی، کائنات میں گہری نظر سے وہ خواص اور کیفیات مشاہدہ کرے جو عام آنکھوں سے مخفی ہوں۔''

شاعر اور غیر شاعر میں امتیاز کرنے والی خصوصیات میں تفحصِ الفاظ ایک اہم خصوصیت ہے۔ حالی کے نزدیک شاعر کو شعر کہتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ اپنے شعروں میں مناسب ترین الفاظ استعمال کرے تاکہ جو بات وہ کہنا چاہتا ہے وہ باآسانی سامع تک پہنچ جائے۔ تفحص الفاظ کے متعلق حالی لکھتے ہیں:

''چند امور ہیں جن کو فکرِ شعر کے وقت ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اوّل خیالات کو صبر و تحمل کے ساتھ الفاظ کا لباس پہنانا پھر اُن کو جانچنا اور تولنا اور ادائے معنی کے لحاظ سے ان میں جو قصور رہ جائے اس کو رفع کرنا۔ الفاظ کو ایسی ترتیب سے منتظم کرنا کہ صورۃً اگرچہ نثر سے متمیز ہوں مگر معنے اسی قدر ادا کرے جیسے کہ نثر میں ادا ہو سکتے ہیں۔ شاعر بشرطیکہ شاعر ہو اوّل تو وہ ان باتوں کا لحاظ وقت پر ضرور کرتا ہے اور اگر کسی وجہ سے بالفعل اس کو زیادہ غور کرنے کا موقع نہیں ملتا تو پھر جب کبھی وہ اپنے کلام کو اطمینان کے وقت دیکھتا ہے اس کو ضرور کانٹ چھانٹ کرنی پڑتی ہے۔''

حالی تفحص الفاظ سے بحث کرتے ہوئے آمد اور آورد کے مسئلے کو بھی بار بار اُجاگر کرتے ہیں اور الفاظ کی دشواریوں سے بچنے کے لیے آمد کی بجائے آورد کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس کا سیدھا مطلب یہ ہوا کہ حالی کے مطابق شعر میں دو چیزیں ہوتی ہیں ایک خیال اور دوسرے الفاظ۔ اُن کے مطابق شعر کے بے ساختہ پن اور برجستگی کا تعلق آمد سے نہیں بلکہ آورد سے ہے یعنی جتنا اُس کے الفاظ و معنی پر دھیان کیا جائے گا اس میں بے ساختگی بڑھتی جائے گی۔ عربی کے شاعروں نے بھی آمد پر آورد کو ترجیح دی ہے لیکن ہمارے یہاں کے جدید ادب میں نظریات بدل چکے ہیں۔ اب آمد کو ہی شاعر کی بڑائی کا اعلان تصور کیا جاتا ہے۔

حالی نے مقدمے میں شعر کے لیے ضروری شرائط پر بحث کرنے کے ساتھ ساتھ شعر میں پائی جانے والی خوبیوں سے بھی روشناس کرانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ حالی کے مطابق شعر میں تین خوبیوں کا ہونا ضروری ہے۔ ان خوبیوں کے بغیر شاعری درجہ کمال تک نہیں پہنچ سکتی۔

1. سادگی 2. اصلیت 3. جوش

حالی کے مطابق شعر کا خیال کتنا ہی بلند و برتر کیوں نہ ہو اگر اس کے الفاظ، اُس کی زبان اور اس کے محاورے روز مرّہ کی بول چال کے قریب نہیں ہوں گے تو شعر غیر معمولی ثابت نہیں ہو سکتا، مطلب یہ ہوا کہ شعر عام بول چال سے بعید نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ایسا ہو گا تو اس کی سادگی مجروح ہو جائے گی۔ یہاں ایک چیز اور واضح رہے کہ حالی کے نزدیک سادگی کا مطلب صرف الفاظ کی سادگی نہیں بلکہ خیالات بھی اتنے نازک اور دقیق نہیں ہونے چاہیے کہ عام ذہنوں میں نہ سما سکیں یعنی اسلوب بیان کے ساتھ ساتھ خیالات بھی سچّے اور سلجھے ہوئے ہونے چاہیے کیونکہ غیر ضروری مبالغہ بھی شاعری کو غیر حقیقی اور مضر بنا دیتا ہے۔

''اعلیٰ تنقید کی ابتدا وہاں سے ہوتی ہے جہاں سے ادبی اقدار کی تنقید شروع ہوتی ہے اور یہ شرف حالی ہی کو پہنچتا ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے ہمارے تنقیدی ادب میں ادب اور سوسائٹی کے رشتے کو زیادہ واضح طور پر معلوم کرنے کی کوشش کی... اب میں حالی کو اُردو کا پہلا نظریاتی نقّاد کہوں تو شاید اس کے قبول کرنے میں کوئی عذر نہ ہو گا۔''

حالی کے مطابق شعر کی دوسری خوبی یہ ہے کہ شعر اصلیت پر مبنی ہونا چاہیے۔ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہر شعر کا مضمون حقیقت میں نفس الامری میں موجود ہو بلکہ یہ کسی نہ کسی طرح فی الواقع موجود ہو۔ اسی طرح شعر کی تیسری خاصیت یہ ہے کہ وہ جوش سے بھرا ہوا ہو یعنی شعر میں اثر انداز ہونے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔ شعر میں یہ خوبی اُسی وقت آتی ہے جب مضمون کو ایسے بے ساختہ اور مؤثر پیرایہ میں پیش کیا جائے جس سے پتہ چلے کہ شاعر نے ارادہ سے مضمون نہیں باندھا بلکہ خود مضمون نے شاعر کو ایسا کرنے پر مجبور کیا ہے۔ ملٹن نے بھی شعر کی تعریف اسی طرح کے الفاظ میں کی تھی۔ اُس کے مطابق شعر سادہ ہو، جوش سے بھرا ہوا اور اصلیت پر مبنی ہو۔ اس طرح یہاں پر حالی مغربی دانشوروں کے خیالات سے استفادہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

ان خاصیتوں کے علاوہ حالی نے شاعری کی اساس اور نقطۂ نظر پر بھی تفصیل سے گفتگو کی ہے جو اُردو ادب میں ایک نیا اضافہ تھا۔ ان کے نظریے کے مطابق شاعری سوسائٹی کے تابع ہوتی ہے۔ مطلب ادب اور سماج میں گہرا رشتہ ہے۔ اُن کا یہ بھی ماننا ہے کہ ہر خیال مادے سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی بنیاد پر کبھی کبھی لوگ ان کو ترقی پسند نقاد کے طور پر بھی لے لیتے ہیں کیونکہ حالی ایک مذہبی روایت کے علمبردار تھے، اس لیے انھوں نے اخلاقی، سماجی اور مذہبی اقدار کو اپنے نظامِ تنقید میں ایک اہم جگہ دی۔ حالی نے یہ بھی کہا تھا کہ شاعری ہمارے جذبات برانگیختہ کرتی ہے اُس پر حاوی ہو جاتی ہے۔ اس لیے شاعری میں ایسے جذبات و خیالات کو پیش نہیں کرنا چاہیے جن سے سوسائٹی میں بگاڑ پیدا ہو۔ اس طرح اُن کی تنقید ادب برائے ادب کی جگہ ادب برائے زندگی کا پیغام دیتی ہے۔ اُن کے مطابق شاعری کے ذریعے سے زندگی میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ اس لیے شاعر کو نیچرل انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہیے۔ شاعری کو زیادہ پابندیوں میں نہیں رکھنا چاہیے۔ انھوں نے ہی جدید اُردو شاعری کی بنیاد رکھی۔ حالی نے اپنے مقدمے میں اصنافِ سخن میں سے غزل، قصیدہ اور مثنوی کو خاص اہمیت دی ہے۔ حالی کی مجموعی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے پروفیسر ممتاز حسین لکھتے ہیں:

''اعلیٰ تنقید کی ابتدا وہاں سے ہوتی ہے جہاں سے ادبی اقدار کی تنقید شروع ہوتی ہے اور یہ شرف حالی ہی کو پہنچتا ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے ہمارے تنقیدی ادب میں ادب اور سوسائٹی کے رشتے کو زیادہ واضح طور پر معلوم کرنے کی کوشش کی ...اب میں حالی کو اُردو کا پہلا نظریاتی نقاد کہوں تو شاید اس کے قبول کرنے میں کوئی عذر نہ ہو گا۔''

اس طرح مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ حالی نے روایتی انداز کو بدلتے ہوئے اُس میں کچھ نئے نظریات کا اضافہ کیا اور ادب کے مختلف پہلوؤں کی طرف توجہ دلوائی جن سے اب تک بے اعتنائی برتی جا رہی تھی۔ حالی کے ان نظریات سے اُردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا حالانکہ ہمارے بہت سے نقاد حالی کے نظریات سے اختلاف رائے بھی رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود ان کو پہلا اور مستند نقاد بھی مانتے ہیں۔ اس طرح پنجاب کو یہ شرف حاصل ہے کہ جہاں اُردو زبان کی شروعات پنجاب میں ہوئی وہیں اس کے تحفظ کے لیے بھی پنجاب والوں نے ہی پہل کی۔ جن میں حالی کا نام سرِ فہرست ہے۔

■

Dr. Nadeem Ahmed 'Nadeem', Lecturer in Urdu, Northern Regional Language Centre, Punjabi University Campus, Patiala - 147002

حالی کی تنقید کا اخلاقی پہلو

آفتاب احمد آفاقی

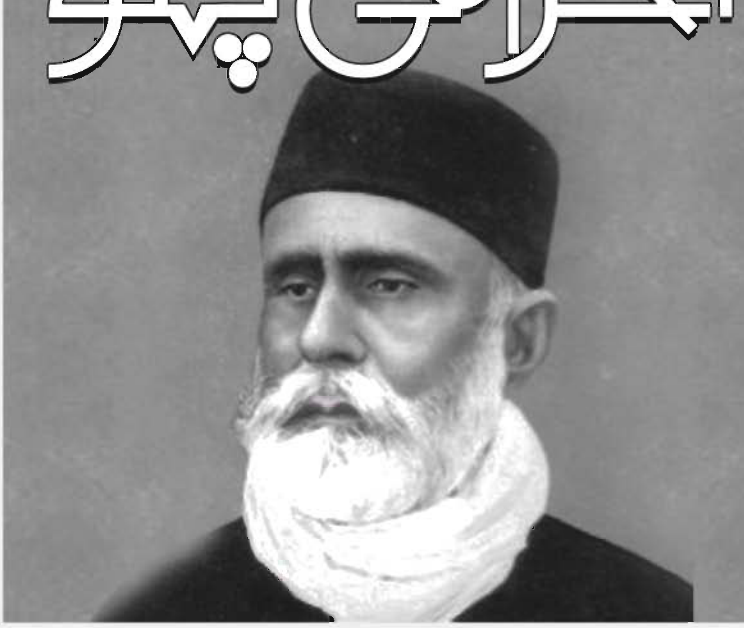

اردو شعر و ادب کی تاریخ میں خواجہ الطاف حسین حالی اپنی مختلف الجہات شخصیت کی وجہ سے اپنے معاصرین میں ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ انھوں نے قوم کی روحانی، ادبی اور اخلاقی اصلاح میں جو نمایاں کردار ادا کیا اس کی حیثیت ایک علاحدہ باب کی ہے۔ ادبی سطح پر حالی نے پرانی شاعری کے نقائص اور جدید شاعری کے اصول، عقل، سمجھ اور قابلیت سے سمجھائے اور شاعرانہ تنقید کا ایسا دستور العمل مرتب کیا جس کا جواب اردو تو کیا دوسری ہندوستانی زبانوں میں بھی مشکل سے ملے گا۔ وہ جدید اردو شاعری کے بانی اور سب سے بڑے محسن ہیں لیکن حالی کی بڑائی یہ ہے کہ اس ضمن میں ان کی تحریریں دیکھیں تو یہی خیال ہوتا ہے کہ جدید شاعری کے بانی فقط شمس العلما محمد حسین آزاد تھے۔

اردو شاعری کی کایا پلٹ کے علاوہ مولانا نے اردو نثر میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ اردو زبان میں اصنافی اور عملی تنقید کی بنیاد انھوں نے ڈالی۔ سیرت نگاری کا نیا رنگ سب سے پہلے انھوں نے اختیار کیا۔ حیاتِ سعدی، حیاتِ جاوید اور اردو کی مقبول ترین سوانح عمری یادگارِ غالب انھی کے قلم سے نکلیں۔ ان سب باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اردو ادب کی حیاتِ تازہ میں جتنی کوششیں انھوں نے کی ہیں شاید ہی کسی نے کی ہو۔ لیکن بہ قول شیخ محمد اکرام ”جب اردو ادب کے محسنوں کا ذکر آتا ہے تو حالی چپکے سے سرسید کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں کہ فادر آف لٹریچر تو وہ ہیں۔ قومی اصلاح کے معاملے میں، تو خیال ہوتا ہے کہ قوم کی اصلاح فقط سرسید نے کی اور قوم کی بیداری میں علی گڑھ کالج، تہذیب الاخلاق اور ایجوکیشنل کانفرنس کے علاوہ کسی اور چیز کو دخل نہیں۔“

حالی کی تنقید نگاری پر اختلاف کی پوری گنجائش ہے لیکن ان کے پہلے باضابطہ نقاد ہونے میں کسی کو اعتراض نہیں۔ حالی نے پہلی بار شاعری کی حقیقت اور ماہیت کے ضمن میں اپنے خیالات منضبط طور پر پیش کیے اور شعر و ادب کے سماجی اور تہذیبی رشتوں کو واضح کیا، اس کے پہلو بہ پہلو ادبی تخلیق کے نفسی اور ذہنی عمل اور اس کی لسانی اور فنی بنیاد کی نشاندہی کی، جس کے بغیر ادبی تنقید کے فن کا کوئی تصور قائم نہیں کیا جا سکتا۔ مقدمہ شعر و شاعری میں پہلی مرتبہ ادبی مطالعے کے ان پہلوؤں کی سائنٹفک انداز میں توضیح کی گئی اور شعر و ادب کی جانچ پرکھ کے باقاعدہ اصول وضع کیے گئے اور یہی وجہ ہے کہ اسے اردو میں تنقید کی اولین کوشش اور پہلی 'کتاب الاصول' قرار دیا جاتا ہے۔

مقدمہ شعر و شاعری میں حالی نے ادب کے افادی پہلو کو مقدم رکھا ہے اور ان کا اصل رجحان حقیقت نگاری کی طرف ہے اور وہ اس بنیاد پر ادبی تجربات میں اصلیت بہ الفاظ دیگر واقعیت کے اثر کو بنیادی اہمیت دیتے اور نیچرل شاعری کا تصور پیش کر کے اردو شاعری کو ایک نیا موڑ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ آلِ احمد سرور نے حالی کے مقدمے کو ان کی شاعری کے بنیادی افکار کی تشریح اور تنظیم قرار دیا ہے جو بڑی حد تک درست بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ مقدمہ شعر و شاعری اولاً دیوانِ حالی کے مقدمے کے طور پر شائع ہوا تھا اور پھر بعد میں حالی کی ایک مستقل تصنیف کی حیثیت سے منظرِ عام پر آیا۔ اس لحاظ سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ حالی اپنی شاعری میں جن اصولوں پر کاربند رہے اور انھوں نے جن اصلاحی اور اخلاقی محرکات کے تحت نظمیں اور غزلیں لکھیں ان کی تنقید نگاری، اس کا پرتو کہی جائے گی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ نیچرل نظموں نے اردو شاعری میں ایک نئی روایت اور رجحان کا آغاز کیا، ان کے مقدمے نے جس میں نیچرل شاعری پر بڑی فکر انگیز بحث کی گئی ہے اس جہت سے اردو تنقید میں ایک قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔

حالی کی تنقید نگاری کا یہ امتیازی وصف ہے کہ انھوں نے اپنے نظریۂ تنقید کی تشکیل مشرقی ادبی روایات کے ساتھ مغربی ادبی روایات سے بھی استفادہ کیا۔ ان کا مبلغِ علم خاصا وسیع تھا۔ وہ عربی، فارسی اور اردو پر دسترس رکھتے تھے ساتھ ہی انگریزی تنقید سے بھی ایک حد تک واقف تھے جس کی بنا پر وہ زیادہ صحیح ادبی نتائج تک پہنچ سکے اور اپنی کئی غلط فہمیوں کے باوجود ان کے خیالات اور آرا کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ان پر آج بھی بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری ہے۔ حالی کے فکر و شعور پر دو واضح اثرات کارفرما نظر آتے ہیں، ایک طرف سرسید کی شخصیت اور ان کی اصلاحی تحریک سے متاثر ہوئے دوسری طرف گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب کی ملازمت کے دوران جب انھیں کرنل ہالرائیڈ اور کچھ دوسرے انگریز دوستوں کی صحبت نصیب ہوئی اور انگریزی کتابوں کے اردو ترجمے پر نظر ثانی کے کام پر مامور ہوئے۔ اس طرح انھیں انگریزی ادبیات سے کسی قدر واقفیت حاصل کرنے اور اس سے بالواسطہ طور پر اثر پذیر ہونے کا موقع ملا۔ سرسید کی قربت اور علی گڑھ تحریک ہی کا اثر ہے کہ حالی کے تصنیفی کارناموں میں اصلاحی پہلو غالب ہے اور ان کی اہم ترین تصنیف 'مقدمہ شعر و شاعری' میں بھی اصلاحی رجحان ہی نمایاں ہے۔

مقدمہ شعر و شاعری میں جن تصورات سے بحث کی گئی وہ شعر کی ماہیت، منصب اور افادیت، شاعری اور سماج کے رشتے شعری اصناف کی اصلاح اور مطالعہ شعر میں زبان، اسلوب بیان اور لفظیات کی اہمیت جیسے موضوعات پر محیط ہے۔ جن پر بڑی خوبی اور صراحت کے ساتھ اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

حالی بنیادی طور پر شاعری اور سماج یا دوسرے لفظوں میں ادب اور زندگی کے رشتے پر روشنی ڈالتے اور اس کے اخلاقی اور اصلاحی پہلو کو اصل اہمیت دیتے ہیں۔ وہ شعری اظہار میں سادگی اور اصلیت پر بطورِ خاص توجہ دیتے ہیں اور اسے ایک با مقصد اور با معنیٰ عمل بنانا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے تحت نیچرل شاعری کو سچّی، فطری اور صحت مند شاعری کا ماڈل بنا کر پیش کرتے اور با قاعدہ مثالیں دے کر اس کا واضح روپ متعین کرتے ہیں۔ حالی کے نیچرل شاعری کے تصور کو ان کے اخلاقی اور اصلاحی رویے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا جس پر اصلاً ان کے ادبی اور تنقیدی نظریے کی دیوار کھڑی ہے۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کی حالی پہلے نقاد ہیں جنھوں نے اردو کی شعری اصناف، غزل، قصیدے اور مثنوی کی اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے فکری و فنی بنیادوں پر ان کا محاسبہ کیا۔ نیز بعض اصلاحی باتیں بھی پیش کیں۔ یہ مشورے ان کے نیچرل شاعری کے تصوّر ہی کو آگے بڑھاتے ہیں انھوں نے شاعری کو جس طرح جھوٹ اور مبالغے سے پاک رکھنے اور اس ضمن میں حقیقت اور راستی کے پہلو کو ملحوظ رکھنے پر زور دیا ہے وہ ان کے نیچرل شاعری کے تصوّر کا ہی فیضان ہے، جسے وہ لفظاً و معناً یعنی فطرت اور عادت کے موافق ہونے سے تعبیر کرتے ہیں، ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور اس کا اطلاق بہت کچھ اردو کی شعری اصناف پر ان کے تبصروں سے بھی ہوتا ہے جن میں ان کا اخلاقی اور اصلاحی جذبہ پوری شدت کے ساتھ نمایاں ہوا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو مقدمہ شعر و شاعری میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ان میں ایک متعین نقطۂ نظر کی کارفرمائی اور نظم و ترتیب کا احساس ہوتا ہے۔ جس کی مثال اس سے قبل نہیں ملتی اور یہی وجہ ہے کہ مقدمہ کو اردو میں فنِ تنقید پر پہلی باضابطہ کتاب تصور کیا جاتا ہے۔ جس میں کلیم الدین احمد کے الفاظ میں جزئیات سے قطع نظر کر کے شعر و شاعری کے بنیادی اصول سے بحث کی گئی ہے۔ یہاں حالی کے چند خیالات قابلِ توجہ ہیں:

"شاعری کوئی اکتسابی چیز نہیں ہے بلکہ بعض طبیعتوں میں اس کی استعداد خداداد ہوتی ہے۔ پس جو شخص اس عطیۂ الٰہی کو مقتضائے فطرت کے موافق کام میں لائے گا ممکن نہیں کہ سوسائٹی کو اس سے کچھ فائدہ نہ پہنچے۔"

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"شعر کی تاثیر سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ سامعین کو اکثر اس سے حزن یا نشاط یا جوش یا افسردگی یا کم یا زیادہ ضرور پیدا ہوتی ہے اور اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس سے کام لیا جائے تو وہ کہاں تک فائدہ پہنچا سکتا ہے ... یورپ میں۔ سوانگ اور نقالی نے اصلاح پا کر قوموں کو بے انتہا اخلاقی اور تمدنی فائدے پہنچائے ہیں۔۔ تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں کہ شعرا نے اپنی جادو بیانی سے لوگوں کے دلوں پر فتح نمایاں حاصل کی ہے۔۔۔ یورپ میں پولٹیکل مشکلات کے وقت قدیم پوئٹری کو قوم کی ترغیب و تحریص کا ایک زبردست آلہ سمجھتے رہے ہیں۔"

"شعر سے جس طرح نفسانی خوشیاں جذبات کو اشتعال ہوتی ہے، اس طرح روحانی خوشیاں بھی زندہ ہوتی ہیں اور انسان کی روحانی اور پاک خوشیوں کو اس کے اخلاق کے ساتھ ایسا صریح تعلق ہے جس کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ شعر اگر چہ از روئے انصاف اس کو علمِ اخلاق کا نائب مناب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں۔"

متذکرہ اقتباسات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حالی ادب کو افادیت کی میزان پر تولتے تھے اور اس باب میں ان کا نقطۂ نظر خالصتاً اصلاحی اور اخلاقی تھا۔ وہ لوگ جو ادب کو غیر ادبی معیاروں سے جانچنے کے قائل نہیں جنھیں ادب کو اخلاق کی عینک لگا کر دیکھنا گوارا نہیں حالی کے اس نقطۂ نظر پر

حالی بنیادی طور پر شاعری اور سماج یا دوسرے لفظوں میں ادب اور زندگی کے رشتے پر روشنی ڈالتے اور اس کے اخلاقی اور اصلاحی پہلو کو اصل اہمیت دیتے ہیں۔ وہ شعری اظہار میں سادگی اور اصلیت پر بطورِ خاص توجہ دیتے ہیں اور اسے ایک با مقصد اور با معنی عمل بنانا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے تحت نیچرل شاعری کو سچَی، فطری اور صحت مند شاعری کا ماڈل بنا کر پیش کرتے اور باقاعدہ مثالیں دے کر اس کا واضح روپ متعین کرتے ہیں۔

اعتراض کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ادب میں سماج، سیاست اور اخلاق کی بحث چھیڑ کر حالی نے اردو تنقید کی پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھ دی۔ اردو میں ناقدین کا ایک ایسا گروہ بھی پیدا ہوا جو ادب اور صحافت میں فرق کرنے سے قاصر ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کا ایسا ہی خیال ہے۔ کلیم الدین احمد جنھوں نے حالی کے ادبی معروضات کو غلط ثابت کرنے پر پورا زور قلم صرف کر دیا ہے ادب میں اخلاق کی بحث اٹھانا بے معنی سمجھتے ہیں اور اسے شعر و ادب کی ماہیت سے حالی کی ناواقفیت تصوّر کرتے ہیں۔

اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ حالی نے جو باتیں لکھیں ہیں ان میں کوئی غلطی نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بعض مقامات پر ان سے غلطیاں سرزد ہوئی ہیں مثلاً ملٹن کے حوالے سے شعر کے اساسی تصورات کی توضیح کے ضمن میں جو passionate sensuous, simple کا ترجمہ (سادگی ،اصلیت اور جوش) کیا ہے اور اسے جن معنوں میں لیا ہے اس سے ان کی غلط فہمی عیاں ہو جاتی ہے۔ اوّل تو sensuous کا ترجمہ اصلیت درست نہیں۔ دوم یہ کہ اس ضمن میں جس یوروپین نقاد کالرج کا حوالہ دیا ہے اس نے بھی من مانے ڈھنگ سے اس کی توضیح پیش کی ہے، جس پر حالی نے اعتبار کیا۔ بہ الفاظ دیگر یہاں حالی کے مغالطے کو دخل ہے ان کی نیک نیتی پر شک کی گنجائش نہیں۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ حالی نے ان الفاظ سے جو مفاہیم اخذ کیے ہیں وہی آج زیادہ معتبر سمجھے جاتے ہیں اور ان کے بنیادی تنقیدی افکار کا حکم رکھتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی کے ضمن میں ہمارے ناقدین بڑے جارح واقع ہوئے ہیں۔ کلیم الدین احمد، احسن فاروقی، وحید قریشی وغیرہ ان میں پیش پیش رہے ہیں۔ لیکن آل احمد سرور اور وارث علوی جیسے معتبر ناقدین کی بھی کمی نہیں جنھوں نے بڑا ہی سنجیدہ، مثبت اور متوازن رویہ اختیار کرتے ہوئے حالی کی ادبی قدر و قیمت متعین کی ہے۔ آلِ احمد سرور کے نزدیک حالی کے ذہن میں اخلاق کا محدود تصوّر نہیں، مجموعی خیر کا تصور ہے اور شاعری کسی محدود، رسمی، اور وقتی اخلاق سے بلند ہے مگر بالآخر اخلاقی ہوتی ہے جس کا احساس حالی رکھتے تھے زیادہ صحیح اور قابلِ قبول معلوم ہوتا ہے۔

وارث علوی کے نزدیک نفاست، شائستگی اور مہذب جیسے اعلیٰ اقدار حالی کی شخصیت کا بنیادی وصف ہیں۔ علوی تنقید کو دریافت معنی، انکشاف اور جہانِ فکر کی سیاحی کا عمل تسلیم کرتے ہیں اور مقدمہ شعر و شاعری کو شائستہ متجسس ذہن کی سیاحت اور ادب کی دستاویز قرار دیتے ہیں۔ میں اپنی بات وارث علوی کے ان خیالات پر ختم کرتا ہوں جن کی بنیاد پر حالی کی شخصیت اور تنقیدی اقدار مترشح ہوتے ہیں اور جن کی بنیاد پر آج بھی حالی کی اہمیت مسلّم کہی جائے گی۔

"حالی کو صرف ادب اور شاعری میں ہی دلچسپی نہیں تھی۔ انھیں اپنی قوم، اپنے سماج، اپنی تاریخ اپنی روایت اور اپنی تہذیبی قدروں میں جو دلچسپی تھی اس کی آئینہ داری ان کی شاعری اور ان کی مختلف تصانیف کرتی ہیں۔ یہ عرب و عجم و ہند کی صدیوں کی تہذیبی اور تمدنی روایتیں تھیں۔ جنھوں نے مل جل کر حالی کے ذہن کی تربیت کی تھی۔ تاریخی مجبوریوں کی بنا پر یہ ذہن مغرب کے تہذیبی سرچشموں سے بہت سیراب نہیں ہو سکا۔ لیکن ان کے سخت سے سخت نکتہ چیں بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مغربی ادب کے اپنے محدود علم سے حالی نے جو فائدہ اٹھایا اور اس سے جو کام نکالے اس کا عشرِ عشیر بھی ان لوگوں سے نہ بن پڑا، جو حالی سے زیادہ مغربی ادب سے واقف تھے اور جنھیں حالی سے کہیں زیادہ اس ادب سے فیض یاب ہونے کے مواقع حاصل تھے۔"

■

Aftab Ahmad Afaqi., Dept of Urdu, BHU, Varanasi - 221005 (UP)

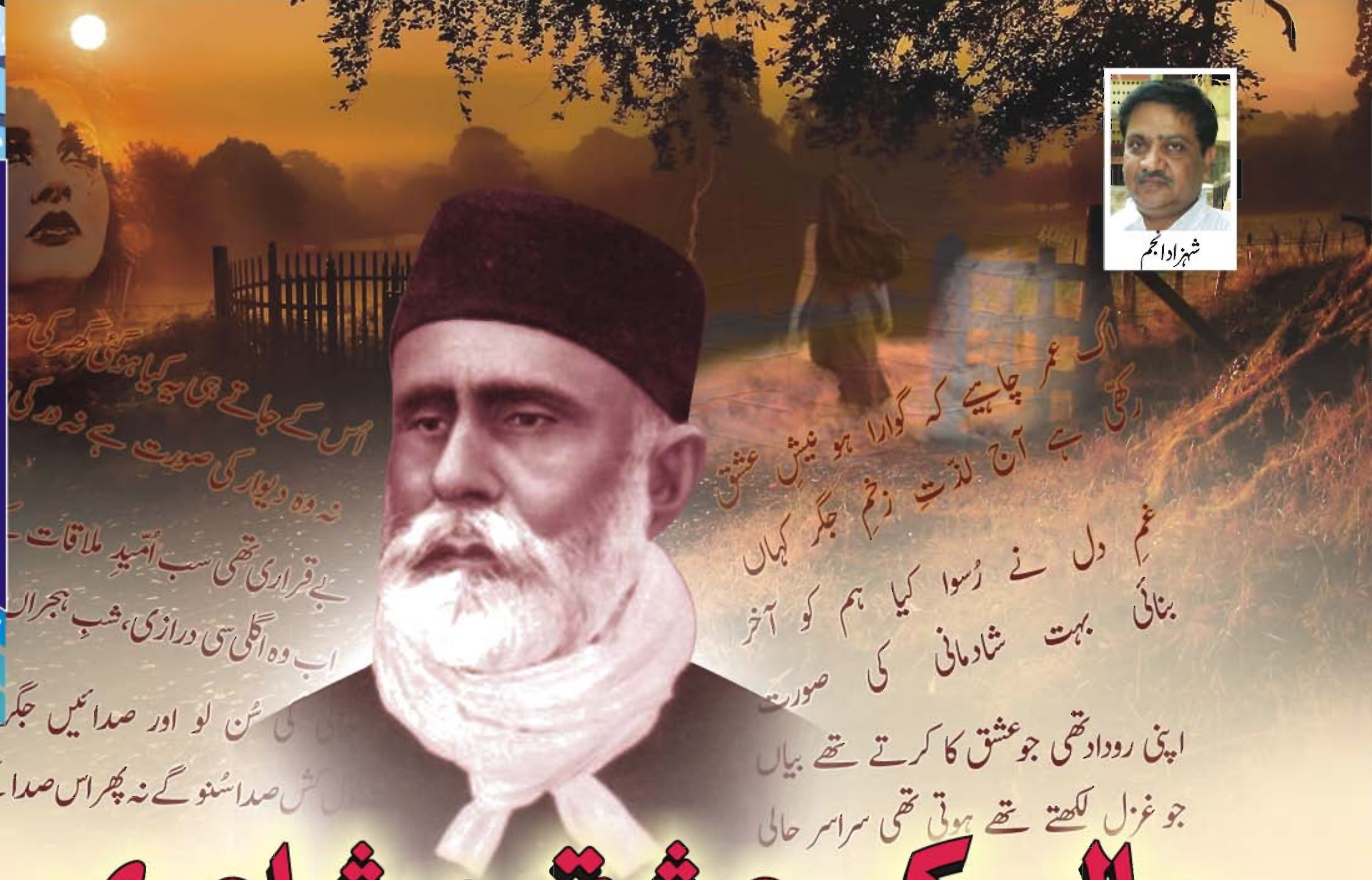

شہزاد انجم

حالی کی عشقیہ شاعری

خواجہ الطاف حسین حالی کا جب ذکر آتا ہے تو ایک ایسی شبیہہ آنکھوں کے سامنے اُبھر آتی ہے جو بے شمار انسانی خوبیوں سے مزین و آراستہ ہے چنانچہ حالی کی شخصیت کے اَنگنت روشن پہلو آنکھوں کے سامنے جھلملانے لگتے ہیں۔اُن کی نیکی و دردمندی، انسان دوستی، انکساری و خاکساری، ایثار وقربانی اور سادگی وشرافت کے ایسے متعدد واقعات ہیں جو اُن کی پوری زندگی کو آئینے کی طرح واضح اور عیاں کرتے ہیں۔اِسی لیے حالی کی عشقیہ شاعری کو پڑھ کر ہم تھوڑی دیر کے لیے اُلجھن میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔کہاں حالی، عالم باعمل، نیک ذات اور نیک صفات اور کہاں اُن کے یہ اشعار

تُم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
اُلفت وہ راز ہے کہ چھُپایا نہ جائے گا

———

قیس ہو کوہکن ہو یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

———

آنے لگا جب اُس کی تمنّا میں کچھ مزا
کہتے ہیں لوگ جان کا اس میں زیاں ہے اب

———

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت
ہم کو طاقت نہیں جُدائی کی

———

ملتے ہی اُس کے بھول گئیں کُلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

———

جو دِل پہ گزرتی ہے کیا تجھ کو خبر ناصح
کچھ ہم سے سُنا ہوتا، پھر تُو نے کہا ہوتا

———

عشق سُنتے تھے جسے ہم، وہ یہی ہے شاید
خود بہ خود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

———

بے قراری تھی سب اُمّیدِ ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی، شبِ ہجراں میں نہیں

اِن اشعار کو پڑھ کر ذہن میں ایک کُرید ہوتی ہے کہ کہیں حالی کا معشوق گوشت پوست کا تونہیں۔کیونکہ خود حالی اپنی شاعری میں کئی اشارے قائم کرتے ہیں۔مثلاً اُن کے درج ذیل دو اشعار ملاحظہ ہوں:

لذّت ترے کلام میں آئی کہاں سے یہ
پوچھیں گے جا کے حالی جادوبیاں سے ہم

ٹپکتا ہے اشعار حالی سے حال
کہیں سادہ دِل، مبتلا ہوگیا

پہلے شعر میں حالی نے تعلّی سے کام لیا ہے، وہ اپنے کلام کی لذّت سے واقف ہیں اور اپنی جادو بیانی پر نازاں بھی ہیں جو ہمیں سوچنے پر مجبور کردیتا ہے کہ کلام میں لذّت کہاں سے آئی؟ اس کا سبب کیا ہے، کیا کوئی معشوق پردۂ زنگاری میں ہے؟ دوسرا شعر بھی تھوڑی دیر کے لیے ہمیں اُلجھن میں ڈالتا ہے کہ کیا حالی نوجوانی کے ایاّم میں کسی پری رُخ سے آنکھیں تونہیں لڑا بیٹھے تھے جس کا اقرار وہ اپنے اِس شعر میں نہایت ہی سادگی اور معصومیت کے ساتھ کررہے ہیں۔جہاں تک پہلے شعر میں تعلّی اور روایتی خودستائی کی بات ہے تو اس تعلّی کی مزید مثالیں حالی کے یہاں دیکھی جاسکتی ہیں:

متاعِ بے بہا ہے شعر حالی
مری قیمت مری گفتار سے پوچھ

———

حالی کی سُن لو اور صدائیں جگر خراش
دل کش صدا سُنو گے نہ پھر اس صدا کے بعد

———

بزم سخن میں جی نہ لگا اپنا زینہار
شب انجمن میں حالیِ جادو بیاں نہ تھا

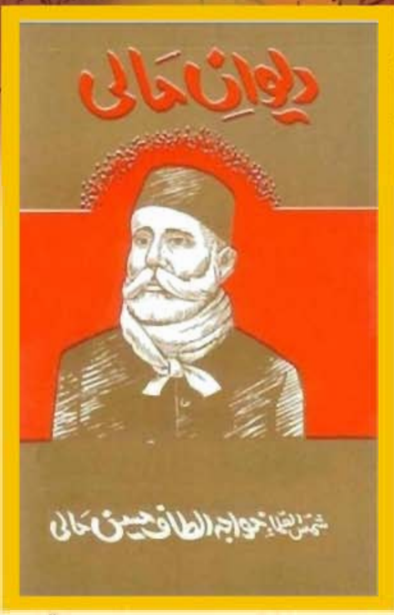

—

ایسی غزلیں سُنی نہ تھیں حالی
یہ نکالی کہاں سے تُم نے بیاض

تو پھر کیا یہ مان لیا جائے کہ حالی نے جب غزل کا یہ مقطع کہا تھا:

لذّت ترے کلام میں آئی کہاں سے یہ
پوچھیں گے جا کے حالیِ جادو بیاں سے ہم

کیا یہ صرف اُن کے عہد کی روایتی شاعری کی ایک مثال ہے اور جب حالی پہلے دور سے دوسرے دور میں داخل ہوتے ہیں تو وہ عشقیہ شاعری سے منحرف ہوجاتے ہیں اور اصلاحی رنگ اُن پر غالب ہوجاتا ہے مگر پھر یہ سوال بھی قائم ہوتا ہے کہ جب حالی اپنے پہلے دور کی شاعری کو ناپسند کرتے ہیں، اسے فرسودہ اور روایتی سمجھتے تھے تو انھوں نے اپنی قدیم غزلوں کو جدید غزلوں کے ساتھ دیوان میں کیونکر شامل کیا؟ کیا شیفتہ اور غالب کی ذوق آفریں صحبت نے انھیں سچا شاعر بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ ''یادگارِ حالی'' میں صالحہ عابد حسین رقم کرتی ہیں:

''حالی لاکھ پاک باز سہی، شعر گوئی کے لیے رند شاہد باز بنا ضروری تھا۔ شاعری کی محفل میں داخلے کی شرط ہی یہ تھی کہ وہی پُرانا راگ الاپا جائے۔''

(یادگارِ حالی، ص 35-134)

حالی خود لکھتے ہیں:

''ایک مدت تک یہ حال رہا کہ عاشقانہ شعر کے سوا کوئی کلام پسند نہ آتا تھا بلکہ جس شعر میں یہ چاشنی موجود نہ ہوتی اس پر شعر کا اطلاق کرنے میں بھی مضائقہ ہوتا تھا۔ خود بھی جب یہ سودا اُچھلا آنکھیں بند کیں اور اسی شارع عام پر پڑلیے جس پر راہگیروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ قافلے کا ساتھ، راہ کی ہمواری اور رہ گزر کی فضا کو چھوڑ دوسرا راستہ اختیار کرنے کا خیال بھی نہ آیا.....''

(دیباچہ دیوانِ حالی)

چنانچہ جیسی دلکش و دلآویز عشقیہ شاعری حالی نے کی اُس سے ہم سبھی واقف ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کچھ ہنسی کھیل سنبھلنا غمِ ہجراں میں نہیں
چاک دل میں ہے مرے جو کہ گریباں میں نہیں

—

اُس کے جاتے ہی یہ کیا ہوگئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

—

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم
ہم بھی آخر کو جی چُرانے لگے

—

ہوتی نہیں قبول دُعا ترکِ عشق کی
دِل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

—

اُس نے اچھا ہی کیا حال نہ پوچھا دل کا
بھڑک اُٹھتا تو یہ شعلہ نہ دبایا جاتا

—

جی ڈھونڈھتا ہے بزمِ طرب میں اُنھیں مگر
وہ آئے انجمن میں، تو پھر انجمن کہاں

—

نیا ہے لیجے جب نام اُس کا
بہت وسعت ہے میری داستاں میں

حالی کے اِن اشعار یا اس قسم کے دیگر اشعار پر کس کا پرتو ہے؟ کیا یہ اشعار محض رند شاہد باز بننے کے لیے اور شاعری کی محفل میں داخل ہونے کے لیے کہے گئے تھے؟ یہاں میں یہ واضح کردوں کہ درج بالا اشعار میں چند اشعار کا تعلق حالی کے دوسرے دور کی غزلوں سے بھی ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ حالی کے عہد میں عشقیہ شاعری کی بنیادیں نہایت مستحکم تھیں۔ وہ خود کو اس سے محفوظ نہیں رکھ سکتے تھے۔ شاید اسی لیے اُنھیں چند روز جھوٹا عاشق بننا پڑا۔ مسدّس کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''البتہ شاعری کی بدولت چند روز جھوٹا عاشق بننا پڑا۔ ایک خیالی معشوق کی چاہ میں برسوں دشتِ جنوں کی وہ خاک اڑائی کہ قیس وفرہاد کو گرد کردیا.....''

خیالی معشوق کی چاہت اور مذکورہ شارع عام پر چلنے کی ضرورت نے حالی کو اس راہ کا مسافر بنادیا گویا یہ کہ یہ راستہ یا پھر یہ کہیں کہ شاعری حالی کے بنیادی مزاج کا حصّہ نہیں تھی۔ پھر یہ سوال اُٹھتا ہے کہ کیا یہ شاعری حالی کے دِل کی آواز نہیں؟ علاوہ ازیں حالی کے ان اشعار کا کیا کیا جائے؟

گو جوانی میں تھی کجرائی بہت
پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

—

ہوئے تم نہ سیدھے جوانی میں حالی
مگر اب مری جان ہونا پڑے گا

—

اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں
جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی

کیا حالی کے یہ اشعار اور اس طرح کے دوسرے عشقیہ اشعار محض دل لگی کے لیے ہیں یا کسی حقیقت سے ان کا کوئی واسطہ بھی ہے؟ یا پھر اساتذۂ شعروسخن کی محفلوں اور نجی صحبتوں نے ان کی شاعری کو جلا بخشی اور اُن کے دل میں بھی یہ خیال آیا کہ اردو غزل کا عطر یا جوہر عشقیہ شاعری ہی ہے۔ اس کے بغیر وادیِ غزل میں شناخت قائم کرنا بے حد مشکل ہے۔ حالی کی عشقیہ شاعری اس کی عمدہ مثال ہے۔ حالی کی عشقیہ شاعری میں کافی وسعت ہے۔ عشقیہ شاعری کے تعلق سے فراق گورکھپوری اپنی کتاب ''اردو کی عشقیہ شاعری'' میں لکھتے ہیں:

''عشقیہ شاعری کی داستان محض عارض وکاکل قُرب و دوری، جوروکرم، وصل وہجر، ذکرِ غم یا ذکرِ محبوب تک محدود رہے یہ ضروری نہیں۔ بلکہ پُرعظمت عشقیہ شاعری حسن وعشق کی واردات کو زندگی کے اور مسائل و مناظر کے Perspective یا نسبتوں کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ داخلیت و خارجیت، نفسیت و واقعیت، ارتکاز و تنوع کالیداس، شیکسپیئر، گیٹے، دانتے کی آفاقی اور پُرعظمت ومکمل عشقیہ شاعری میں یکساں موجود ہیں۔ جب قومی زندگی میں ترقی وتعمیر کے عناصر کارفرما ہوتے ہیں تو ان کی جگمگاہٹ عشقیہ شاعری میں بھی مرکوز ومحدود وسوز وگداز سے گزر کر بزمِ کائنات میں چراغاں کردیتی ہے۔ اُس وقت عشقیہ شاعری کے ہاتھوں میں گریبانِ ہستی آجاتا ہے۔ بلند عشقیہ شاعری محض عشقیہ شاعری نہیں ہوتی۔''

وقتِ رخصت تھا سخت حالی پہ
ہم بھی بیٹھے تھے جب وہ جانے لگے

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے
غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

(اردو کی عشقیہ شاعری: فراق گورکھپوری، ص 14-13)

فراق مزید لکھتے ہیں:

''ہم اُسے سچّی عشقیہ شاعری نہیں کہتے جو ہمیں مٹا کر رکھ دے یا جو محبت و زندگی کے لیے حوصلہ شکن ہو، ہم اُسے حقیقی عشقیہ شاعری کہتے ہیں جو ہماری رگوں میں خون دوڑائے اور ہماری زندگی کو بھرپور بنادے۔''

(اردو کی عشقیہ شاعری: فراق گورکھپوری ص 18)

حالی کی عشقیہ شاعری ہمیں حوصلہ بخشتی ہے اس سے نور چھن چھن کر زندگی میں جوش اور اُمنگ بھر دیتا ہے۔ ایک طرب انگیز سرور میں سرشار ہوکر ہم تھوڑی دیر کے لیے خوشیوں کے باغ میں چہل قدمی کرنے لگتے ہیں۔ نہایت سنبھلی ہوئی، لطیف اور متوازن کیفیت ہمیں سرشار کر دیتی ہے مثلاً یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں

قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح
لگادو آگ کوئی آشیاں میں

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

حالی کے ان اشعار میں ایک خاص قسم کی سادگی ہے لیکن اس سادگی کے بطن میں جو خلوص وصداقت ہے وہ ان اشعار کو رعنائی اور حُسن عطا کرتے ہیں۔ اُن کے ذاتی تجربات اور احساسات جب شعر کے قالب میں ڈھلتے ہیں تو شائستگی اور متانت، جذبات کی صداقت اور ایسے پاکیزہ خیالات کا احساس ہوتا ہے جن میں لطف واثر بھی ہے اور سوز وگداز بھی، حُسنِ تغزل بھی ہے، شائستگی بھی ہے اور لہجے کی دھیمی دھیمی لَے بھی۔

حالی کس نازنین پر اور کب فدا ہوئے؟ اُن کی عشقیہ شاعری کا سرچشمہ کہیں کوئی معشوق تو نہیں اس کی تلاش اب تک بے سود اور لاحاصل رہی ہے کیونکہ حالی کی پوری زندگی ایک مکمل آئینہ ہے۔ وہ تو شادی کے فوراً بعد پانی پت سے دہلی

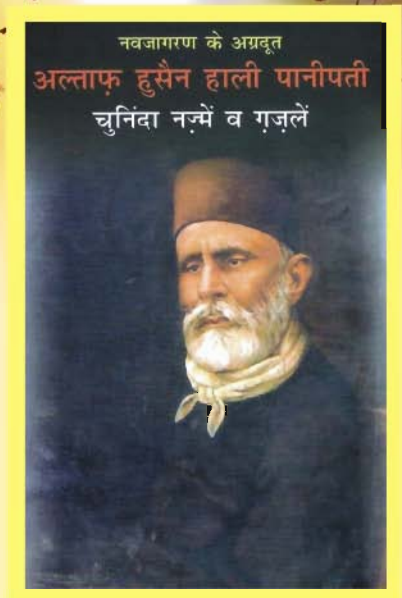

خاموشی سے آگئے تھے اور مذہب کی طرف حد درجہ راغب تھے۔ غنیمت ہے کہ ایسے وقت میں اُن کی ملاقات شیفتہ و غالب سے ہوگئی جنھوں نے اُن کی ادبی زندگی کو ایک نیا رُخ عطا کیا اور وہ شعر کے حقیقی حُسن سے واقف بھی ہوئے جس کا اقرار حالی خود کرتے ہیں:

''شیفتہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لُطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی سچّی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانا اسی کو منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔ اُن کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہوگیا۔''

(تذکرۂ حالی: اسماعیل پانی پتی)

اس کا اظہار حالی شعر میں یوں کرتے ہیں:

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے
غالب کا معتقد ہے، مقلد ہے میر کا

صالحہ عابد حسین 'یادگار غالب' میں رقم طراز ہیں:

''فطری صلاحیت، میر اور سعدی جیسے شاعروں کے روحانی فیض اور غالب و شیفتہ جیسے صاحب ذوق شعرا کی صحبت اور تربیت کی بدولت حالی اس میدان میں بڑی حد تک سنبھلے رہے۔ چنانچہ اُن کے اس دور کے کلام میں بھی نہ تو وہ عامیانہ اور گھٹیا مذاق نظر آتا ہے جس کی بنیاد سطحی عشق اور ہوا و ہوس کے جذبات پر رکھی جاتی ہے اور نہ معاملہ بندی اور کنگھی چوٹی کا وہ ذکر ہے جو اُس وقت بیشتر شاعروں کا موضوع تھا۔ وہ تخیل کی ان غیر قدرتی رفعتوں پر بھی نہیں اُڑتے جن سے شعر ایک گورکھ دھندا بن جاتا ہے۔ نہ دُور از کار تشبیہوں، مبہم استعاروں کا وہ جال بُنتے ہیں جس میں اُلجھ کر شعر کا مطلب خبط ہوجائے، انھوں نے اپنے روحانی استادوں اور زندہ استادوں سے اپنی طبیعت اور صلاحیت کے مطابق استفادہ کیا تھا۔ میر سے درد دل لیا اور درد سے تصوف کی چاشنی، غالب سے حسنِ تخیل، ندرتِ فکر اور شوخیِ گفتار سیکھی اور سعدی سے بیان کی سادگی اور معنی کی گہرائی اور شیفتہ سے سیدھی سچی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانے کا فن اور ان سب کی ترکیب سے حالی کی غزل کا ہیولیٰ تیار ہوا۔''

(یادگار حالی ص 134)

حالی جدید اردو غزل کے اہم شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ اُن کی شاعرانہ عظمت کا اقرار ناقدوں اور ادیبوں نے کیا ہے۔ اُن کے یہ اشعار حالی کی رنگیں بیانی اور جادو نوائی کے بیّن ثبوت ہیں۔ محبت کا صالح، نیک اور پاکیزہ جذبہ اُن کے سینے کے اندر بھی موجود ہے۔ وہ ان جذبات کا اظہار سادگی، متانت، خلوص اور کمالِ گویائی کے ساتھ کرتے ہیں:

حالی کو ہجر میں بھی جو دیکھا تو شادماں
تھا حوصلہ اُسی کا کہ اتنا صبور تھا

غمِ دل نے رُسوا کیا ہم کو آخر
بنائی بہت شادمانی کی صورت

کوئی دل سوز ہو تو کیجیے بیاں
سرسری دل کی واردات نہیں

وقتِ رخصت تھا سخت حالی پر
ہم بھی بیٹھے تھے جب وہ جانے لگے

خواجہ الطاف حسین حالی نے بھلے ہی اپنے دوسرے دور کی شاعری میں قصہ عشق بتاں سے فرار اختیار کرنے کی کوشش کی ہو اور کچھ دل سے اور کچھ آسماں سے ڈر کر سایۂ عشق بتاں سے بھی بھاگتے ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ حالی کی عشقیہ شاعری کا نقش خاصا گہرا، دلکش اور دلآویز ہے۔ یہ اُن کی مخصوص شناخت ہے اور اس کے بغیر حالی کی شاعری کا ذکر نامکمل اور ادھورا رہے گا۔

■

Prof. Shahzad Anjum., Dept of Urdu,
Jamia Millia Islamia, New Delhi - 110025

جہانگیر احمد

حالی بحیثیت شاعر

مولانا الطاف حسین حالی ان لوگوں میں ہیں جنھیں قسام ازل کے یہاں سے غیر معمولی صلاحیتیں حاصل ہوئیں۔ مگر تاریخ کے بیشتر افراد کی طرح انھوں نے اپنی صلاحیتوں کا صرف کم تر حصہ استعمال نہیں کیا۔ بلکہ ان صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر رہتی دنیا تک اردو ادب کی تاریخ میں زندہ جاوید ہوگئے۔ مولانا الطاف حسین حالی ادیب، نقاد شاعر، اور سوانح نگار کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں۔ یوں تو ان میں سے ہر میدان میں مولانا حالی اپنی الگ پہچان اور امتیازی شان رکھتے ہیں مگر فی الوقت ہمیں مولانا الطاف حسین حالی کا مطالعہ بحیثیت شاعر کرنا ہے۔ حالی کی شاعری کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کی شاعری ہشت پہلو نگینہ کی طرح مختلف النوع خصوصیات رکھتی ہے۔ شاعری کی وہ کون سی صنف ہے جو ان کے یہاں یک گونہ دلکشی اور توانائی کے ساتھ موجود نہ ہو اور جس میں ان کی مجتہدانہ شان نہ پائی جاتی ہو۔ اردو شاعری میں جو سماجی احتساب اور فکری افلاس کے عناصر پائے جاتے تھے، حالی کی حکیمانہ نظر نے انھیں دیکھا اور اپنے تجربے اور اجتہاد سے ان کو دور کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے شاعری کو لفظی صناعی اور مبالغہ آرائی سے نجات دلائی اور اس کو سادگیِ ادا، وحدت فکر، جدت بیان اور حقیقت نگاری سے روشناس کیا۔ ان کی شاعری میں غم عشق و غم روزگار کے ساتھ ساتھ ملت کا غم بھی ہے لیکن یہ غم یاس و ناامیدی، قنوطیت اور نامرادی کا غم نہیں ہے بلکہ اس میں سوز دروں اور خون جگر کی آمیزش ہے۔ درحقیقت اردو شعر و سخن کی نشاۃ ثانیہ اور حیات نو ہی کی مرہون منت ہے۔

اب آیئے حالی کی شاعری کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے صنف شاعری میں سے ہر صنف کا الگ الگ تجزیہ کرتے چلیں تا کہ وہ چیزیں واضح طور پر ہمارے سامنے آجائیں جن کی وجہ سے حالی اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہیں۔ حالی کی شاعری کا آغاز قدیم رنگ سخن سے ہوا اور انھوں نے بھی پہلے پہل اسی 'مطعون' صنف سخن میں طبع آزمائی کی جسے سخت جان 'غزل' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ نعتیہ خمسہ قصیدہ کے سوا 1872 سے قبل ان کی کوئی جدید نظم نہیں ملتی۔ 1869 میں انھوں نے غالب کا مرثیہ ترکیب بند میں لکھا جو اردو شاعری میں غیر معمولی حیثیت رکھتا ہے۔ 1874 میں انھوں نے لاہور کے مشاعرے کے لیے جدید نظمیں لکھیں اور نیچرل شاعری کی طرف متوجہ ہوئے، یہیں سے وہ غزل کی دنیا سے نکل جدید شاعری کی دنیا میں عملاً داخل ہوئے۔ یوں تو نظریاتی اعتبار سے وہ اردو شاعری کی قدیم و فرسودہ روایات سے پہلے ہی منحرف اور دل برداشتہ ہو چکے تھے، سرسید کی ملاقات او ران کی تحریک میں شرکت نے حالی کے لیے سونے پر سہاگا کا کام کیا۔ ان کا رنگ سخن بدلا، عشقیہ شاعری کی جگہ قومی شاعری اور اصلاحی شاعری نے لے لی اور ان کی زیادہ تر توجہ اصلاح ملت کی طرف رہی، انھوں نے آخر وقت تک اپنے کلام سے یہی کام لیا۔

اردو شاعری میں غزل کو جو مقبولیت حاصل ہے وہ کسی دوسری صنف کو خاص نہیں۔ دلوں پر غزل کی حکومت رہی ہے۔ اس لیے حالی نے سب سے پہلے غزل کی طرف توجہ کی۔ حالی غزل کو ہوا و ہوس سے نکال کر حق و صداقت اور تمام اعلیٰ انسانی جذبات و خیالات کا ترجمان بنانا چاہتے تھے۔ وہ الفاظ کے استعمال اور خیالات کے اظہار میں فطری انداز کو پسند کرتے تھے۔ صنائع و بدائع اور تشبیہات و استعارات کی بھرمار کے خلاف تھے۔ مختصر اور آسان ردیف و قافیہ، روزمرہ اور محاورے کی پابندی اور نئے اسلوب کو آہستہ طور پر اختیار کرنے کے حامی تھے۔

حالی کی تمام غزلیات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(1) پہلا حصہ قدیم غزلیات پر مشتمل ہے۔ یہ غزلیں ایام جوانی یا اس زمانے کی تصنیف ہیں جب حالی پر تغیرات زمانہ کا اثر زیادہ نہ پڑا تھا اور وہ عاشقانہ اور روایتی قسم کی غزلیں لکھنے سے پرہیز نہ کرتے تھے تاہم اس میں بھی متانت کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔

(2) دوسرے حصے کی غزلوں کا زمانہ 1892 سے 1914 تک ہے۔ اس اکیس سالہ مدت میں حالی نے بہت کم غزلیں کہی ہیں۔ اتنی کم کہ آخری دور کی کل غزلیں صرف سات ہے۔ حالی کی قدیم شاعری زیادہ تر غزلوں پر مشتمل ہے۔ ان غزلوں میں قدما کا رنگ سنجیدگی، اور متانت موجود ہے۔ ان میں انھوں نے غزل کی عام روایت کی پابندی کی۔ روایتی حسن وعشق، مذہب واخلاق، واعظ وناصح پر طنز، رشک ورقابت، رندی ومستی، دیروحرم کا ذکر قدیم اساتذہ کی طرح ان غزلوں میں موجود ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جو دل پہ گزرتی ہے کیا تجھ کو خبر ناصح
کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر تونے کہا ہوتا
آگے بڑھے نہ قصۂ عشق بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم
تقاضائے محبت ہے وگرنہ
مجھے اور جھوٹ کا تم پر گماں ہو
ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جاکر نظر کہاں
ہوتی نہیں قبول دعا ترک عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

یہ ہے حالی کا قدیم رنگ غزل جس میں شان تغزل اپنی پوری مہذب عشوہ طرازیوں اور کافر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے اب کچھ جدید رنگ کے اشعار دیکھیے:

معنی کا تم نے حالی دریا اگر بہایا
یہ تو بتاؤ حضرت کچھ کرکے بھی دکھایا
کھولی ہیں تم نے آنکھیں اے حادثو ہماری
احسان یہ نہ ہرگز بھولیں گے ہم تمہارا
گر جوانی میں تھی کم رائی بہت
پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت
حالی کی سن لو اور صدائیں جگر خراش
دلکش صدا سنو گے نہ پھر اس صدا کے بعد

درحقیقت حالی کی جدید رنگ کی غزلیں اخلاقی اور اصلاحی خیالات کی ترجمان ہیں اس لیے بعض جدید غزلیں وہ دلکشی اور حسن نہیں رکھتی جو حسن وعشق کی داستانوں میں نظر آتی ہے۔ بہرحال ان اشعار کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں سادگی ہے مگر حسن وشیرینی بھی ہے، الفاظ دھیمے ہیں مگر وہ کسک اور کھنک ہے جونشتر میں ہوتی ہے۔

غزلیات حالی کا یہ اجمالی تعارف پیش کرنے کے بعد ان کی چند خصوصیات کی طرف اشارہ کردینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ حالی کی قدیم غزلوں میں، قدیم روایات کا احترام ہے۔ عشق وحسن کا حسب معمول ذکر ہے لیکن پست خیالات اور عریاں جذبات کا نام ونشان تک نہیں، انداز بیاں صاف، سلجھا ہوا، سنجیدہ اور مہذب ہے۔ آسان اور عام فہم الفاظ ہیں۔ حالی نے جدید غزلوں میں نئے خیالات کو سمونے کی کامیاب کوشش کی اور غیر مردف، مسلسل غزلیں لکھیں اور غزل کو اس قابل بنایا کہ وہ ہر قسم کے خیالات کا اظہار کرسکے۔ غزلوں میں مقامی تشبیہات، ہندی الفاظ کا مناسب اور برمحل استعمال کیا ہے، کہیں کہیں روزمرہ اور محاورہ کی بہتات بھی ہے لیکن زیادہ تر کلام اس صنعت گری سے پاک ہے۔ آخری دور کی غزلوں میں بندش کی سستی اور الفاظ کا عدم تناسب موجود ہے اور تغزل پر مقصدیت غالب آجانے سے دلکشی میں کمی آگئی ہے۔

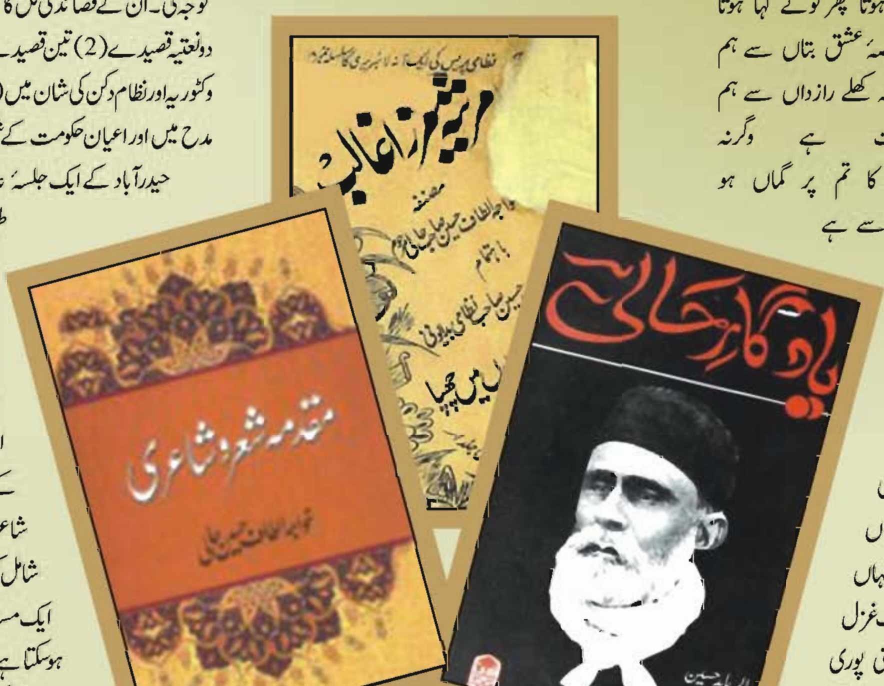

غزل کی طرح قصیدہ بھی شاعری کی ایک اہم صنف سخن رہی ہے۔ حالی نے قصیدے کی اہمیت وافادیت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے "قصیدہ بھی اگر اس کے معنی مطلق، مدح و ذم کے لیے جائیں (وراس کی بنیاد محض تقلیدی مضامین پر نہیں وبلکہ شاعر کے سچے جوش اور ولولے پر ہو تو شعر کی ایک نہایت ضروری صنف ہے جس کے بغیر شاعر کمال کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا اور اپنے بہت سے اہم اور ضروری فرائض سے سبکدوش نہیں ہوسکتا۔ (مقدمہ شعروشاعری، ص260)

ظاہر ہے کہ جو شاعری کے کمال کے لیے اس صنف کو ضروری سمجھتا ہو وہ بھلا کیونکر اس میں طبع آزمائی نہ کرتا۔ چنانچہ حالی نے بھی قصائد لکھے، مگر حالی کی فطرت کو قصیدہ نگاری سے طبعی لگاؤ نہیں تھا کیونکہ حقیقت پسندی اور سچائی کے ساتھ کوئی قصیدہ لکھنا اور اس کے تمام لوازمات پر نگاہ رکھنا حالی کے لیے مشکل تھا اس لیے قصیدہ نگاری کی طرف انھوں نے بہت کم توجہ کی۔ ان کے قصائد کی کل کائنات حسب ذیل ہے (1) دو نعتیہ قصیدے (2) تین قصیدے نواب سرآسمان جاہ، ملکۂ وکٹوریہ اور نظام دکن کی شان میں (3) ایک قصیدہ نظام دکن کی مدح میں اور اعیان حکومت کے شکریہ کے طور پر لکھا ہے جو حیدرآباد کے ایک جلسۂ عام میں پڑھا گیا تھا۔ اس طرح کل سات مکمل قصائد انھوں نے لکھے ہیں۔ ناتمام قصائد تین ہیں، دو نواب کلب علی خاں اور سرسید احمد کی مدح میں اور ایک میں صرف تشبیب کے اشعار۔ اگر حالی کے مدحیہ شاعری کو بھی قصیدے میں شامل کرلیا جائے تو پانچ قطعات، ایک مسدس اور ایک نظم کا اور اضافہ ہوسکتا ہے۔ حالی کے نعتیہ قصائد میں زور بیان بھی ہے اور سوز وگداز بھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حالی کو جو شیفتگی، محبت اور عقیدت تھی اس سے ان کی زبان میں زور اور بیان میں جوش پیدا ہوگیا ہے۔ حالی نے شیفتہ کی صحبت سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ شیفتہ کو رسالت مآب سے عشق تھا، حالی ان سے متاثر تھے۔ انھوں نے قصیدہ نگاری کے عام اصول سے ہٹ کر غزل کے پیکر میں قصیدہ لکھا اور قصیدے کے اجزائے ترکیبی کے التزام کو نظرانداز کردیا۔ لیکن ایک ایک حرف سے عشق رسول ظاہر ہے۔ ملاحظہ ہو:

بنے ہیں مدحت سلطان دو جہاں کے لیے
سخن زبان کے لیے اور زباں دہاں کے لیے
ہلال مکہ کا، ماہ دو ہفتہ، یثرب کا
فروغ قوم کے اور شمع دو زماں کے لیے
نبی کا نام ہو ورد زباں، رہے جب تک

سخن زبان کے لیے اور زباں دہاں کے لیے

غرض کہ حالی کے قصائد اصلیت، سادگی اور واقعہ نگاری کا مرقع ہیں۔ حالی نے قصائد میں جھوٹ اور مبالغہ سے پرہیز کیا ہے وہ کسی وقت بھی مبالغے سے کام نہیں لیتے۔ تشبیہات و استعارات کو پیچیدہ نہیں بناتے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں سیدھے سادے انداز اور آسان عام فہم زبان میں کہتے ہیں۔ یہ زبان قصیدہ کے لیے ناموزوں ہے۔ اگرچہ ان کے قصائد کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے لیکن اپنے مواد، ہیئت، سادہ اسلوب اور اپنی حقیقت نگاری کی وجہ سے اردو قصائد میں انھیں منفرد اور نمایاں مقام اور خاص اہمیت حاصل ہے۔

مولانا حالی نے مرثیہ کا ذکر قصیدہ کے سلسلے میں کیا ہے وہ مرثیہ کو بھی قصیدہ کا ایک حصہ سمجھتے تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ''زندوں کی تعریفوں کو قصیدہ بولتے ہیں اور مردوں کی تعریف کو جس میں تاسف اور افسوس بھی شامل ہوتا ہے مرثیہ کہتے ہیں'' اردو میں مرثیہ کا اطلاق زیادہ تر شہدائے کربلا اور خاص کر جناب سید الشہدا کے مرثیہ پر ہوتا ہے۔ گو کہ حالی نے واقعۂ کربلا یا حضرت سید الشہدا پر کوئی مرثیہ نہیں لکھا لیکن انھوں نے جو مرثیے لکھے ہیں ان میں ان کے سینے کا گداز اور قلب کا سوز، محبت و اخلاص، درد اور اثر ایک ایک لفظ سے ٹپکتا ہے۔

مولانا حالی نے اردو میں حسب ذیل مرثیے لکھے ہیں (1) مرثیہ غالب (2) بڑے بھائی کا مرثیہ (3) حکیم محمود خاں کا مرثیہ (4) ملکہ وکٹوریہ کا مرثیہ اور (5) محسن الملک کا مرثیہ۔

'مرثیہ غالب' اردو میں بے مثل ہے۔ حالی کو اپنے استاد سے جو قلبی محبت اور روحانی عقیدت تھی، وہ اس مرثیہ کے ایک ایک حرف سے ظاہر ہے۔ سنجیدگی اور متانت کا پیکر صبر و استقامت کا مجسمہ اپنے استاد کی موت پر بے چین ہو جاتا ہے۔ اس کی نگاہوں میں دنیا تاریک ہو جاتی ہے۔ اس کا دل عالم فانی کا رنگ دیکھ کر عیش دنیا سے سرد ہو جاتا ہے۔ اس مرثیہ میں کل دس بند ہیں۔ پہلے دو بند میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کر کے یہاں کی ہر چیز کو فریب اور دھوکہ بتایا ہے۔ دیکھیے:

کچھ نہیں جز طلسم خواب و خیال
گوشۂ فقر و بزم سلطانی
لوں نہ اک مشت خاک کے بدلے
گر ملے خاتم سلیمانی
بحر ہستی بجز سراب نہیں
چشمۂ زندگی میں آب نہیں

مولانا حالی نے مرثیہ کا ذکر قصیدہ کے سلسلے میں کیا ہے وہ مرثیہ کو بھی قصیدہ کا ایک حصہ سمجھتے تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ''زندوں کی تعریفوں کو قصیدہ بولتے ہیں اور مردوں کی تعریف کو جس میں تاسف اور افسوس بھی شامل ہوتا ہے مرثیہ کہتے ہیں'' اردو میں مرثیہ کا اطلاق زیادہ تر شہدائے کربلا اور خاص کر جناب سید الشہدا کے مرثیہ پر ہوتا ہے۔ گو کہ حالی نے واقعۂ کربلا یا حضرت سید الشہدا پر کوئی مرثیہ نہیں لکھا لیکن انھوں نے جو مرثیے لکھے ہیں ان میں ان کے سینے کا گداز اور قلب کا سوز، محبت و اخلاص، درد اور اثر ایک ایک لفظ سے ٹپکتا ہے۔

آخری بند میں غالب کی خصوصیات اور مرحوم سے اپنے روابط کا ذکر کرتے ہوئے استفہامیہ انداز میں اظہار غم کیا ہے:

ہند میں نام پائے گا اب کون؟
سکہ اپنا بٹھائے گا اب کون؟
اس سے ملنے کو یاں ہم آتے تھے
جا کے دلی سے آئے گا اب کون؟
شعر میں ناتمام ہے حالی
غزل اس کی بنائے گا اب کون؟

اس مرثیہ سے غالب کی شخصیت وسیرت اور ان کے کمال فن پر روشنی پڑتی ہے۔ اردو مرثیے میں اس مرثیہ سے ہیئت

اور اسلوب کے لحاظ سے ایک نئے انداز فکر کا آغاز ہوتا ہے۔ شخصی مرثیوں میں ملک وملت کے احساس کے ساتھ ساتھ یہ مرثیہ اپنی زبان کی سلاست وروانی اور اپنے بیان کی اثر آفرینی میں شاہکار تسلیم کیا گیا ہے جس پر اردو شاعری جس قدر ناز کرے کم ہے۔ اپنے تمام مرثیوں میں حالی نے مرحومین کے سچے محاسن اور اوصاف اس طرح بیان کیے ہیں کہ دوسروں کو اس سے نصیحت حاصل ہو۔ ان میں نیک بننے، نیکیاں پھیلانے اور ملک وملت کی خدمت کرنے کا جوش اور ولولہ پیدا ہو۔ حالی نے مرثیوں کو کسی مخصوص ہیئت میں محدود نہیں رکھا بلکہ مسدس، قطعہ، ترکیب بند میں لکھ کر یہ واضح کر دیا کہ:

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابند نے نہیں ہے

اردو شاعری میں مثنوی کو بھی کافی مقبولیت حاصل رہی ہے۔ اس کو سب سے کارآمد اور مفید صنف تسلیم کیا گیا ہے۔ مولانا حالی نے مثنوی کے متعلق حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے ''مثنوی اصناف سخن میں سب سے زیادہ مفید اور بکارآمد صنف ہے'' اور ''جتنی صنفیں فارسی اور اردو شاعری میں متداول ہیں ان میں کوئی صنف مسلسل مضامین بیان کرنے کے قابل مثنوی سے بہتر نہیں ہے۔'' لیکن حالی نے کوئی ایسی مثنوی نہیں لکھی جس میں مافوق الفطرت عناصر شامل ہوں۔ بلکہ انھوں نے عام انسانی زندگی سے اپنے مواد کو اکٹھا کیا۔ عبادت بریلوی لکھتے ہیں ''ان کے موضوعات عمومی نوعیت کے ہیں، حب وطن، امید کی خوشی، مناظر فطرت، راست گوئی، اخلاقی اقدار کی اہمیت، مذہب و عقل، علمی اور تعلیمی معاملات، عورتوں کی بے کسی و کس مپرسی غرض یہ کہ اس زمانے کی زندگی میں جتنے بھی موضوعات تھے، ان سب کی ترجمانی کسی نہ کسی صورت سے حالی نے اپنی منظومات میں ضرور کی ہیں۔

حالی نے مغرب سے متاثر ہو کر مثنویاں لکھیں، ان کی سب سے پہلی نظم 'جواں مردی کا کام' 1872 ایک انگریزی نظم کا ترجمہ ہے۔ یہ مثنوی بچوں کے لیے لکھی گئی۔ اس قسم کی متعدد مثنویاں حالی نے بچوں کے لیے لکھی ہیں جن میں بچوں کے لیے کوئی نہ کوئی نصیحت اور سبق آموز بات ضرور بیان ہوئی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حالی نے بچوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور انھیں بچوں کے رجحانات کا کافی تجربہ تھا اس لیے وہ اپنی ناصحانہ بات اس انداز سے کہتے ہیں کہ دلچسپی قائم رہے اور بچوں کے دلوں پر اس کا اثر ہو، نیز انھیں زندگی کی حقیقت کام کی اہمیت، وقت کی قدر و قیمت اور دوسری تمام مفید باتوں کا علم ہو جائے اور ان میں قوت عمل پیدا ہو۔ یہ مثنویاں مختلف موضوعات پر ہیں، لیکن نتیجہ قریب قریب ایک ہی نکلتا ہے ''سیکھو اور عمل کرو'' چند عنوانات اور موضوعات یہ ہیں: خدا کی شان، غوث اعظم، میں کیا بنوں گا، سپاہی، شیر کا شکار، بلی اور چوہا وغیرہ۔ حالی نے مستقل طور پر اخلاقی شاعری کو اپنا موضوع بنایا اس لیے ان کے کلام کا معتد بہ حصہ بچوں کے واسطے بے حد مفید ہے۔ ان تمام مثنویوں کی زبان نہایت سادہ

اور دلچسپ ہے، بیان صاف اور شگفتہ ہے، بحریں زیادہ تر چھوٹی اختیار کی ہیں جو بچوں کے لیے نہایت موزوں ہیں، خدا کی شان میں کہتے ہیں:

اے زمیں آسمان کے مالک
ساری دنیا جہان کے مالک
تو ہی ہے سب کا پالنے والا
کام سب کا نکالنے والا
بھوک میں تو ہمیں کھلاتا ہے
پیاس میں تو ہمیں پلاتا ہے

لاہور کے مشاعرے کے لیے حالی نے چار مثنویاں لکھیں۔ یہ مثنویاں کافی مشہور و مقبول ہیں۔ پہلی 'برکھارت' جس میں برسات کی مختلف کیفیتوں اور رسموں کا ذکر کیا ہے۔ دوسری مثنوی 'نشاط امید' ہے۔ امید ہی پر دنیا قائم ہے، نا امیدی کفر بھی ہے اور موت بھی۔ حالی نے امید کی اہمیت مذہب و تاریخ سے ثابت کی ہے۔ تیسری مثنوی 'حب وطن' ہے۔ اس میں حالی نے اپنے دل میں وطن کی محبت کا جو دریا موجزن تھا اسی کو بیان کیا ہے۔ اسی مشاعرے کے لیے حالی نے آخری مثنوی 'مناظرۂ رحم و انصاف' لکھی۔ یہ مثنوی اپنی نوعیت کے لحاظ سے اردو میں نئی چیز تھی۔ حالی نے رحم و انصاف کے فضائل الگ الگ بیان کیے ہیں، دونوں نے اپنی بڑائی ثابت کی ہے لیکن عقل نے ثالث بن کر فیصلہ کر دیا کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ ملاحظہ ہو:

رحم ادھر عدل سے کہتا ہے کہ تو ہے کیا چیز
اور ادھر رحم کو ہے عدل سمجھتا ناچیز
فرق اصلاً نہیں تم دونوں میں لڑتے کیوں ہو
جب کہ تم ایک ہو آپس میں جھگڑتے کیوں ہو

حالی کی مثنویوں نے اردو شاعری میں ایک نئی شاہراہ قائم کی، روشنی کا ایک نیا مینارہ تعمیر کیا، اس کو نیا آہنگ، نیا ساز دیا۔ اس ساز میں سچائی، سادگی، درد، خلوص، ایثار، قربانی، خودداری اور خود اعتمادی ہے۔ انھوں نے اپنی مثنویوں کے ذریعے نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالی۔ اس کو مغربی خیالات و جذبات سے مالا مال کر کے اس قابل بنا دیا کہ وہ اس کے ساتھ شانہ بشانہ چل سکے۔

اردو شاعری میں 'مسدس' مرثیہ کے لیے مخصوص ہو گئی تھی، لیکن حالی نے اس صنف کو اس طرح نوازا کہ مسدس اور حالی لازم و ملزوم ہو گئے۔ مسدس کا نام آتے ہی حالی کا مسدس 'مد و جزر اسلام' نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ حالی نے تین مسدس لکھے (1) مسدس مد و جزر اسلام (2) مسدس ننگ خدمت (3) مرثیہ حکیم محمود خاں۔ مسدس مد و جزر اسلام مولانا حالی کا غیر فانی شاہکار ہے۔ یہ تعارف و تعریف کا محتاج نہیں۔ اس کو جو شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی اردو کی کسی دوسری مسدس کو نصیب نہیں ہو سکی، یہ مسدس سرسید کی تحریک پر حالی نے لکھا تھا، اس مسدس میں کیا کیا ہے۔ حالی لکھتے ہیں ''اس مسدس کے آغاز میں اول پانچ سات بند تمہید کے لکھ کر اول عرب کی اس ابتر حالت کا خاکہ کھینچا ہے جو ظہور اسلام سے پہلے تھی اور جس کا نام اسلام کی زبان میں جاہلیت رکھا گیا، پھر کوکب اسلام کا طلوع ہونا اور نبی امی کی تعلیم سے اس ریگستان کا دفعتاً سرسبز و شاداب ہو جانا اور اس ابر رحمت کا امت کی کھیتی کو ہرا بھرا چھوڑ جانا اور مسلمانوں کا دینی و دنیاوی ترقیات میں تمام عالم پر سبقت لے جانا بیان کیا ہے اور اس کے بعد ان کے تنزل کا حال لکھا ہے اور قوم کے لیے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں آکر وہ اپنے خط و خال دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے۔''

(دیباچہ اول مسدس حالی، صدی ایڈیشن، ص 8-7)

حالی لکھتے ھیں ''اس مسدس کے آغاز میں اول پانچ سات بند تمھید کے لکھ کر اول عرب کی اس ابتر حالت کا خاکہ کھینچا ھے جو ظھور اسلام سے پہلے تھی اور جس کا نام اسلام کی زبان میں جاھلیت رکھا گیا، پھر کوکب اسلام کا طلوع ھونا اور نبی امی کی تعلیم سے اس ریگستان کا دفعتاً سرسبز و شاداب ھوجانا اور اس ابر رحمت کا امت کی کھیتی کو ھرا بھرا چھوڑ جانا اور مسلمانوں کا دینی و دنیاوی ترقیات میں تمام عالم پر سبقت لے جانا بیان کیا ھے

جماعت کی عزت میں ہے سب کی عزت
جماعت کی ذلت میں ہے سب کی ذلت
رہی ہے نہ ہرگز رہے گی سلامت
نہ شخصی بزرگی، نہ شخصی حکومت
وہی شاخ پھولے گی یاں اور پھلے گی
ہری ہوگی جڑ اس گلستاں میں جس کی

رباعی اپنی ہیئت اور اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت مفید مگر مشکل صنف ہے، اس کو اصلاحی و اخلاقی، سیاسی و سماجی، مذہبی اور فلسفیانہ مضامین کے لحاظ سے امتیاز حاصل ہے۔ اردو میں مرثیہ گو شعرا نے رباعیاں زیادہ لکھیں، میر ضمیر، میر خلیق، مرزا دبیر اور میر انیس کی رباعیوں کو اردو ادب کا بہترین سرمایہ کہا جاتا ہے۔ خاص طور پر میر انیس کی رباعیاں موضوع، مواد اور زبان و بیان کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ صالحہ عابد حسین کے بقول ''انیس کی رباعیوں کے بعد اردو شاعری میں حالی کی رباعیاں سب سے بلند درجہ کی کہی جا سکتی ہیں۔''

(یادگار حالی، ص 202)

حالی کی رباعیات کا موضوع دینی و دنیوی اصلاح و ترقی ہے۔ عام طور پر انھوں نے اپنی رباعیوں میں حسب ذیل مضامین لکھے ہیں: مذہب و اخلاق، حکمت و فلسفہ، تعلیم و تربیت، ادب و سیاست، تمدن و معاشرت، پند و موعظت، ملک و ملت اور کردار و عمل وغیرہ۔ حالی نے دیوان کے ساتھ ہی اپنی رباعیاں بھی شائع کی تھیں۔ اس کے بعد رباعیاں حالی کے نام سے متعدد ایڈیشن علیحدہ شائع ہوئے۔ رباعیات کا انگریزی میں ترجمہ بھی ہوا۔ اب تک حالی کی 153 رباعیات کا علم ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو:

یاں رہنے کی مہلت کوئی کب پاتا ہے
آتا ہے اگر آج تو کل جاتا ہے
جو کرنے کے ہیں کام ان کو جلدی بھگتاؤ
طلبی کا پیام وہ چلا آتا ہے
رونق ہے ہر اک بزم کی اب غیبت میں
بدگوئی خلق ہے ہر اک صحبت میں
اوروں کی برائی پہ ہے فخر وہاں
خوبی کوئی باقی نہیں جس امت میں
فرقت میں بشر کی رات کیوں کر گزرے
اک خستہ جگر کی رات کیونکر گزرے
گزری نہ ہو جس بغیر یاں ایک گھڑی
یہ چار پہر کی رات کیونکر گزرے

حالی کی شاعری معاشی و معاشرتی، مذہبی و اخلاقی، علمی و ادبی، تعلیمی و اصلاحی ہر طرح کے خیالات کی ترجمانی کرتی ہے۔ انھوں نے پوری اردو شاعری کو ماضی کے خوابوں سے چونکا کر حال کی تلخیوں کا احساس دلایا، اس میں عظمت اور زندگی پیدا کی اور اسے زمانہ کے دوش بدوش لا کھڑا کیا۔

مختصر یہ کہ حالی کی شاعری قوم و ملک کے حالات کا آئینہ اور عصری رجحانات کی ترجمان ہے۔ اس نے اردو شاعری کے دھارے کو صحیح سمت پر موڑا جس سے گلستاں سخن سرسبز و شاداب ہو گیا۔ سبزۂ خوابیدہ کی طرح سوئی ہوئی قوم جاگ اٹھی اور سکوت و بے حسی کا طلسم ٹوٹ گیا:

حالی اٹھا ہلا کے محفل کو
آخر اپنا کہا کیا تونے

■

Jahangeer Ahmad.,Sr. Moneeter, Electronic Media Moneetring Centres, Wazarat Baraye Ittelaat wa Nashriat, Hukoomate Hind

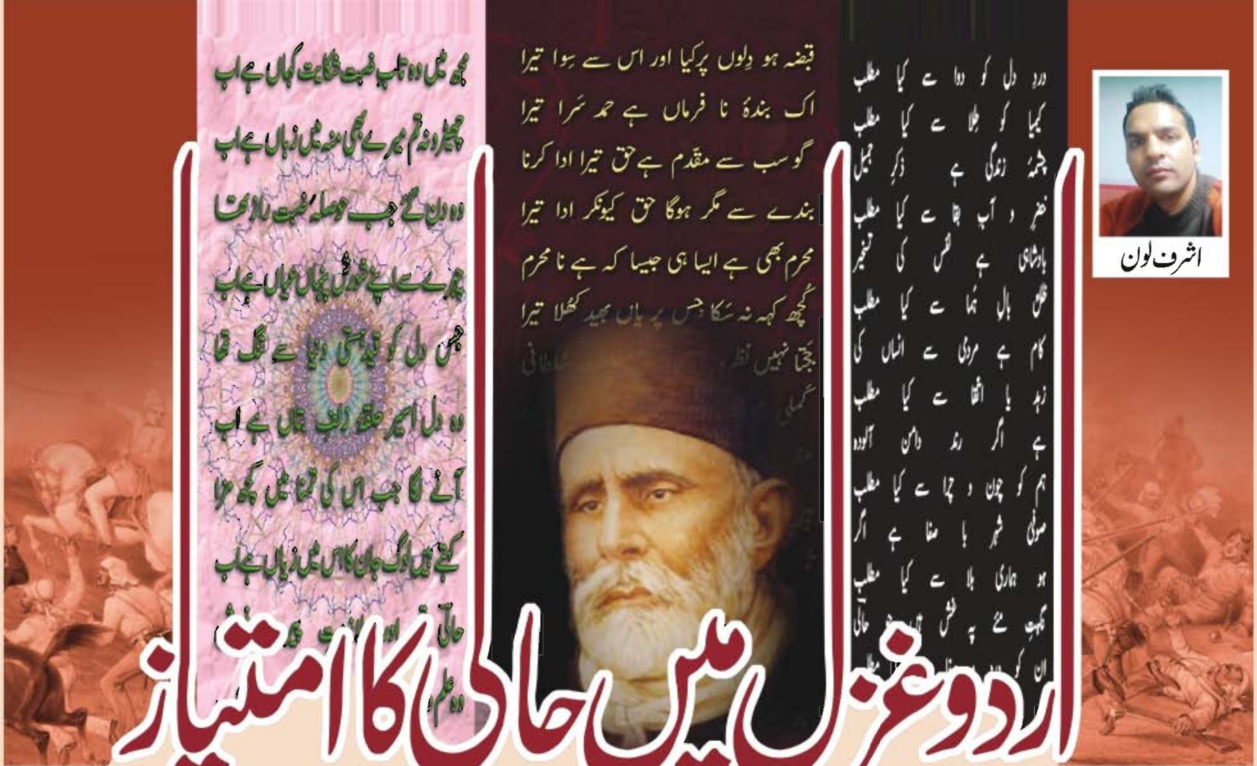

اشرف لون

اردو غزل میں حالی کا امتیاز

1857 کی بغاوت سیاسی حوالے سے ناکام ہوئی لیکن ناکام بغاوت نے آنے والے زمانے میں ہندوستانی زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہیں سے جدید ہندوستان کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ مغل سلطنت کا پوری طرح خاتمہ اور برطانوی سامراج کے استحکام کا اثر ہندوستان کی تہذیبی، تمدنی اور علمی وادبی میدانوں میں دن بہ دن بڑھتا جارہا تھا۔ ہندوستان میں اب نئے دور کا آغاز ہورہا تھا۔ مشرقی اقدار پر مغربی سحر تیزی سے اثر انداز ہورہا تھا۔ اسی دوران میں سرسید اور اُن کے رفقا جن میں محسن الملک، نذیر احمد، الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد قابلِ ذکر ہیں، آسمان ادب پر نمودار ہوئے۔ علمی وادبی میدانوں میں اجتہاد کی داغ بیل پڑ رہی تھی اور ایک نیا فکری دبستان تشکیل پا رہا تھا۔ ادب میں ہر نئے تجربے اور تبدیلی کا کھلے دل اور جوش کے ساتھ خیر مقدم ہورہا تھا۔ فراق گورکھپوری فرماتے ہیں:

''انگریزی راج یوں تو 1857 کے غدر کے پہلے ہی قائم ہو چکا تھا لیکن 1857 کے بعد ملک بھر کو اس کا احساس ہوا کہ گویا ہم سے کوئی چیز چھین لی گئی ہے اور ادب میں یہ احساس حالی اور ان کے ہم عصروں (شبلی، آزاد، نذیر احمد، سرشار) کے کارناموں میں کارفرما نظر آتا ہے۔ اب پہلے پہل ادب برائے ادب کا نظریہ ادب برائے زندگی کے نظریے سے بدلتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور زندگی بھی محض وجدانی یا داخلی زندگی نہیں بلکہ عملی، کاروباری، سماجی اور ملی زندگی۔ حالی اور ان کے رفقا نے ادب میں افادی پہلو پیدا کیے اور ان افادی پہلوؤں کو اجاگر کرنا شروع کیا۔[1]

حالی اردو ادب میں تنقید اور سوانح نگاری کے بنیاد گزار ہیں۔ انھوں نے اچھی شاعری بھی کی لیکن شاعر اور سوانح نگار کی بہ نسبت وہ بطور نقاد زیادہ مشہور ہیں۔ حالی نے قصیدے بھی کہے اور غزلیں اور نظمیں بھی۔ حالی کی شاعری میں ہمیں سادگی ملتی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں بے جا تکلف اور مبالغہ آرائی سے پرہیز کیا۔ زندگی کے سیدھے سادے تجربات کو اپنی غزلوں اور نظموں میں جگہ دی۔

1857 کے غدر کے وقت حالی کی عمر تقریباً بیس برس کی تھی۔ یہ انحطاط اور تیزی سے بدلتی ہوئی فضا کا دور تھا۔ حالی نے اسی انحطاطی دور میں آنکھ کھولی۔ حالی ایک بیدار ذہن کے مالک تھے۔ بقول آل احمد سرور ''حالی چاہتے تو جذبات کی چلتی پھرتی تصویریں کھینچ سکتے تھے اور اسی میں خوش رہ سکتے تھے۔ مگر زندگی اور ماحول کے مطالعے سے انہیں فکر روشن عطا ہوئی تھی''[2] قوم کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر انھیں کافی دُکھ ہوا۔ شاعری سے وہ اصلاح کا مطالبہ کرنے لگے۔ حالی نے جو غزلیں کہیں اُن میں انھوں نے ہمیشہ اپنی قوم کی اصلاح اور سماجی مقصد کو پیش نظر رکھا۔ انھوں نے عموماً اپنی غزلوں میں سادہ زبان استعمال کی۔ قومی اور ملی مسائل پر حالی نے طبع آزمائی کی۔ تمدنی اور تہذیبی حالات، اخلاقی اور معاشرتی مسائل کو انھوں نے اپنی شاعری میں بڑی دلچسپی سے پیش کیا:

ہو گئے ہیں ہم ہی کچھ اور آج کل
یا زمانہ ہی یارب گیا بدل
رہ گئے ہیں کچھ کچھ آثار سلف
اور بھی ہونا ہے شاید مبتدل
تقلید قوم ہی پر گرہے مدار تحسین
تو ہم نے دوستوں کی تحسین سے ہاتھ اُٹھایا

حالی کی غزل کے متعلق فراق گورکھپوری ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اردو ادب کی تاریخ میں حالی پہلا شخص ہے جس نے غزل کو سماجی اور اجتماعی زندگی سے متعلق مسائل وخیالات کا آلۂ اظہار بنایا۔ دربار اور درباری ماحول، محض انفرادی زندگی وجذبات، جاگیردارانہ نظام کی فضا ونفسیات کو حالی کی غزل الوداع کہہ رہی ہیں۔ حالی ہندوستان اور اردو ادب کی تاریخ میں ایک درمیانی اور عبوری دور کا شاعر ہے۔[3]

حالی نے اپنی تنقید میں اردو شاعری بالخصوص غزل پر توجہ صرف کی۔ انھوں نے سب سے زیادہ زور اسی بات پر دیا کہ ہمارے شعرا کو غزل کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ اردو ادب میں یہ نئی بات تھی۔ اس سے پہلے مشکل ہی سے کسی نے غزل کی اصلاح کی بات کی ہو۔ حالی نے اس سلسلے میں عملی ثبوت بھی فراہم کیے۔ انھوں نے غزل میں نئے نئے مضامین داخل کیے جنھیں اب تک معیوب سمجھا جاتا تھا۔ حالی نے غزل کو قافیہ پیمائی سے نکال کر حقیقی احساسات اور جذبات کا ترجمان بنایا۔ اُن کی غزل محض عشق وعاشقی کے جذبات کے اظہار تک محدود نہیں بلکہ اس میں قومی درد اور دوسرے سماجی معاملات در آئے ہیں۔ حالی نے نئے اور اچھوتے مضامین کو غزل میں داخل کیا اور اس طرح غزل کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔

حالی گہرا سیاسی اور سماجی شعور رکھتے تھے اور اس کی جھلکیاں اُن کی غزلوں میں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ اپنے ملک و قوم کے حالات کے پیش نظر انھوں نے غزل میں مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کی اور اردو غزل کو نئے آہنگ سے

روشناس کرایا۔غزل گوئی میں اُن کا رویہ اجتہادی تھا۔مندرجہ ذیل اشعار سے حالی کے اجتہادانہ ذہن کی عکاسی ہوتی ہے:

داستاں گُل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رُلانا ہرگز

یارانِ تیز گام نے منزل کو جالیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

میخانے کی خرابی جی دیکھ کر بھر آیا
مدت کے بعد کل واں جانکلے تھے قضارا

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

حالی کے لہجے میں ایک طرح کے ٹھہراؤ کا احساس ہوتا ہے۔وہ بڑی دھیمی لے میں اپنے دل کی بات کہتے ہیں۔اُن کے یہاں کوئی شور شرابہ نہیں اور نہ گن گرج۔انھوں نے غزل میں لطافت و دلکشی پیدا کی۔ اُن کی غزلوں میں زندگی ہے زندگی سے فرار نہیں۔اُن کی غزلوں میں پاکیزہ عشقیہ جذبات کی ترجمانی ہوئی ہے اور اس میں تلذذ نہیں۔ حالی اپنی غزل میں تصنع اور تکلف کو روا نہیں رکھتے بلکہ سیدھے سادے الفاظ میں اپنے دل کی بات کہتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

”جن کیفیات کا بیان حالی نے اس سلسلے میں کیا وہ زندگی سے بھر پور ہیں۔ان میں اصلیت ہے، واقعیت ہے حقیقت ہے۔ وہ سادہ ضرور ہیں لیکن ان کی سادگی ہی میں ایک پرکاری ہے۔حالی نے اس میں بڑا ستھرا پن پیدا کیا ہے۔نفاست اور لطافت کا رنگ بھرنے کی پوری کوشش کی ہے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔“[4]

حالی نے وارداتِ قلبی کو بڑے ہی خلوص کے ساتھ اپنی غزلوں میں بیان کیا ہے۔حالی غزل کہتے ہوئے اپنی تہذیب اور معاشرتی روایات کا خیال رکھتے ہیں۔وہ جس سماج سے تعلق رکھتے ہیں اُس سماج کے پس منظر کے اثرات اُن کی غزلوں میں صاف دیکھے جاسکتے ہیں۔انھوں نے اپنے جذبات کے اظہار میں ایک توازن اور نظم وضبط کا ثبوت دیا ہے:

دھوم تھی اپنی پارسائی کی
کی بھی اور کس سے آشنائی کی

منہ کہاں تک چھپاؤ گے ہم سے
تم کو عادت ہے خود نمائی کی

کہتے ہیں طبع دوست شکایت پسند ہے
ہم شکوہ ہائے دوست بھی تحریر کر چکے

آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پا گئے ہیں آپ کے طرزِ بیاں سے ہم

حالی نے ان اشعار میں عشقیہ جذبات کو بڑے ہی سادہ لفظوں میں بیان کیا ہے۔ان میں ایک طرح کے ستھرے پن اور سادگی کا احساس ہوتا ہے۔ان میں بناوٹ نہیں بلکہ حقیقت و واقعیت یہاں ہم آہنگ ہوتی نظر آتی ہے اور حالی کا یہ ایک کارنامہ ہے اور یہی ان کی جدت ہے۔حالی نے جدت کی اس روایت کو آگے بڑھایا اور اُن کا یہ قدم شعوری تھا۔انھوں نے اپنی غزلوں سے اس دور میں جدت کی ایک فضا قائم کی جس کی تقلید بعد میں بہت سے شاعروں نے کی اور غزل ایک محدود سانچے سے نکل کر نئے نئے میدانوں میں قدم رکھنے لگی۔

حالی نے غزل میں نئے نئے مضامین داخل کیے۔حالی سے پہلے ہمیں غزل میں یہ مضامین نہیں ملتے۔انھوں نے ان مضامین کو اپنے مخصوص لہجے اور انداز میں بیان کیا۔ان میں توانائی کی ایک لہر موجزن ہے۔اُن کا لہجہ فطری ہے۔اس میں بناوٹ یا تصنع نہیں اور نہ ہی ظاہری رکھ رکھاؤ۔ان کا اُسلوب اپنا ہے۔وہ نقالی یا تقلید کے قائل نہیں بلکہ تقلید کو شاعری کے لیے مضر خیال کرتے ہیں۔حالی نے اپنی اختراعی ذہانت سے غزل میں ایسے تجربے کیے جو اس سے پہلے مفقود تھے:

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

مرے دل میں ہو گر مجھ سے نہاں ہو
مجھے بھی ڈھونڈ لینا تم جہاں ہو

ہے لباس جسم تک مجھ پر گریزاں
دور جا پہنچی ہے عریانی مری

حالی نے غزل کی ہیئت میں بھی تجربے کیے۔وہ اس بات سے باخبر تھے کہ لکھنؤ میں خارجیت کے زیر اثر غزل کی ہیئت کو بہت نقصان پہنچا ہے۔دبستان لکھنؤ کے زیر اثر غزل میں خارجیت زیادہ در آئی تھی اور غزل محض الفاظ کی بازی گری تک محدود ہوگئی تھی۔حالی نے غزل کی اس زبوں حالی کو محسوس کیا۔انھوں نے اپنے تنقیدی مضامین اور اپنی غزلوں کے ذریعے غزل کو اس قعرِ مذلت سے باہر نکالنے کی کوشش کی۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ حالی شاعری میں صرف معنی کے قائل نہیں بلکہ اُس کے جمالیاتی پہلو کو بھی بڑی اہمیت دیتے ہیں۔انھوں نے روایت کی پاسداری کرتے ہوئے غزل میں نئے تجربات کیے۔دراصل وہ موضوع اور مواد کی موافقت کے قائل نظر آتے ہیں۔غزل کے مضامین کو وسعت دینے سے ان کا مطلب یہی تھا کہ اس طرح غزل کی ہیئت میں وسعت پیدا ہوگی۔حالی کی ان کوششوں سے غزل کی ہیئت میں نمایاں تجربے ہوئے اور ساتھ ہی اُن کی کوششوں نے اس کا صحیح شعور بیدار کیا۔غزل میں نئے نئے الفاظ، نئی نئی ترکیبوں کا چلن عام ہوا اور اس نے غزل کے ایک نئے آہنگ اور انداز کو جنم دیا۔

حالی نے غزل کی ہیئت میں بھی تجربے کیے۔وہ اس بات سے باخبر تھے کہ لکھنؤ میں خارجیت کے زیر اثر غزل کی ہیئت کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ دبستان لکھنؤ کے زیر اثر غزل میں خارجیت زیادہ در آئی تھی اور غزل محض الفاظ کی بازی گری تک محدود ہو گئی تھی۔حالی نے غزل کی اس زبوں حالی کو محسوس کیا۔انھوں نے اپنے تنقیدی مضامین اور اپنی غزلوں کے ذریعے غزل کو اس قعر مذلت سے باہر نکالنے کی کوشش کی۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ حالی شاعری میں صرف معنی کے قائل نہیں بلکہ اُس کے جمالیاتی پہلو کو بھی بڑی اہمیت دیتے ہیں۔انھوں نے روایت کی پاسداری کرتے ہوئے غزل میں نئے تجربات کیے۔

حالی کا یہ کہنا کسی حد تک صحیح ہے کہ جوں جوں ہم شاعری میں نئے نئے مضامین داخل کرتے جائیں گے ویسے ہی ہماری شاعری میں بھی ہیئت کے نئے تجربے سامنے آئیں گے۔

حالی نے اپنی غزلوں میں قومی مسائل کو جگہ دی۔ان کی غزل صرف حسن وعشق کے ذکر تک محدود نہیں بلکہ اس میں زندگی کے دوسرے مسائل کی بھی تصویر کشی ہوئی ہے۔ان کے موضوعات کا دائرہ وسیع ہے۔قومی، ملکی، تہذیبی اور اخلاقی موضوعات کو حالی نے غزل میں بڑی خوبصورتی سے داخل کیا۔وہ اپنے قدما سے متاثر نظر آتے ہیں لیکن انھیں لکیر کا فقیر بننا پسند نہیں۔انھوں نے اپنا لہجہ اور طرز خود متعین کیا۔انھوں نے زبان وبیان کے بھی چند تجربے کیے:

جس کا تو قاتل ہو پھر اس کے لیے
کونسی نعمت ہے خنجر سے لذیذ

قند سے شیریں تری پہلی نگاہ
دوسری قندِ مکرر سے لذیذ

حالی نے جس دور میں غزل گوئی شروع کی اس وقت ہندوستان کی سیاسی وسماجی حالت دگرگوں تھی۔عوام الناس مایوسی کے شکار تھے۔ حالی کو اپنے قوم کی بگڑی حالت دیکھ کر بہت رنج ہوا۔حالی نے دیکھا کہ ادب بھی زوال پذیر اور انحطاط کا شکار ہے۔ادب بالخصوص شاعری میں صرف سوقیانہ خیالات اور سفلی جذبات کی عکاسی ہورہی تھی۔ وہ ادب کی اصلاح پر کمربستہ ہوئے۔اپنی غزلوں میں انھوں نے قوم کی بگڑی حالت کے مرثیے بھی سنائے اور قوم کے اندر غیرت وحمیت واپس لانے کی بات بھی کی۔اُن کو ہر وقت قوم کی فکر ستاتی رہی۔ وہ قوم کو اپنی کھوئی ہوئی عظمت واپس دلانا چاہتے تھے:

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اُٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا
کیا منعموں کی دولت کیا زاہدوں کا تقویٰ
جو گنج تو نے تاکا اُس کو لُٹا کے چھوڑا

حالی عشق کے خلاف نہیں بلکہ عشق کے روایتی تصور کے خلاف ہیں۔اُن کے یہاں عشق کا ایک پاکیزہ تصور پایا جاتا ہے۔ انھوں نے حسن وعشق کے موضوعات کو بھی اپنایا لیکن انھوں نے اس کے مفہوم کو وسعت سے آشنا کیا۔وہ عشق کے روایتی اور فرسودہ تصور کے قائل نہیں۔ انھوں نے عشق کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کی۔عشق کی مختلف واردات وکیفیات ان کی غزلوں میں پیش ہوئی ہیں۔مندرجہ ذیل اشعار سے اُن کی جولانی طبع کا احساس ہوتا ہے:

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت
پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت
یاران تیز گام نے منزل کو جا لیا
ہم محو نالۂ جرسِ کارواں رہے
دھوم تھی اپنی پارسائی کی
کی بھی اور کس سے آشنائی کی

ان اشعار میں عشق کی لطیف کیفیات کا عکس صاف دیکھا جا سکتا ہے۔لیکن ان لطیف کیفیات کی تصویر کشی بڑی سادگی اور سلاست کے ساتھ کی گئی ہے۔ یہاں کوئی مشکل پسندی نہیں، کوئی پیچیدگی نہیں، کوئی تصنع نہیں۔ان اشعار میں کوئی سپاٹ پن نہیں بلکہ پرکاری کا احساس ہوتا ہے۔ ان اشعار میں ایمائیت ورمزیت اور غنائی کیفیت ہے اور غزل کی روایت کی پاسداری بھی۔

حالی نے مسلسل غزلیں بھی کہی ہیں۔ان غزلوں میں جہاں انھوں نے حسن وعشق کی واردات کو ایک نئے آہنگ اور ڈھنگ سے پیش کیا ہے وہیں قومی اور ملکی مسائل کی بھی ان غزلوں میں تصویر کشی کی گئی ہے۔ایسی ہی ایک غزل حالی نے دہلی کی تباہ حالی پر کہی ہے جس میں انھوں نے اپنے دل کی واردات کے ساتھ ساتھ دوسروں کے دل پر اس تباہ حالی سے کیا گزری، اس کو بھی بیان کیا ہے۔قدیم دہلی کی تباہی اور اس تباہی سے ایک تہذیب کے ختم ہونے نے کس طرح دلوں کو زخمی کیا اور احساسات وجذبات کو ٹھیس پہنچائی اور بے سکونی کی ایک فضا کو جنم دیا،اس غزل میں یہی کچھ بیان ہوا ہے:

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سُنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
داستان گُل کی خزاں میں نہ سُنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رُلانا ہرگز
صحبتیں اگلی مصور! ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دورِ زماں

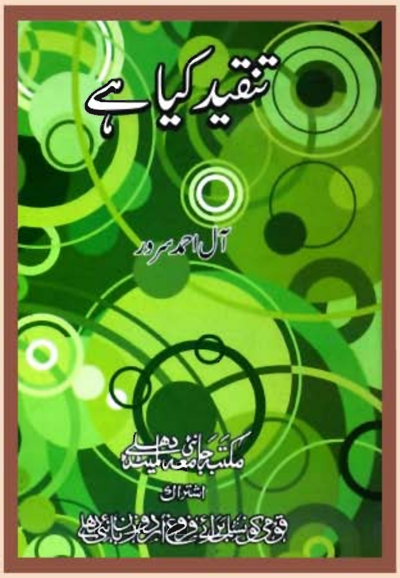

نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطفِ شبانہ ہرگز
بزمِ ماتم تو نہیں ، بزمِ سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رُلانا ہرگز

اس غزل میں حالی جہاں دہلی کی تباہ حالی پر روتے نظر آتے ہیں وہیں خود پر طنز بھی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ کبھی ہمارے بھی بخت بیدار تھے اور ہمیں بھی بادشاہت نصیب تھی لیکن اب ہمیں سونے کا موقع ملا ہے۔اس لیے ہم کو نیند سے نہ جگایا جائے۔ غزل میں حالی نے ذاتی احساسات کے ساتھ ساتھ اجتماعی کیفیت کا ذکر بھی کیا ہے اور یہ غزل میں نئی چیز تھی۔ اس سے پہلے اردو غزل میں یہ رنگ نہیں پایا جاتا۔اختر انصاری اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

’’حالی سے پہلے یہ اجتماعی رنگ یا اجتماعی احساس اردو غزل میں نہ ہونے کے برابر تھا، اور اگر تھا تو بہت دھندلا اور بہت مدہم۔حالی نے سب سے پہلے سماجی اور قومی احساس کو کسی حد تک اپنی غزل میں اور بڑی حد تک اپنی قومی و وطنی نظموں میں داخل کیا۔[5]

حالی نے نہ صرف اپنی تنقید سے بلکہ اپنی غزل گوئی سے بھی غزل کی دنیا میں انقلاب برپا کیا۔موضوعات کی وسعت اور طرز ادا کے اعتبار سے اُن کی غزلوں کی اپنی ایک الگ اہمیت ہے۔لیکن کہیں کہیں ان سے چوک بھی ہوئی ہے اور وہ ہر جگہ غزل کا رچا ہوا انداز برقرار نہیں رکھ سکے اور یہاں پر واعظ وناصح نظر آتے ہیں خصوصاً قومی اور ملکی مسائل کا ذکر کرتے ہوئے حالی غزل کے بنیادی خصائص کو بھول جاتے ہیں اور اُن غزلوں میں ایک طرح کے روکھے پن کا احساس ہوتا ہے:

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ
مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ
معنی کا تم نے حالی دریا ہے گر بہایا
یہ تو بتائیں حضرت کچھ کر کے بھی دکھایا
اتنی ہی دشوار اپنے عیب کی پہچان ہے
جس قدر کرنی ملامت اور کو آسان ہے

حالانکہ حالی کے ان اشعار میں غزل کا جیسا ربط اور رچاؤ نہیں پایا جاتا لیکن اس میں حالی کا اتنا قصور نہیں جتنا اس ادبی روایت کا ہے جو حالی کو ورثے میں ملی تھی۔دوسرے یہ کہ حالی کو شاید اپنے کلام پر نظر ثانی کی مہلت نہیں ملی کیوں کہ اُن کا دور ایک ہنگامی دور تھا۔حالی اور اس کے رفقا کے پاس وقت کم تھا اور کام زیادہ تھے۔اس تناظر میں اگر ہم حالی کی شاعری کا جائزہ لیں تو بہت سے اعتراضات کا خود بخود جواب مل جاتا ہے۔

حالی نے اردو غزل کے تخلیقی اظہار میں انفرادیت اور اجتماعیت اور ہیئت ومعنی کو یک جان کیا۔عشق وحسن کے جذبات اور تہذیب وسیاست کے مرقعے ان کی غزلوں میں گلے ملتے ہیں۔

حواشی:

1. فراق گورکھپوری، اندازے (الہ آباد، ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس، 1944)ص 217
2. آل احمد سرور، تنقید کیا ہے (نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 2004) ص16
3. فراق گورکھپوری، اندازے، ص281
4. ڈاکٹر عبادت بریلوی، غزل اور مطالعہ غزل (علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، 2005)ص485
5. اختر انصاری، غزل اور غزل کی تعلیم (نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2001)ص180

Ashraf Lone.,209, Jhelum Hostel, JNU,
New Delhi - 110067

محمد طاہر

موازنۂ حالی وشبلی

ہندوستانی تاریخ میں سرسید کے ساتھ ہی حالی وشبلی کے نام وکارناموں کوبھی آب زر سے تحریر کیا جائے گا کہ انھوں نے ایک ایسی قوم کوپستی کے گڈھے سے نکالنے کا بیڑا اٹھایا جو دین ودنیا سے بے خبرآپس میں ہی دست وگریباں تھی۔ حال یہ تھا کہ جب دنیا کے لوگ راکٹ اڑا رہے تھے تو یہ قوم پتنگ اڑا رہی تھی اور یوروپین اقوام جب پوری دنیا پر اپنی فتح کا جھنڈا نصب کرنے کے فراق میں تھیں تو یہ قوم بٹیر بازی اور مرغ بازی کے مزے لے رہی تھی۔ جب انگریز قوم سازش کا ایک ایسا جال بننے کی فکر میں تھی کہ پوری دنیا کا نظام اپنے ہاتھوں میں لے کر سب کو بے دست وپا کر سکے تو اس زمانے میں ہماری قوم تعصب، تنگ نظری، فرقہ بندی اور مسلکی اختلافات کو بڑھانے میں لگی ہوئی تھی اور ایک دوسرے کے خلاف زہر افشانی اور مناظرے کو ہی زندگی کا اصل کمال سمجھ بیٹھی تھی۔

آج حالی وشبلی کی وفات کے سویں سال میں انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے جب ہم ماضی کے اوراق الٹتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ سوسالہ تاریخ کے طویل فاصلے میں کوئی ایسی جامع الکمالات شخصیت نظر نہیں آتی جو ان بزرگوں کی ہم سری کی دعویدار ہو یا کم از کم ان کی طرح بے ریا بے لوث مخلص کامران اور قدآور نظر آسکے۔

حالی وشبلی ایک ہی سکہ کے دورخ ہیں۔ اسی لیے سکے کی دونوں جانب دومختلف تصاویر ہونے کے باوجود ان کے اندر بے شمار مماثلتیں نظر آتی ہیں۔ مثلاً حالی وشبلی دونوں ہم عصر سرسید کے صحبت یافتہ اور علی گڑھ کے پرداختہ تھے۔ دونوں ماہر تعلیم اور مصلح قوم تھے۔ دونوں علمی نثر لکھنے والے انفرادی اسلوب کے مالک تھے۔ دونوں عربی و فارسی زبانوں پہ دسترس رکھنے والے مشرقی علوم کے ماہر تھے۔ دونوں مقالہ نگار، سوانح نگار، تنقید نگار اور نثر کی دوسری اصناف میں یدطولیٰ ہونے کے ساتھ ہی اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر بھی تھے۔ تاہم ان تمام مماثلتوں کے باوجود دونوں کی عمر، طبیعت، سوچ اور فکر میں جو جزوی اختلاف تھا اس کو بعض حاسد اور کوتاہ بین لوگ تضاد سمجھ بیٹھے۔

شبلی حالی سے عمر میں بیس برس چھوٹے تھے۔ پھر اعظم گڑھ سے تعلق شاعرانہ مزاج اور رگوں میں راجپوتانہ خون، ان سب نے انھیں انتہائی تنک مزاج جوشیلا اور جذباتی بنا دیا تھا۔ حالی کم سخن تھے اور انکساری خاکساری اور منکسر المزاجی ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ حالی عمر اور اخلاقیات میں شبلی سے کہیں بڑے تھے اس فرق کو نشان زد یوں بھی کیا جاسکتا ہے کہ جب حالی کی تصانیف کو شبلی نے مدلل مداحی اور کتاب المناقب قرار دیا تو بھی حالی کبیدہ خاطر نہ ہوئے بلکہ پوری عمر شبلی کی تمام تصانیف کی ستائش ہی کرتے رہے اور شبلی کی فارسی شاعری کے متعلق تو یہاں تک کہہ دیا کہ

''غزلیں کا ہے کو ہیں شراب دوآتشہ ہے جس کے نشے میں خمار چشم ساقی ملا ہوا ہے غزلیات حافظ کا وہ حصہ جو رندی و بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے ممکن ہے اس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو مگر خیالات کے اعتبار سے تو یہ غزلیں اس سے بھی زیادہ گرم ہیں''۔

اور مزید یہ کہ:

''میرا ارادہ تھا کہ اپنا فارسی کلام نظم ونثر جو کچھ ہے اس کو چھپوا کر شائع کر دوں مگر دستہ گل دیکھنے کے بعد میری غزلیں خود میری نظر سے گر گئیں۔'' نفسیات اور مزاج کے اس فرق کی نشاندہی خورشید الاسلام نے بھی کی ہے۔ انہی کے لفظوں میں:

''شبلی کو اپنی بڑائی کا احساس بھی اتنا ہی تھا جتنا غالب کو۔ شبلی میں وہ گداز نہیں جو حالی میں ہے مگر اس کے باوجود شبلی کی زندگی حالی سے زیادہ بیدار، بھرپور اور رنگا رنگ تھی۔ خالص روحانی اعتبار سے حالی پہلے گوتم بدھ ہیں جو مسلمانوں میں پیدا ہوئے اور شبلی اول اور آخر یونانی تھے۔''

حالی اور شبلی کے مزاج کے اسی فرق کا پرتو ان کی تصانیف میں جابجا نظر آتا ہے۔ حالی شعروادب میں افادیت کا مطالبہ کرتے ہیں یعنی ان کے نزدیک شاعری کا اصل کام اخلاق کو درست کرنا اور زندگی کو سنوارنا ہے جبکہ شبلی کے نزدیک شاعری کا اصل مقصد پڑھنے یا سننے والے کو فرحت وانبساط عطا کرنا ہے۔ اس جزوی اختلاف کے علاوہ دونوں کے افکار میں ہر مقام پر ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ لیکن اس پورے تناظر میں جو چیز سب سے حیرت انگیز ہے وہ یہ کہ شبلی کی اردو شاعری ان کے تصور شعر سے بالکل مختلف اور حالی کے نظریہ شاعری سے قریب تر ہے۔

حالی وشبلی دونوں اپنے عہد کے اردو شعر وادب کے سرمایے سے غیر مطمئن اور مایوس تھے۔ دونوں کا اس بات پر اتفاق تھا کہ اگر اردو ادب کی بوسیدہ عمارت میں افکار نو کے دریچے وا نہیں کیے گئے تو اردو شعرا حبس دم کا شکار ہو کر موت کی آغوش میں چلے جائیں گے۔ اسی لیے حالی اور شبلی دونوں نے اپنے اپنے طور پر شعروادب اور اردو شعرا کی ذہنی تربیت اور رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔

حالی نے اپنی شاعری پر مبسوط مقدمہ لکھا ہے جو 1893 میں مقدمہ شعروشاعری کے نام سے شائع ہوا۔ یہ صرف کتاب کا مقدمہ نہیں تھا بلکہ اس میں اردو شاعری کے تمام معائب اور شعرا کے تمام گناہوں اور جرائم کو بے نقاب کر کے ادب کی عدالت میں ان پر مقدمہ قائم کیا گیا تھا۔ کتاب کی اشاعت کے ساتھ ہی مخالفتوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور حالی کو خیالی اور ڈفالی جیسے الفاظ سے نوازا گیا اور اودھ پنچ میں باقاعدہ محاذ قائم کر کے ''ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے'' کے عنوان سے ان کے خلاف زہر افشانی کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ لیکن جب مخالفت کا دور ختم ہوا تو ان کی خدمات پر سنجیدگی سے غور کیا گیا۔ اور پھر بابائے اردو مولوی عبدالحق جیسے لوگوں نے ان کی کتاب کو اردو تنقید کا پہلا نمونہ اور پروفیسر آل احمد سرور جیسے ناقدوں نے اس کتاب کو اردو شاعری کا پہلا منشور قرار دیا۔ یہی نہیں کلیم الدین احمد جیسے سخت مزاج ناقد کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ:

''اردو تنقید کی ابتدا حالی سے ہوتی ہے۔ پرانی تنقید محذوف ومقصور کے جھگڑوں اور زبان ومحاورات کی صحت اسناد کی ہنگامہ آرائی تک محدود تھی۔ حالی نے سب سے پہلے جزئیات سے قطع نظر کر کے بنیادی اصول پر غور کیا۔ شعروشاعری کی ماہیت پر کچھ روشنی ڈالی ہے اور مغربی خیالات سے استفادہ کیا۔ اپنے ماحول اپنے زمانے اپنے حدود میں حالی نے جو کچھ کیا وہ بہت تعریف کی بات ہے۔ وہ اردو تنقید کے بانی بھی ہیں اور اردو کے بہترین نقاد بھی ہیں۔ (اردو تنقید پر ایک نظر کلیم الدین احمد، ص 89)

حالی وشبلی کے دور کو اردو کا عہد زریں تسلیم کیا جاتا ہے۔ مہدی افادی نے ان دونوں کا شمار اردو کے عناصر خمسہ میں کیا ہے۔ ان کے عہد میں اردو شاعری وادب کی مختلف اصناف کے سوتے ابل پڑے۔ ان سے قبل علمی مقالات، خاکہ نگاری، سوانح نگاری، موازنہ نگاری، سیرت نگاری اور تنقید نگاری جیسے بیش قیمت موتیوں سے اردو ادب کا دامن خالی تھا۔ حالی وشبلی سے قبل تذکروں میں تنقید کے خال خال نمونے نظر آتے ہیں۔ جہاں ذاتی پسند وناپسند کو ہی معیار تسلیم کر لیا گیا تھا اور جسے تنقید کا نام دینے میں بھی تامل ہوتا ہے۔ حالی وشبلی نے تنقید کے اصول، ضابطے اور معیار مقرر کیے جہاں سے اردو تنقید کے سفر کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ اس سے قبل تذکروں میں جو تنقیدی نمونے موجود تھے ان کے متعلق کلیم الدین احمد نے لکھا ہے کہ:

''یہ تنقید محض سطحی ہے۔ اس کا تعلق زبان، محاورہ اور عروض سے ہے۔ لیکن یہ شاید کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ تنقید کی ماہیت اور اس کے مقاصد اس کے صحیح اسلوب سے بھی تذکرہ نویس واقفیت نہ رکھتے تھے۔ ان تذکروں کی تاریخی اہمیت ہے اور دنیائے تنقید میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ شاید یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ تاریخی اہمیت اور تنقیدی اہمیت میں مشرقین کا فرق ہے۔ (اردو تنقید پر ایک نظر: کلیم الدین احمد، ص 31)

حالی نے مقدمہ شعروشاعری کے ذریعے تنقید کے معیار اور اصول مقرر کرنے کے ساتھ ہی اپنے دور کی شاعری کی مختلف اصناف کی خامیوں اور نقائص کی نشاندہی کر کے عملی تنقید کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔ حالی نے اپنے عہد کے دو عظیم دانشوروں غالب اور شیفتہ سے اکتساب فیض کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ اپنی غیر معمولی صلاحیت اور مطالعہ اور عربی ادب کے سرمائے بالخصوص جاہلی دور، دور اسلام، عہد اموی اور عہد عباسی کے مروجہ تنقیدی مباحث اور شعروسخن کے مسائل کے ساتھ ہی حسب استطاعت بعض یوروپی مفکرین اور دانشوران سے بھی استفادہ کر کے اپنی تنقیدی بحث کو پر مغز بنایا ہے۔

حالی نے مقدمہ شعروشاعری میں جن باتوں کو بڑی وضاحت سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے ان میں یہ بھی ہے کہ ان کے نزدیک شاعری کرنے کے لیے شعر میں ایسی خصوصیات ہونی چاہیے جو اسے غیر شعر سے الگ کر دے۔ اس کے لیے وہ تین شرائط کا ذکر کرتے ہیں یعنی تخیل، مشاہدۂ کائنات اور تفحص الفاظ۔ شبلی تخیل کو قوت اختراع کا نام دیتے ہیں۔ حالی نے تخیل مشاہدۂ کائنات اور تفحص الفاظ پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ تخیل کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

وہ ایک قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ جو تجربہ یا مشاہدہ کے ذریعے سے ذہن میں پہلے سے مہیا ہوتا ہے یہ اس کو مکرر ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشتی ہے اور پھر اس کو الفاظ سے ایسے دلکش پیرایہ میں جلوہ گر کرتی ہے جو معمولی پیرایوں سے بالکل الگ یا کسی قدر الگ ہوتا ہے۔ (مقدمہ شعروشاعری :الطاف حسین حالی، ص 114)

مشاہدہ کائنات کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

کمال حاصل کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ نسخہ کائنات اور اس میں سے خاص کر نسخہ فطرت انسان کا مطالعہ نہایت غور سے کیا جائے۔ انسان کی مختلف حالتیں جو زندگی میں اس کو پیش آتی ہیں ان کو تعمق کی نگاہ سے دیکھنا۔ (مقدمہ شعروشاعری: الطاف حسین حالی، ص 116)

شاعری کے لیے تیسری اہم چیز تفحص الفاظ ہے۔ حالی کے نزدیک اگر شاعر شعر کہتے وقت الفاظ کا تتبع اور تفحص نہیں کرتا تو محض قوت متخیلہ اور مطالعہ کائنات اس کے کچھ کام نہیں آسکتے ان کے نزدیک شاعر کو لفظوں کا انتخاب ایک ماہر جوہری کی طرح اس طرح کرنا چاہیے کہ شاعر کا مدعا آسانی سے سامعین یا قارئین تک پہنچ سکے۔

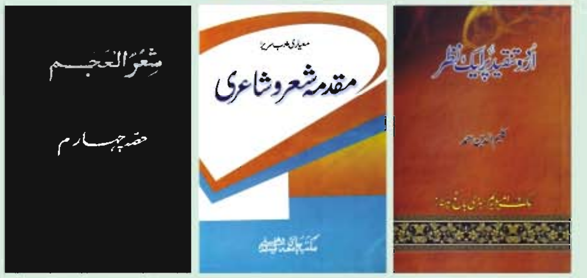

حالی تفحص الفاظ کی بحث کے ساتھ ہی آمد اور آورد کی بحث کو بھی چھیڑتے ہیں۔ حالی کا خیال ہے کہ شعر کی بے ساختگی، برجستگی، سلاست اور روانی کا معاملہ آمد سے نہیں آورد سے ہے اس سلسلے میں انھوں نے عربی ناقد ابن رشیق کی کتاب العمدہ سے دلیل بھی پیش کی ہے۔

حالی کے نزدیک قافیہ، ردیف اور وزن کا التزام شعر کے لیے ضروری نہیں۔ لیکن یہ ضرور مانتے ہیں کہ وزن سے شعر کا اثر بڑھ جاتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

''اگرچہ قافیہ بھی وزن کی طرح شعر کا حسن بڑھا دیتا ہے جس سے اس کا سننا کانوں کو اچھا اور خوشگوار معلوم ہوتا ہے اور اس کے پڑھنے سے زبان زیادہ لذت پاتی ہے مگر قافیہ اور خاص کر ایسا جیسا کہ شعرائے عجم نے اس کو نہایت سخت قیدوں سے جکڑ بند کر دیا ہے اور پھر اس پر ردیف اضافہ فرمائی ہے شاعر کو بلاشبہ اس کے فرائض ادا کرنے سے باز رکھتا ہے۔ جس طرح صنائع لفظی کی پابندی معنی کا خون کر دیتی ہے اسی طرح بلکہ اس سے بہت زیادہ قافیہ کی قید ادائے مطلب میں خلل انداز ہوتی ہے۔ (مقدمہ شعروشاعری: الطاف حسین حالی، ص 108)

ان بحثوں کے بعد حالی نے شعر کی خوبی کے لیے تین اور شرطوں کا ذکر کیا ہے یعنی سادگی جوش اور اصلیت۔ حالی کا یہ نظریہ جان ملٹن سے مستعار ہے۔ حالی کے نزدیک سادگی سے مراد شعر سادہ اور آسان ہونا چاہیے تا کہ سننے والے کو اس کے سمجھنے میں دقت پیش نہ آئے جوش سے مراد حالی کی یہ ہے

کہ مضمون کو ایسے بے ساختہ الفاظ اور موثر انداز میں پیش کیا جائے جس سے معلوم ہو کہ شاعر نے اپنے ارادے سے مضمون نہیں باندھا ہے بلکہ خود مضمون نے شاعر کو مجبور کر دیا ہے کہ اسے بیان کیا جائے۔ ایسا شعر تاثیر سے لبریز ہوتا ہے۔ اصلیت سے ان کی مراد یہ ہے کہ جو موضوع پیش کیا جائے اس میں حقیقت اور واقعیت کا رنگ نظر آئے۔

لفظ و معنی میں کس کو کس پر ترجیح ہے حالی نے اپنے مقدمہ میں اس بحث کو بھی چھیڑا ہے۔ اس بحث کو سب سے پہلے عربی ناقد جاحظ نے اٹھایا تھا۔ حالی کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرتے لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ لفظ و معنی دونوں کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے باوجود وہ لفظ کو معنی پر ترجیح دیتے ہیں۔ الطاف حسین حالی نے اپنے مقدمہ کے ذریعے اردو تنقید کی تعمیر کا جو پہلا پتھر رکھا ہے اس پر آج ہماری تنقید کی عالی شان عمارت کی تعمیر ہوئی ہے اس لیے ان کی خدمات سے چشم پوشی کرنا ممکن نہیں ہے۔

حالی کے بعد ان کے معاصرین میں شبلی سب سے اہم اردو کے ناقد ہیں اور بقول احسن فاروقی اردو تنقید کے موجدوں میں حالی کے بعد ان کا نام ہمیشہ لیا جاتا رہے گا۔ شبلی کی اہمیت علمی بصیرت اور تنقیدی شعور کا ہر کوئی قائل ہے۔ حالی اور شبلی کے تنقیدی نظریات مختلف ہیں جس سے بعض حضرات کو یہ مغالطہ ہوا کہ شبلی کے اکثر و بیشتر خیالات حالی کی ضد ہیں۔

حالی کی طرح شبلی نے بھی شاعری کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا اور اپنے خیالات و نظریات کو بے حد مدلل انداز سے پیش کیا۔ شبلی کے تنقیدی تصورات ان کی تمام تصانیف میں بکھرے پڑے ہیں تاہم موازنہ انیس و دبیر اور شعر العجم ان کی خاص اور خالص تنقیدی تصانیف ہیں شبلی نے بھی زیادہ تر انہی بحثوں کا اٹھایا ہے جس پہ حالی نے خامہ فرسائی کی ہے۔ وہ بھی لفظ و معنی کی اولیت کی بحث، مبالغہ اور غلو شاعری میں ردیف و قافیہ اور وزن کی اہمیت اور آمد و آورد جیسے مسائل پر تفصیل سے اظہار خیال کرتے ہیں اور اکثر مقامات پر حالی سے اتفاق کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ حالی و شبلی دونوں ادب کے سماجی و اخلاقی پہلوؤں پر خصوصیت کے ساتھ زور دیتے ہیں لیکن حالی کے برخلاف شبلی ادب کے جمالیاتی پہلو کو اس کے افادی پہلو پر مقدم رکھتے ہیں۔

حالی نے عربی شاعری کے تنقیدی مباحث کو اپنا ماخذ بنایا۔ اسی لیے عربی زبان پر دسترس کے باوجود شبلی نے فارسی شاعری کو اپنا موضوع بنایا۔ جبکہ عربی زبان و تنقید فارسی سے کہیں زیادہ مالا مال تھی اور فارسی تنقید نے عربی تنقید سے ہی اپنے چراغ روشن کیے تھے۔ شبلی کے تعلق سے ڈاکٹر عبادت بریلوی کا بیان اہم ہے لکھتے ہیں کہ:

ادبیات میں عربی ادب خاص طور پر ان کے پیش نظر رہا۔ انھوں نے خود شعر و ادب پر ایک مقالے میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ رجحان طبع کی اور بات ہے ورنہ یہ ظاہر ہے کہ اقتضائے حالات کے لحاظ سے مجھ کو شعر العجم کے بجائے شعر العرب لکھنا چاہیے تھا۔

(اردو تنقید کا ارتقا: عبادت بریلوی، ص 158)

شبلی عرب نقادوں کی طرح موزونیت کو شاعری کے لیے بنیادی صفت قرار دینے پر راضی نہیں۔ اس کے باوجود وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ شاعری میں کئی چیزیں اہم ہوتی ہیں۔ جیسے وزن، خیال بندی، شیریں سادہ الفاظ، طرز ادا کی جدت وغیرہ۔ واضح رہے کہ حالی کے یہاں وزن اور قافیہ کوئی ضروری شے نہیں، لیکن شعر میں تاثیر کے لیے وہ اس کے قائل ہیں۔ شبلی کے نزدیک شاعری کے عناصر اصلی دو ہیں۔ ایک محاکات اور دوسرا تخیل۔ اگر ان دونوں میں سے ایک چیز بھی پائی جائے تو شعر وجود میں آتا ہے ورنہ نہیں۔ محاکات سے شبلی کی مراد کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے۔ جسے ہم تصویر کشی یا آج کی اصطلاح کے مطابق شعری پیکر کہتے ہیں۔ تخیل اور محاکات کی اہمیت اور اولیت کے تعلق سے شبلی رقمطراز ہیں کہ:

اگر کسی شعر میں تخیل ہو اور محاکات نہ ہو تو کیا وہ شعر نہ ہوگا۔ سیکڑوں اشعار ہیں جن میں محاکات کے بجائے صرف تخیل ہے اور باوجود اس کے وہ عمدہ اشعار خیال کیے جاتے ہیں۔ شاید یہ کہا جائے کہ محاکات ایسا وسیع مفہوم ہے کہ تخیل اس کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتا اس لیے تخیل کی تعریف لکھیں گے تو واضح ہو جائے گا کہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے۔ محاکات اور تخیل۔ ان میں سے ایک بات بھی پائی جائے تو شعر شعر کہلانے کا مستحق ہوگا۔ باقی اور اوصاف یعنی سلاست صفائی حسن بندش وغیرہ شعر کے اجزائے اصلی نہیں بلکہ عوارض اور مستحسنات ہیں۔ (شعر العجم جلد چہارم: شبلی نعمانی، ص 76)

حالی رباعی کو سب سے کارآمد صنف تصور کرتے ہیں کہ اس میں تسلسل بیان کی خوبی پائی جاتی ہے اور کسی حد تک مرثیے کی صنف کو مذہبی اور اخلاقی تعلیم کی بنا پر پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تاہم وہ اردو شاعری کی مروجہ بیشتر اصناف سے غیر مطمئن نظر آتے ہیں۔ وہ غزل سے بددل ہیں اور قصیدے کو تو عفونت میں سنڈاس سے بدتر خیال کرتے ہیں۔ شبلی ان اصناف کے تعلق سے اپنی پسند یا ناپسند کا اظہار براہ راست نہیں کرتے کہ وہ تکرار سے اپنا دامن بچانا چاہتے ہیں۔ تاہم اس عہد کے شعرا نے جو تماشا کیا تھا اور معاملہ بندی کے موضوعات اور سوقیانہ اور مبتذل خیالات سے اردو شاعری کے دامن کو جو آلودگی عطا کی تھی اس سے بہرحال شبلی بھی مطمئن نہ تھے۔ مثنوی جیسی صنف جو اس وقت تک عشق و عاشقی کے موضوعات کے لیے مخصوص تھی اس میں شبلی نے اخلاقی تعلیم اور عصری مسائل کو پیش کر کے یہ خاموش پیغام دیا کہ وہ شاعری میں حالی کے اخلاقی تعلیمات کے نظریے سے اتفاق کرتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالمتین لکھتے ہیں کہ:

''واقعہ یہ ہے کہ حالی و شبلی دونوں نے شاعری کے معاملے میں سادگی اور اصلیت کا ذکر کیا ہے وہ بجائے خود ان کے عہد کی ترجیحات پر دلالت کرتا ہے اور یہ ترجیحات مغربی بالخصوص انیسویں صدی کے انگریزی تنقید کے افکار کے اثرات کی نشاندہی بھی کرتی ہے ... شبلی مغربی افکار پر بھی تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں۔ یہاں تک کہ ارسطو سے اختلاف کرتے ہوئے محاکات پر تخیل کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس سے شبلی کی عربی شعریات کی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ بصیرت اس انداز فکر کی دین ہے جو شبلی کے ذہن میں حالی سے کہیں زیادہ راسخ اور پختہ تھا۔ اسی انداز فکر نے شبلی کو اپنے دور میں جو مغرب پرستی کی ایک عام ہوا چلی ہوئی تھی اس سے ایک آزادانہ نظر اور دور بین نگاہ عطا کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ امتداد دہر کے ساتھ ساتھ شبلی کی طرز تنقید کی اہمیت زیادہ سے زیادہ واضح ہوتی جا رہی ہے۔ (اردو کی ابتدائی ادبی تنقید پر عربی شعریات کے اثرات۔ ڈاکٹر عبدالمتین، ص 219)

حالی و شبلی نے جو تنقیدی تصورات پیش کیے ہیں اسی روشنی میں ہماری تنقید نے آگے کی مسافت طے کی ہے۔ حالی و شبلی نے ادب و شاعری کے متعلق ہر چھوٹے بڑے جزوی و فروعی مسائل کو اپنی تفصیلی بحث کا موضوع بنایا ہے اور اپنے تنقیدی تصورات کو واضح کیا ہے کسی بھی ادب میں تنقید کی اہمیت یوں بھی ہے کہ تنقید کی آنچ کے بغیر ادب کچ خام ناقص اور غیر معتبر سمجھا جاتا ہے۔ اردو میں حالی و شبلی نے تنقیدی افکار کی جو شمع روشن کی ہے بعد کے لوگوں نے وہیں سے اپنے چراغوں کے لیے روشنی حاصل کی ہے۔ باوجود اس کے عہد حاضر کے بعض ناقدین حالی و شبلی کے تنقیدی نظریات میں فنی سہو اور تسامحات کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ہمیں یہ نہیں فراموش کرنا چاہیے کہ آج کی تنقید اور حالی و شبلی کی تنقید کے درمیان سو سال کا فاصلہ حائل ہے۔ حالی و شبلی کے تنقیدی مباحث کا محاکمہ کرتے وقت تاریخ کے اس طول طویل فاصلے کے تناظر کو نظر انداز کر کے ہم کوئی صحیح نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے۔

■

Dr. Mohd Tahir, Dept of Urdu, Shibli National College, Azamgar - 276001 (UP)

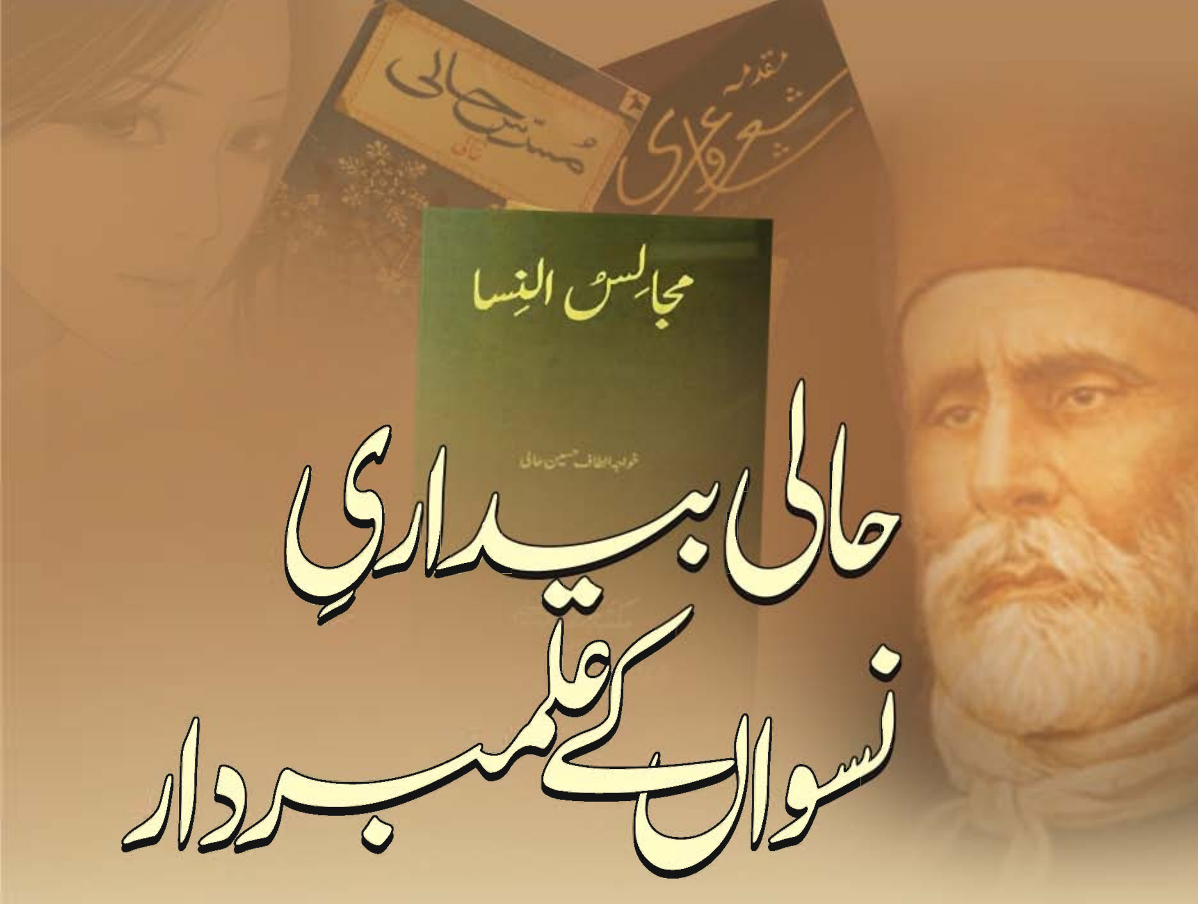

محمد اقبال

حالی بیداریِ نسواں کے علمبردار

حقوقِ نسواں اور تعلیم نسواں کے تئیں حالی کی قابلِ قدر خدمات ہر حساس شخص کو متاثر کرتی ہیں۔ محمد حسین آزاد کے شانہ بہ شانہ اصلاحی تحریک کے علمبردار، قومی شاعری کے اہم ستون اور اردو ادب کے اولین نقاد مولانا الطاف حسین حالی سے مروجہ شاعری کے عیوب پوشیدہ نہیں تھے۔ وہ شاعری میں حقیقت اور اصلیت کے حامی تھے۔ اخلاقی شاعری کو حالی کی عطا بڑی وقیع ہے۔ جناب عبدالقادر سروری کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ حالی کی طبیعت بے حد حکیمانہ واقع ہوئی تھی۔ ان میں تمثیل سے زیادہ مشاہدہ اور احساس سے زیادہ عقل کی قوتیں کارفرما تھیں۔ حالی کی طرف سے انجمن پنجاب کے مشاعروں میں پیش کی گئی نظموں میں جدید اردو شاعری کے ابتدائی نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔ پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد نئی تہذیب وتمدن کے اثرات زندگی کے مختلف شعبہ جات پر مرتب ہوئے۔ سیاسی و سماجی حالات میں انقلاب ادبی رجحانات میں تبدیلی کا باعث بھی بن جاتا ہے۔ سرسید تحریک اس عہد کی بڑی توانا تحریک ہے جس کی ہمہ جہتی اور اثر پذیری سے انکار ممکن نہیں۔ اس تحریک کا اثر اسلوب بیان پر بھی ہوا اور موضوع پر بھی۔

1857 کا ہنگامہ ایک طرف بقول حالی ''دریائے عتاب ذوالجلال کی موجزنی تھا تو دوسری طرف تعمیر نو کا پیغام بھی تھا۔ علی گڑھ تحریک کی سب سے بڑی عطا یہ تھی کہ اس نے ازلی صداقت کو مستحکم کیا کہ تحصیلِ علم سے مذہب کو کبھی کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوا۔ حالی سرسید کے قافلے کے اہم رکن تھے اور سرسید ان کے ہیرو بھی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ سرسید نے مسلمانوں میں جس تحریک کو پھیلایا حالی نے شعر کی زبان میں اسے عوام تک پہنچایا۔ سرسید تحریک کا دماغ تھے تو حالی اس کی زبانِ گویا بن گئے۔

حالی نے بھی سرسید کی طرح تعلیم کو ہی تمام برائیوں کے خاتمے کا حل تصور کیا۔ اس میں مرد وزن کی کوئی قید نہ تھی۔ حالی کی نگاہ میں تعلیم ہی ایسا آلہ تھا جس سے کوئی بھی قوم ترقی کی منازل طے کرتی ہے اور اس سے محرومی ذلت ورسوائی کا سبب ہوتی ہے۔ کتنے موثر الفاظ میں کہتے ہیں:

یہ ہیں ترکِ تعلیم کی سب سزائیں
وہ کاش اپنی غفلت سے اب باز آئیں

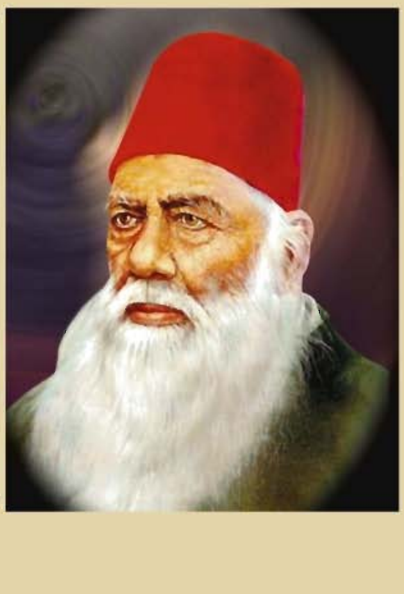

ہوا بڑھتی جاتی سر رہ گزر ہے
چراغوں کو فانوس بن اب خطر ہے

آگے کہتے ہیں:

بس اب علم وفن کے وہ پھیلاؤ ساماں
کہ نسلیں تمھاری بنیں جس سے انساں
غریبوں کو راہِ ترقی ہو آساں
امیروں میں ہو نورِ تعلیم تاباں
کوئی اُن میں دنیا کی عزت کو تھامے
کوئی کشتیِ دین و ملت کو تھامے

علم پر زور دینے کے ساتھ حالی نے بیوہ کی کسمپرسی کی حالت کو بھی بڑے کامیاب طریقے سے بیان کیا ہے۔ اردو ادب میں ہی نہیں ادبیاتِ عالم میں بھی بیوہ کی بے بسی اور قابلِ رحم حالت کو اتنے پرسوز انداز میں شاید ہی کسی شاعر نے بیان کیا ہو۔ 'مناجاتِ بیوہ' کے زیر عنوان قلم بند کیے گئے اشعار میں پوشیدہ شاعر کے درد کا اندازہ کیجیے۔ ایک بیوہ کتنی بے کسی سے اپنے مالکِ حقیقی کے سامنے اپنے دل کے دکھڑے کو بین کرتی ہے:

تیرے سوا اے رحم کے بانی — کون سنے یہ رام کہانی
ایک کہانی ہو تو کہوں میں — ایک مصیبت ہو تو سہوں میں
گر سسرال میں جاتی ہوں میں — نحس قدم کہلاتی ہوں میں
میکے میں جس وقت ہوں آتی — رو رو کر ہوں سب کو رلاتی
سوچ میں میرے سارا گھر ہے — میرے چلن پر سب کی نظر ہے
آپ کو ہوں ہر وقت مٹاتی — پہنتی اچھا میں ہوں نہ کھاتی

سسرال والوں کے غیر انسانی رویے کی منفرد انداز

سے عکاسی کرتے ہوئے حالی نے والدین کے گھر میں بیوہ کے وجود کو سب کے لیے وجہ پریشانی اور تشویش قرار دیا ہے۔ اس کا رہن سہن زیبائش و آرائش سب معاشرتی نظام اور پابندیوں کی نظر ہو جاتے ہیں:

مہندی میں نے لگانی چھوڑی
پٹی میں نے جمانی چھوڑی
کپڑے مہینوں میں ہوں بدلتی
عطر نہیں بھول کے ملتی

بیوہ کے سلسلے میں جو غیر انسانی روایات قدیم زمانے سے جاری و ساری تھیں جس سے ایک بیوہ کی زندگی کا جہنم بن جانا یقینی تھا۔ نظم مناجاتِ بیوہ ان ظالمانہ رسومات کو پر درد انداز سے بیان کرتی ہے۔ حالی کے لب و لہجے کا نمایاں وصف ان کی سادگی اور تاثیر ہے۔ تصنع و تکلف سے انھیں کوئی سروکار نہیں لیکن بات دل سے نکلتی ہے اور دل میں گھر کر جاتی ہے:

لیکن ہٹ پیاروں کی یہی تھی
مرضی غم خواروں کی یہی تھی
اپنے بڑوں کی ریت نہ چھوٹے
قوم کی باندھی رسم نہ ٹوٹے
ہو نہ کسی سے ہم کو ندامت
ناک رہے کنبہ میں سلامت
جان کسی کی جائے تو جائے
آن میں اپنی فرق نہ آئے
تجھ پہ ہے روشن اے مرے مولا
وقت یہ کیسا مجھ پہ پڑا تھا

بیوہ کس طرح سماجی زنجیروں میں جکڑی جاتی ہے۔ کارزارِ حیات کا طویل سفر اسے کس طرح تنہا طے کرنا پڑتا ہے اور انسان کے بنائے ہوئے ضوابط و معیارات بیوہ عورت کی مشکلات و پریشانیوں کا سبب بنتے ہیں، حالی 'مناجاتِ بیوہ' میں اسے پرنم آنکھوں سے بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

جان تھی میری آن کی دشمن
آن تھی میری جان کی دشمن
آن سنبھالے جان تھی جاتی
جان بچائے آن تھی جاتی

ایک بیوہ عورت ان حالات کا سامنا کیسے کرتی ہے اس کی عکاسی حالی یوں کرتے ہیں:

دل تھاما اپنے کو سنبھالا   سانس تلک منھ سے نہ نکالا
اور نہ اگر میں کرتی ایسا   کیوں کر کرتی اور کرتی کیا
کہہ گئی سچ اک راج کماری   "لاچاری پربت سے بھاری"

پروفیسر خلیق احمد نظامی عورتوں کی پریشانیوں اور مسائل کے بارے میں حالی کی گراں قدر خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"حالی نے بڑے سوز، بڑے خلوص اور درد کے ساتھ عورتوں کے مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور کچھ اس انداز سے آواز اٹھائی کہ اپنے پرائے سب اس آواز سے مسحور ہو گئے۔ 'چپ کی داد' اور 'بیوہ کی مناجات' میں وہ خود روئے ہیں اور دوسروں کو رلایا ہے۔"

آخر میں ایک بیوہ اپنے پروردگار سے دعا گو ہے کہ کسی کو بیوگی کا زخم نہ عطا کرنا اور مالکِ حقیقی سے فریاد کرتی ہے کہ اے مالک دو جہاں کسی عورت کو بھی بے وارث نہ چھوڑنا۔ اشعار میں درد اور سادگی کی آمیزش دیکھیے:

اے خاوند خداوندوں کے   مالک خاوند اور بندوں کے
واسطہ اپنی خاوندی کا   صدقہ اپنی خداوندی کا
تو یہ کسی کو داغ نہ دیجو   کسی کو بے وارث مت کیجو
کیجو جو کچھ تیری خوشی ہو   رانڈ مگر کیجو نہ کسی کو

مناجاتِ بیوہ کے بعد حالی نے 'چپ کی داد' میں عورتوں کی تعلیم و تربیت کی اہمیت پر اپنے لافانی خیالات پیش کیے۔ درج ذیل اشعار میں عورت کے فطری اوصاف اور خصوصیات کو نمایاں کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اے ماؤ، بہنو، بیٹیو، دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمھیں، قوموں کی عزت تم سے ہے
فطرت تمھاری ہے حیا، طینت میں ہے مہر و وفا
گھٹی میں ہے صبر و رضا انساں عبارت تم سے ہے
تم آس ہو بیمار کی، ڈھارس ہو تم لاچار کی
دولت ہو تم نادار کی، عسرت میں عشرت تم سے ہے

میکے سے سسرال کا سفر گویا ایک دنیا سے دوسری دنیا میں قدم رکھنے کے مساوی ہے۔ حالی کی نگاہ میں اسے دیس سے پردیس میں منتقل ہونے کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ سسرال کے تقاضے میکے سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ 'چپ کی داد' میں حالی نے عورت کے سسرال کے گھر میں جذبات و احساسات کو کس طرح اشعار کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

سسرال میں پہنچیں تو واں اک دوسرا دیکھا جہاں
جا اتریں گویا دیس سے پردیس میں اک بار تم
واں فکر تھی ہر دم یہی ناخوش نہ ہو تم سے کوئی
اپنے سے رنجش کے کبھی پاؤ نہ واں آثار تم
بدلے نہ شوہر کی نظر سسرے کا دل میلا نہ ہو
آنکھوں میں ساس اور نند کی کھٹکو نہ مثلِ خار تم
غم کو غلط کرتی رہو سسرال میں ہنس بول کر
شربت کے گھونٹوں کی طرح پیتی رہو خونِ جگر

'چپ کی داد' عورت کے گوناگوں صفات و محاسن کا احاطہ کرتی ہوئی حالی کی شاہکار نظم ہے۔ نسلِ انسانی کے ارتقا میں عورت

حالی ایک نظر میں

خواجہ الطاف حسین نام، حالی تخلص، پانی پت میں انصاریوں کے ایک معزز خاندان میں 1837 میں پیدا ہوئے۔ کم عمری میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور حالی معاشی مسائل سے تنگ آ کر دہلی پہنچے۔ غالب کی شاگردی اختیار کی۔ شیفتہ کی جامع صفات نے حالی کو ذہنی طور پر بہت متاثر کیا۔ شیفتہ کے انتقال کے بعد حالی لاہور چلے گئے۔ لاہور میں چھوٹی موٹی ملازمتیں کرتے رہے۔ لاہور ہی میں انھوں نے انگریزی زبان میں تھوڑی بہت استعداد حاصل کی اور یہ اردو شاعری کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ حالی شاید اردو کے پہلے شاعر تھے جو انگریزی سے بھی تھوڑی بہت واقفیت رکھتے تھے۔ اس استعداد نے جہاں انھیں نیچرل اور اخلاقی شاعری کی طرف راغب کیا وہیں 'مقدمہ شعر و شاعری' لکھنے پر مجبور۔ سرسید نے حالی کی جدت طرازی کو سراہا اور ان ہی کے ایما سے حالی نے اپنا لافانی 'مسدس مد و جزر اسلام' لکھا۔

حالی ایک قابل قدر نقاد ایک با اعتبار سوانح نگار اور جدید اردو شاعری کے بانی تھے۔ ان کی غزلیں اپنی دلکشی، رنگینی اور سلاست کی وجہ سے ایک ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ نیچرل اور اخلاقی شاعری مبالغہ اور صنائع بدائع سے پاک ہے۔ حالی کام کی باتیں نہایت ہی صاف اور سادہ زبان میں لکھنے میں قدرت رکھتے تھے۔ ان کے جذبۂ اصلاح اور خشک پند و نصائح نے بعض جگہ ان کے کلام میں پھیکا پن ضرور پیدا کیا ہے تاہم بحیثیت مجموعی اردو شاعری کا ایک اہم نام ہے۔

تصانیف: منظوم تصانیف

(1) مثنویاں
(2) مسدسِ حالی
(3) شکوۂ ہند
(4) کلیاتِ حالی معہ مقدمۂ شعر و شاعری
(5) مناجات بیوہ اور چپ کی داد
(6) مراثی۔ غالب، حکیم محمود خاں اور تباہیٔ دہلی
(7) مجموعۂ نظم حالی
(8) مجموعۂ نظم فارسی

نثری تصانیف

(1) تریاقِ مسموم
(2) حیات سعدی
(3) مقدمۂ شعر و شاعری
(4) یادگارِ غالب
(5) حیاتِ جاوید

پانی پت میں 31 دسمبر 1914 کو انھوں نے وفات پائی۔

کے کردار و عمل کی ترجمانی جس طرح اس نظم کے ذریعے کی گئی ہے اس سے حالی کے فنی مرتبے کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ جو ذمے داریاں ایک عورت ادا کرتی ہے مرد ان ذمے داریوں اور فرائض کو ادا کرنے سے قاصر ہے:

پیدا اگر ہوتیں نہ تم بیڑا نہ ہوتا پار یہ
چیخ اٹھتے دو دن میں اگر مردوں پہ پڑتا بار یہ
لیتیں خبر اولاد کی مائیں نہ گر بچپن میں یاں
خالی کبھی کا نسل سے آدم کی ہوجاتا جہاں
وہ علم اور حکمت کے بانی جن کی تحقیقات سے
ظاہر ہوئے عالم میں اسرار زمیں و آسماں
کیا صوفیانِ باصفا کیا عارفانِ باخدا
کیا انبیا کیا اولیا کیا غوث کیا قطب زماں

حالی کو اس بات کا شدید رنج ہے کہ جس عورت نے مردوں کو جنم دیا، پرورش اور تربیت کی، مردوں نے اسے جہالت کے اندھیرے میں دھکیلنے کی کوشش کی۔ عورت کو علم و آگہی سے محروم رکھنے کے منظر کو حالی کتنے پُراثر انداز سے بیان کرتے ہیں:

تم اس طرح مجہول اور گمنام دنیا میں رہو
ہو تم کو دنیا کی نہ دنیا کو تمھاری ہو خبر
جب تک جیو تم علم و دانش سے رہو محروم یاں
آئی ہو جیسی بے خبر ویسی ہی جاؤ بے خبر
جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آبِ حیات
ٹھہرا تمھارے حق میں وہ زہر ہلال سربسر

عورت پر زمانۂ جاہلیت ہی سے مظالم، تشدد اور جور و جبر کا آغاز ہو گیا تھا لیکن عورت نے صبر و رضا کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور خدائے برتر پر یقین رکھتے ہوئے استقامت سے تمام امتحانات میں سرخرو ہو کر نکلی اور اس طرح اس کا مرتبہ فرشتے سے بھی بلند ہو گیا۔ کیا خوب کہا ہے:

افسوس دنیا میں بہت تم پر ہوئے جور و جفا
حق تلفیاں تم نے سہیں بے مہریاں جھیلیں سدا
گاڑی گئیں تم مدتوں مٹی میں جیتی جاگتی
حامی تمھارا تھا نہ یاور کوئی جز ذاتِ خدا
زندہ سدا جلتی رہیں تم مردہ خاوندوں کے ساتھ
اور چین سے عالم رہا یہ سب تماشے دیکھتا
گو صبر کا اپنے نہ کچھ تم کو ملا انعام یاں
پر جو فرشتے سے نہ ہو وہ کر گئیں تم کام یاں

ڈاکٹر صغرا مہدی 'چپ کی داد' کی انفرادیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''چپ کی داد، اردو شاعری میں اپنی طرز کی منفرد نظم ہے جس میں حالی نے عورت ذات کی خوبیوں کو دل کی گہرائیوں سے سراہا ہے اور جس عزت بلکہ عقیدت سے ذکر کیا ہے وہ اس بات کا غماز ہے کہ واقعی خواتین کا ان کے دل میں کس قدر احترام تھا اور ان کے ساتھ مردوں نے جو زیادتیاں کی تھیں ان کو اس کا شدید احساس بھی تھا'' (جمنا تٹ، حالی نمبر یکم جولائی تا دسمبر 2012، ص 68) چپ کی داد اور مناجاتِ بیوہ حالی کی طبقۂ نسواں کے ساتھ ہمدردی اور ان کی دگرگوں حالت کی عکاسی کرتی ہوئی ناقابل فراموش نظمیں ہیں۔ ان دونوں نظموں کے بارے میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''مناجاتِ بیوہ اور چپ کی داد دو ایسی نظمیں ہیں ان کی نظیر ہماری زبان میں کیا کسی ہندوستانی زبان میں نہیں ملتی۔ ان نظموں کے ایک ایک مصرعے سے خلوص، جوش، ہمدردی اور اثر ٹپکتا ہے۔ یہ نظمیں نہیں ہیں، دل و جگر کے ٹکڑے ہیں۔ لکھنا تو بڑی بات ہے کوئی انھیں بے چشمِ نم پڑھ بھی نہیں سکتا۔''

سرسید کی طرح حالی کے افکار و خیالات عصری تقاضوں سے ہم آہنگ تھے۔ ان کے سینے میں کلام الٰہی محفوظ تھا۔ وہ جہاں بین تو تھے لیکن کسی جمشید کے ساغر نہیں تھے۔ انھوں نے قوم کی بیداری کے لیے تعلیم نسواں کو ازحد ضروری خیال کیا اور اس کے ساتھ ہی اپنے شعری افکار سے سماجی اور اخلاقی انقلاب لانے کی کوشش کی۔

حالی جس معاشرے کی تشکیل کے لیے سرگرداں رہے۔ اس میں روشن خیالی اور اشاعتِ علم کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ حالی مزاجاً سلیم الطبع اور اعتدال پسند تھے۔ مقصدیت اور اصلاح ان کی نگارشات کے بنیادی اوصاف تھے۔ مذہب اور مشرقی روایات سے اپنا رشتہ منقطع کیے بغیر حالی نے بیداریِ نسواں کے پرچم کو بلند کرنے کے لیے اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دیں۔ حالی کے عہد کی عورت جن مصائب سے دوچار تھی، کلام حالی اس پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔ حالی کا کلام اپنے عہد کی معاشرتی تاریخ مرتب کرنے میں ہی مدد نہیں کرتا بلکہ اس سے ان کے کرب کو بھی بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ آج اکیسویں صدی میں بھی جب عورت اپنا مناسب مقام حاصل نہیں کر پائی ان کے کلام کی معنویت اور قدر و قیمت اور بڑھ جاتی ہے۔ حالی لڑکیوں کی تعلیم کے لیے انتظار کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ تعلیم نسواں کے لیے انھوں نے جو عملی اقدامات کیے اس سے ان کی ترجیحات کا پتہ چلتا ہے۔

حالی اپنی شاعری میں اپنے رفقا کی طرح تکلف اور تصنع کے کبھی روادار نہیں رہے۔ انھوں نے عورت کو اس کا وہ مقام عطا کرنے کے لیے اپنے قلم کا استعمال کیا جس مقام و مرتبے کا مستحق اسے مالکِ حقیقی نے قرار دیا تھا۔ قیاسی و خیالی باتوں کے لیے حالی کے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ عملی انسان تھے اور اپنے عمل سے ہی گرد و پیش کی فضا میں تبدیلی لانے کے لیے کوشاں تھے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم حالی کی کوششوں اور کاوشوں کو ذہنی انقلاب کا نام دے کر خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''میرے نزدیک حالی کا یہ بھی کارنامہ ہے کہ انھوں نے اس خیالی دنیا میں جہاں صرف حسن کی تجلی تھی یا عشق کی گرمی بعض اور بڑی ٹھوس حقیقتوں کی طرف اشارہ کیا اور ان کے شاعرانہ امکانات کی طرف توجہ دلائی۔ جو لوگ طوائف کو ادب کہتے تھے انھیں بتایا کہ ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کا ذکر اور بیوہ کی مناجات بھی ادب ہے جو عشق کے صرف ایک پہلو کو جانتے تھے اور وہ بھی اکثر رسمی، انھیں قوم کے عشق سے روشناس کرایا۔ حالی ایک بہت بڑے معلم اخلاق ہیں اور ان کا کمال یہ ہے کہ اس کے باوجود بلکہ اس کی وجہ سے بڑے شاعر بھی ہیں — غرض حالی کی شاعری ایک خاموش بغاوت

ہے اور ایک مکمل بغاوت ہے۔ انھوں نے انقلاب کا کہیں نام نہیں لیا مگر ایک بہت بڑا ذہنی انقلاب برپا کر دیا۔''

تمام دانشور اس بات پر متفق ہیں کہ سرسید کے ساتھ حالی نے بھی تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کا احساس کیا۔ سرسید کی اپنے وطن میں شدید مخالفت نے انھیں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کوششیں کرنے کا موقع نہیں دیا۔ ان کا نظریہ تھا کہ پہلے لڑکوں کو تعلیم یافتہ بنایا جائے اور یہ کہ ایک تعلیم یافتہ والد، بھائی، شوہر اپنی بیٹی، اپنی بہن اور اپنی بیوی کی تعلیم و تربیت کے لیے زیادہ متفکر ہوگا۔ لیکن حالی نے لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلے میں کسی تاخیر کو برداشت کرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے وطن پانی پت سے اپنے گھر کے پاس لڑکیوں کا مدرسہ قائم کر کے اس انقلابی کام کا آغاز کر دیا۔

جناب عتیق احمد صدیقی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اگر معاشرہ کا آدھا حصہ اس طرح مجہول ہو جائے تو نہ اسے

صحت مند معاشرہ کہا جاسکتا ہے اور نہ اس کی اصلاح کی امید کی جاسکتی ہے۔ اصلاحِ معاشرت کی کوئی بھی کوشش تعلیم نسواں کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتی تھی کہ جہالت کی تاریکی ہر تبدیلی اور ترقی کے لیے مانع تھی۔" (فکر ونظر اکتوبر 1991ص 151)

حالی نے اپنے زمانے کی لڑکیوں کی تعلیمی پسماندگی کا شدت سے احساس کیا۔ اپنے وطن پانی پت میں لڑکیوں کے اسکول کا قیام بھی ان کی تعلیمی ترقی کے لیے شعوری کوشش تھی۔ حالی کی شدید خواہش تھی کہ دخترانِ ملت عصری تعلیم سے محروم نہ ہوں۔ مسلم بچیوں کی تعلیمی حالت پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے لکھا:

"مسلمان عورتوں میں اگر کچھ تعلیم ہے بھی تو صرف قدیم طریقے کی مذہبی تعلیم ہے جس سے کسی قدر اردو نوشت وخواندگی

کی لیاقت یا نماز روزہ وغیرہ کے مسائل سے فی الجملہ واقفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ باقی جو خیالات متعلق بہ اصلاح رسوم وعادات ان کے رشتہ دار مردوں کے دماغ میں گشت کرتے رہتے ہیں ان سے وہ ویسی ہی بے خبر اور اجنبی ہوتی ہیں جیسی بعض جاہل عورتیں —— پس تا وقتیکہ عورتوں میں زمانہ حال کی تعلیم رواج نہ پائے اور ہمارے واعظین زبانی مجلسوں میں قرآن اور حدیث کی رو سے بیہودہ، فضول رسموں کی برائیاں ان کے ذہن نشین نہ کریں، بہت ہی کم امید ہے کہ ہماری طرزِ معاشرت میں کوئی معتد بہ اصلاح ہوسکے۔" (مقالاتِ جلد اول ص 75-374)

حالی نے بڑے سوز، خلوص اور ہمدردی کے ساتھ عورتوں کے بنیادی امور اور مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور ایسے موثر انداز سے صدا بلند کی کہ اپنے پرائے سب اس پر خلوص آواز سے مسحور ہوگئے۔ 'چپ کی داد' اور 'بیوہ کی مناجات' میں انھوں نے خود بھی اشک بہائے ہیں اور دوسروں کو بھی اشک بہانے کے لیے مجبور کیا۔

تعلیم نسواں کے تعلق سے حالی کی تصنیف کردہ 'مجالس النساء' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ حالی نے اپنے لاہور کے دورانِ قیام 1874 میں مجالس النسا لکھی۔ یہ مولوی نذیر احمد کی 'مراۃ العروس' سے پانچ سال بعد لکھی گئی۔ مقصد دونوں تصانیف کا یکساں تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ مراۃ العروس ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی بیٹیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے تحریر کی جب کہ حالی کے پیش نظر مجالس النسا لکھتے ہوئے قوم کی بچیوں اور عورتوں کی اجتماعی تعلیم وتربیت پیش نظر تھی۔ حالی نے چند خواتین کی مجلس سجا کر بے تکلف زنانہ گفتگو میں ہی سارا قصہ کہہ سنایا ہے۔ مکالمے کا عنصر شامل ہونے کے سبب قصہ ناول کے قریب ہوگیا ہے۔ مصنف کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ اگر بچوں کی مائیں تعلیم دینے کے قابل ہوجائیں تو تعلیم و تربیت اور درس وتدریس کے بیشتر مسائل نہ صرف خود بخود حل ہوجائیں گے بلکہ آدمیت کے سانچے میں ڈھل کر سیرت سازی کا مقصد بھی پورا ہوجائے گا۔ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے مولانا حالی کو اس تصنیف کے صلے میں چار سو روپے کا انعام بھی دیا اور پنجاب میں لڑکیوں کے مدارس میں عرصے تک یہ کتاب نصاب کا حصہ رہی ہے۔

عورتوں کی فلاح و بہبود کے لیے حالی کی دلچسپی پر سیدہ سیدین حمید رقم طراز ہیں:

"(حالی کو) جس قدر پیار بچوں سے تھا اسی قدر ہمدردی عورتوں کے مسائل سے تھی۔ مشتاق ان کی پوتی تھیں اور وہ ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ بابا کو دیکھ دیکھ کر مشتاق کو پڑھنے لکھنے کا شوق ہوا۔ انیسویں صدی کے اواخر کے پانی پت میں لڑکیوں کے پڑھنے لکھنے کا رواج نہیں تھا پس قرآن شریف پڑھ لیا اپنے شوق سے اردو کی آسان کتابیں اور لکھنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ مشتاق نے کیا کیا توے کی کالک سے تو بنائی سیاہی اور سرکنڈے کا بنایا قلم پھر راتوں کو چھپ چھپ کر کتابوں سے نقل کر کے لکھنے کی پریکٹس شروع کی مگر آخر پکڑی گئیں۔ ایک دن حالی گھر میں گھسے تو مشتاق کی دادی یعنی حالی کی بڑی بھاوج طنز سے بولیں لو مبارک ہو اب تمھاری لڑکی خط پتر لکھا کرے گی خوب خاندان کا نام روشن ہوگا۔ حالی چپ چاپ سنتے رہے۔ مشتاق کی روح فنا تھی کہ بابا کیا سوچیں گے۔ حالی نے بھاوج کو الگ لے جا کر نہ جانے کیا کیا کہا۔ پوتی کے پاس آئے، گلے لگایا پیار کیا۔ بھئی لکھنے کا شوق ہے تو ضرور لکھو۔ کھلم کھلا لکھو۔ اگلے روز ہی خود بیٹھ کے پوتی سے تختی لکھوائی۔ پانی پت میں لڑکیوں کی تعلیم کا سہرا سراسر حالی کے سر ہے۔"

حالی کا یہ خیال بجا تھا کہ تعلیم یافتہ خواتین ہی اپنے حقوق کا بہتر تحفظ کرسکتی ہیں اور ملت کی ہمہ جہت ترقی لڑکیوں کی تعلیم کے بغیر ناممکن ہے۔ عورتوں کو علم کی روشنی سے محروم رکھنا ہمیشہ معاشرے کی پسماندگی کا باعث بنتا ہے۔ انھوں نے قوم سے درخواست کی کہ لڑکیوں کی تعلیم میں کوشش کریں اور لڑکیوں کو خدا تعالیٰ نے جو جوہر قابل عطا کیا ہے اسے خاک میں نہ ملائیں۔

عورت کو اللہ تعالیٰ نے جن اوصاف وخوبیوں سے نوازا ہے 'چپ کی داد' اس کی بہترین عکاسی کرتی ہے اور اس کی کمزور طبقے کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں اور زیادتیوں کا نوحہ بھی بیان کرتی ہے۔ حالی کا رویہ اور نقطۂ نگاہ بڑا مثبت اور ہمدردانہ ہے۔ حالی عورتوں کو تہذیبی اور علمی اعتبار سے ترقی یافتہ دیکھنے کے متمنی تھے۔ ہندوستانی بیوہ کی حالتِ زار پر مختلف ادیبوں اور شاعروں نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ لیکن جس طرح حالی نے مردوں کو جھنجھوڑا ہے اور ہمارے مروجہ نظام پر کاری ضرب لگائی ہے اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔

بقول صالحہ عابد حسین "حالی مرد ہوتے ہوئے بھی ایسا درد آشنا ایسا حساس اتنا نازک دل کہاں سے لائے جس نے کم سن بیوہ کے ہر جذبہ اور ہر ہر دکھ کو بالکل اسی طرح محسوس کیا جیسے یہ ان پر بیت رہا ہو مگر سوچتی ہوں یہی تو حقیقی شاعر کی پہچان ہے اور سچے شاعر کا کمال ہے کہ ہر ایک کی بپتی اس پر بیت جاتی ہے تب ہی وہ ایسی زندہ جاوید چیز لکھتا ہے۔"

'بیٹیوں کی نسبت' قطعہ میں حالی نے زمانۂ جاہلیت کی لڑکیوں کو زمین میں زندہ گاڑ دینے کی ظالمانہ رسم کا ذکر کیا ہے اور عہدِ حاضر میں بھی لوگ لڑکیوں کے رشتے تلاش کرتے ہوئے صرف مستحکم معاشی حالت یا اعلیٰ ذات کو بنیاد بنا لیتے ہیں لیکن کردار اور مزاج کی چھان بین کرنے کی کوئی زحمت گوارا نہیں کرتا اس غیر منطقی انداز فکر کے سبب لڑکیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح تصور کیا جاتا ہے:

جاہلیت کے زمانے میں یہ تھی رسم قدیم
کہ کسی گھر میں اگر ہوتی تھی پیدا دختر
سنگ دل باپ اسے گود سے لے کے ماں کی
گاڑ دیتا تھا زمیں میں کہیں زندہ جاکر
رسم اب بھی وہی دنیا میں ہے جاری لیکن
جو کہ اندھے ہیں لیتے نہیں کچھ ان کی خبر

دورِ حاضر میں طبقۂ نسواں کی فلاح و بہبود اور بیداریِ نسواں کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے حالی کا کلام مشعلِ راہ ثابت ہوسکتا ہے۔

■

Dr. Mohd Iqbal, Principlal, Gov College of Education, Maler Kotla (Pb.)
(Former Secretary, Punjab Urdu Academy)

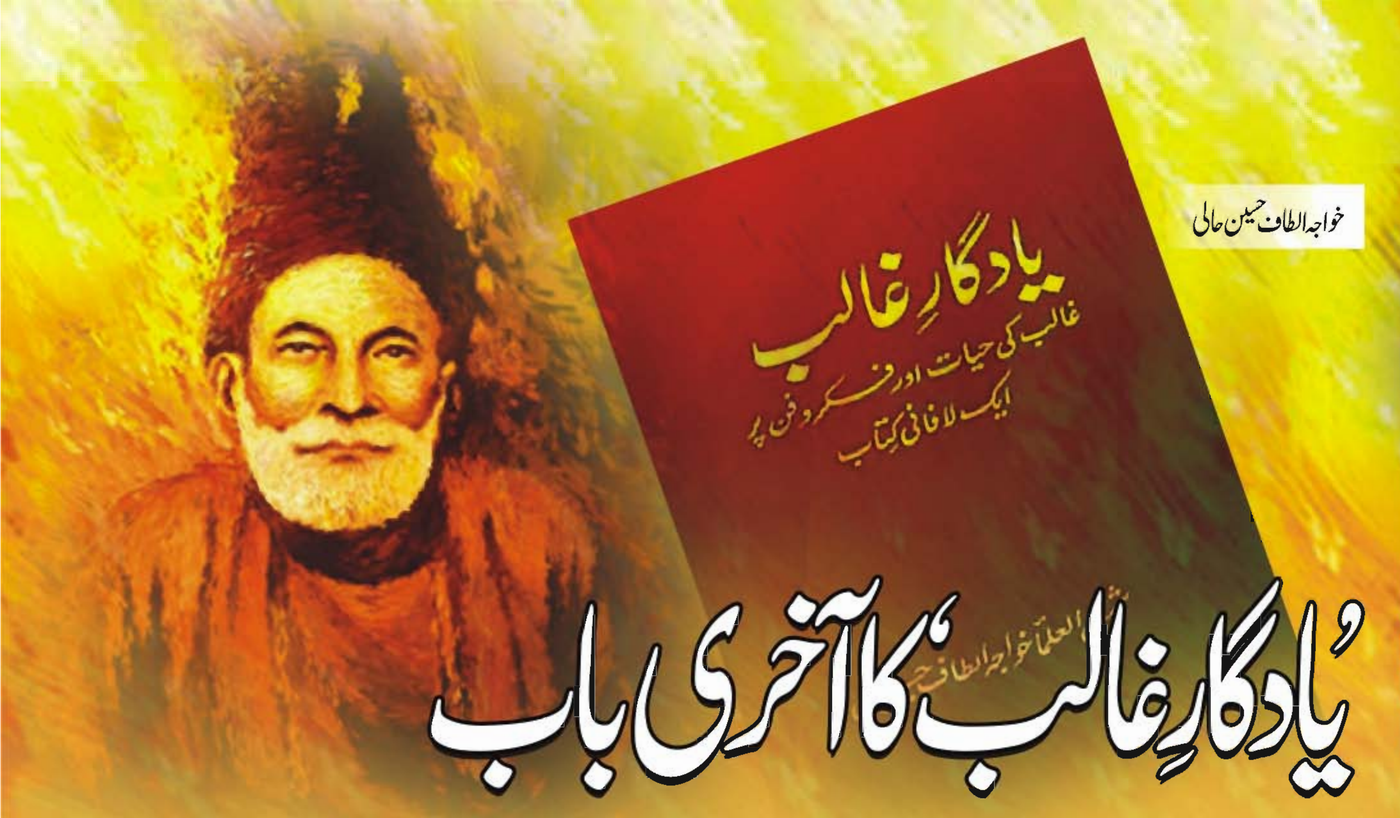

خواجہ الطاف حسین حالی

'یادگارِ غالب' کا آخری باب

مرزا غالب مرحوم کی لائف اور ان کے کلام کا انتخاب جس قدر کہ یہاں اس کا دکھانا مقصود تھا۔ ختم ہوگیا؛ مگر ابھی چند ضروری باتیں لکھنی باقی ہیں۔

ناظرین کو یاد ہوگا کہ مرزا پانچ برس کے تھے جب باپ کا، اور نو برس کے تھے جب چچا کا انتقال ہوا۔ ان کی ننھیال جہاں انھوں نے پرورش اور نشوونما پائی۔ آسودہ حال تھی۔ باپ اور چچا کے صغیر سن چھوڑ جانے سے نانا اور نانی کی الفت اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہوگی۔ خود مرزا کی طبیعت میں گرمی اور جودت کی ایک آگ بھری ہوئی تھی جس کے بھڑکانے کے لیے تھوڑی سی اشتعالک کافی تھی۔ باپ اور چچا کا سایۂ تربیت بچپن میں سر سے اٹھ جانا، ننھیال کی مرفہ الحالی، نانا نانی کی ناز برداریاں اور خود مرزا کا ذکی الحس ہونا؛ یہ تمام اسباب ایسے تھے کہ عنفوان شباب میں ان کا جادہ مستقیم سے تجاوز نہ کرنا نہایت دشوار تھا۔ مرزا کی ابتدا بگڑی اور ایسی بگڑی کہ اب تک ننھیال کی تمام املاک اور دیہات کی صفائی نہ ہوئی نشے ہرن نہ ہوئے۔ اگرچہ مرزا بہت دیر میں سنبھلے مگر وہ جو مشہور ہے کہ "صبح کا بھولا شام کو آجائے تو بھولا نہ جانو" انھوں نے اپنے فضل و کمال، حسنِ معاشرت، شریفانہ خصائل، اور کریمانہ اخلاق سے جو کہ ان کے ذاتی جوہر تھے۔ وہ عارضی دھبّے اس طرح دھوڈالے کہ گویا کبھی ان سے دامن آلودہ نہ ہوا تھا۔ جس فن پر انھوں نے لڑکپن میں ہاتھ ڈالا تھا اس کو اخیر عمر تک نبھا دیا؛ غفلت اور بدمستی کے عالم میں بھی اس کا خیال نہ چھوڑا اور باوجودیکہ زمانہ قدردانوں سے خالی تھا اس کو اس درجے تک پہنچا کر چھوڑا جو اس کا منتہائے کمال تھا۔

اگرچہ معاش کی طرف سے وہ کبھی زیادہ تنگ نہیں ہوئے مگر حوصلہ اور ہمت کے موافق کبھی استطاعت نصیب نہیں ہوئی؛ بلکہ جن اللّے تللّوں میں بچپن اور جوانی گزری تھی اس کے لحاظ سے یہ کہنا چاہیے کہ وہ اخیر دم تک حور بعد الکور میں مبتلا رہے۔ اس کے سوا امراض جسمانی سے کبھی فرصت نہیں ملی اور اپنے ہنر کی کساد بازاری کا رنج ہمیشہ سوہانِ روح رہا۔ باوجود اس کے زندہ دلی اور شگفتہ طبعی مرتے دم تک ان کی رفیق حال رہی۔ اگرچہ نظم و نثر میں جو زارنالیاں انھوں نے کی ہیں وہ بظاہر بے صبری اور تنک حوصلگی پر۔ جو ایک اخلاقی کمزوری ہے۔ دلالت کرتی ہیں؛ لیکن درحقیقت یہ ان کی شاعری و انشا پردازی کے میدانوں میں سے ایک میدان تھا جس کی زمین اُن کے پانو کو لگ گئی تھی۔ اول تو خود یہ مضمون ہی ایشیائی شاعری کا جزوِ اعظم ہے؛ دوسرے ہر شاعر ایک خاص راگنی کا کلانوت ہوتا ہے۔ چنانچہ عرب کے شعرا میں امرو القیس گھوڑے اور عورت کی تعریف اور عیش کے بیان میں مشہور تھا اعشے حسنِ طلب اور وصفِ شراب میں ضرب المثل تھا اور اسی طرح ہر شاعر کی شہرت کسی خاص بیان کے ساتھ مخصوص تھی۔ علی ہذا القیاس ایران میں فردوسی رزم کا دھنی تھا، نظامی بزم کا، اور سعدی موعظت کا۔ چونکہ مرزا خاص کر رنج و مصیبت کے بیان میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اس لیے یہ مضمون اکثر ان کے قلم سے تراوش کرتا تھا۔

اگرچہ مرزا اپنی شاعری کا سکہ اس وجہ سے کہ زمانہ اس کا اندازہ کرنے سے عاجز تھا پلک کے دلوں پر جیسا کہ چاہیے تھا نہیں بٹھا سکے؛ مگر وسعتِ اخلاق، حسنِ معاشرت اور صلحِ کل سے انھوں نے ایک عالم کو مسخر کرلیا تھا۔ قطع نظر شاگردوں اور مستفیدوں کے دوستوں اور ہواخواہوں کی تعداد بھی سیکڑوں سے گزر کر ہزاروں تک پہنچ گئی تھی؛ اور ہر ایک کے ساتھ ان کے برتاؤ کا طریقہ ایسا مہر انگیز تھا کہ ہر شخص اپنے تئیں ان کے مخصوص ترین دوستوں میں سے شمار کرتا تھا۔ غریبوں اور محتاجوں کی اپنی دسترس سے بڑھ کر خبر لینی، نوکروں اور لگے بندھوں کو عسرت کے وقت اپنے سے علیحدہ نہ کرنا، درماندگی میں دوستوں کی امداد کرنی اور ان کی مصیبت پر مثل یگانوں کے افسوس اور ان کے ساتھ ہمدردی کرنا، ہر حال میں پاسِ وضع اور خودداری کو ہاتھ سے نہ دینا، مذہبی تعصبات سے پاک ہونا اور ہر مذہب و ملت کے دوستوں کے ساتھ یکساں صفائی اور خلوص سے ملنا، یہ اور اسی قسم کی وہ تمام خوبیاں جو دار الخلافہ کی قدیم سوسائٹی کا زیور سمجھی جاتی تھیں اُن کی ذات میں جمع تھیں۔ خصوصاً وفاداری، حق شناسی اور احسان مندی کی شریف خصلت جو ہندوستان کے قدیم خاندانوں کا شعار تھا مرزا کی سرشت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ چونکہ ان کے چچا نصر اللہ بیگ خاں لارڈ لیک کی مہمات میں شریک رہے تھے اور ان کی وفات کے بعد گورنمنٹ نے ان کے پس ماندوں کے لیے جن میں سے ایک مرزا بھی تھے۔ کئی ہزار روپیہ سالانہ بطور پنشن کے مقرر کردیا تھا؛ مرزا نے۔ جیسا کہ ان کی تحریرات سے ظاہر ہے۔ اخیر عمر تک گورنمنٹ کے اس احسان کو فراموش نہیں کیا۔ تمام عمر ملکۂ معظّمہ اور وایسراؤں اور لفٹیننٹ گورنروں اور دیگر حاکموں اور افسروں اور تمام انگلش قوم کی مدح سرائی میں بسر کی، بعض افسروں کی وفات پر دردناک مرثیے لکھے اور ہمیشہ فخر کے ساتھ اپنے تئیں وابستگانِ دامنِ دولتِ انگلشیہ سے سمجھتے رہے۔ غدر کے زمانے میں فوجِ باغی کے ظلم و ستم سے جو اثر ان کے دل پر ہوا تھا وہ ان کی کتاب دستنبو سے۔ جو غدر کے حالات پر اسی شورش و فتنہ کے زمانے میں انھوں نے لکھی تھی۔ ظاہر ہے

1252 میں ولیم فریزر صاحب رزیڈنٹ وکمشنر دہلی کے بے گناہ مارے جانے پر جو سخت صدمہ ان کو پہنچا تھا وہ ان کے اس خط سے جو شیخ امام بخش ناسخ کو اس واقعہ کے ہوتے ہی انھوں نے لکھا تھا۔ ظاہر ہے۔ وہ اُس خط میں لکھتے ہیں "یکے از ستمگرانِ ناخداترس۔ کہ بغدابِ ابدی گرفتار باد– ولیم فریزر را کہ رزیڈنٹ دہلی وغالبِ مغلوب را مربی بود– در شبِ تاریک بضربِ تفنگ کشت، ومراغمِ مرگِ پدر تازہ کرد۔ دل از جاے رفت، وسترگ اندوہے سراپاے اندیشہ را فروگرفت خرمن آرمیدگی پاک بسوخت، ونقشِ امید از صفحۂ ضمیر سراسر سترده شد"

اگرچہ مرزا کے کلام میں مدحیہ قصائد کی مقدار تمام اصنافِ سخن سے زیادہ معلوم ہوتی ہے اور انھوں نے جابجا اس بات پر افسوس کیا ہے کہ عمر کا بہت بڑا حصہ اہل جاہ کی بھٹی میں صرف ہوا؛ مگر ادنیٰ تامل سے معلوم ہوسکتا ہے کہ جو فن مرزا نے اختیار کیا تھا اس کی تکمیل ان کے زمانے کے خیالات کے موافق زیادہ تر اس خاص صنف یعنی قصیدے کی مشق ومہارت پر موقوف تھی؛ کیونکہ فارسی شاعری کی ابتدا اسی صنف سے ہوئی اور کوئی شاعر جسے قیصدے میں کمال بہم نہیں پہنچا یا وہ مسلم الثبوت نہیں سمجھا گیا۔ یہاں تک کہ حکیم سنائی، شیخ سعدی اور امیر خسرو جیسے بزرگوں کا دامن بھی اس آلودگی سے پاک نہیں رہا۔ خود مرزا کا قول تھا کہ جو قصیدہ نہیں لکھ سکتا اس کو شعرا میں شمار کرنا نہیں چاہیے اور اسی بنا پر وہ شیخ ابراہیم ذوق کو پورا شاعر اور شاہ نصیر کو ادھورا جانتے تھے۔ بڑی دلیل اس بات کی کہ مرزا نے جس قدر قصیدے اہلِ دنیا کی مدح میں انشا کیے ہیں ان سے محض فن کی تکمیل مقصود تھی۔ یہ ہے کہ ان کا ممدوح مخاطب صحیح ہو یا نہ ہو، اور اس سے حسن کلام کی داد ملنے کی توقع ہو یا نہ ہو۔ وہ ہمیشہ قصیدوں کے سرانجام کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کرتے تھے اور ہر قصیدے میں اپنا کمالِ شاعری اسی طرح ظاہر کرتے تھے جیسے متنبیّ۔ سیف الدولہ کی یا عرفی خانخاناں کی تعریف میں کرتا تھا۔ مع ذلک چند قصیدوں کے سوا۔ جو دوستوں کی ترغیب وتحریض سے انھوں نے کسی امید یا توقع پر ہندوستان کے بعض رئیسوں کی مدح میں لکھتے ہیں۔ باقی ان کے تمام قصائد توحید ونعت ومنقبت میں ہیں، یا اپنے معزز اور لائق ہمعصروں کی تعریف میں، اور یا ان لوگوں کی شان میں جن کو وہ اپنا مربی اور ولی نعمت سمجھتے تھے اور جن کی مدح سرائی کا فرض بطور شکرگزاری ومنعم پرستی نہ باامید صلہ وانعام ادا کرتے تھے؛ جیسے قلعۂ دہلی کے بادشاہ وولی عہد، یا ملکۂ معظمہ اور وایسرایانِ کشورِ ہند اور دیگر اعیان وارکانِ سلطنتِ انگلشیہ، یا فرمانروایانِ ریاستِ رام پور والور وغیرہ۔

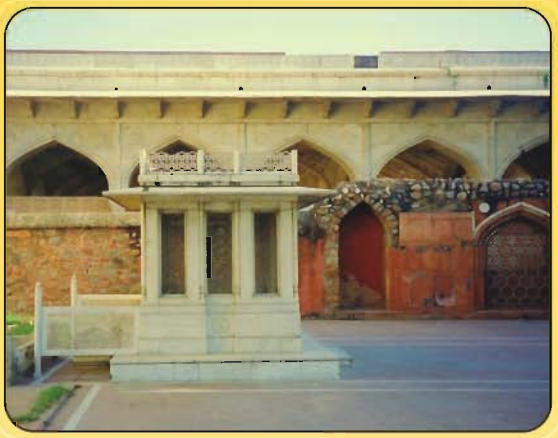

بایں ہمہ جس موثر طریقے سے مرزا نے اہل دنیا کی مدح سرائی پر افسوس کیا ہے وہ ملاحظہ کے قابل ہے۔ ہم نے اس کتاب میں۔ جیسا کہ مکرر بیان ہوچکا ہے۔ مرزا کے کلام کا انتخاب صرف اس غرض سے درج کیا ہے کہ شاعری وانشاپردازی کی غیر معمولی استعداد جو مرزا کی فطرت میں رکھی گئی تھی۔ جہاں تک کہ ان کی نظم ونثر اس پر شہادت دے سکتی ہے۔ صاحبانِ ذوقِ سلیم پر واضح ولائح ہوجائے۔ اگرچہ فی الحقیقۃ طریقہ مذکور سے اس غرض کا پورا ہونا نہایت دشوار ہے لیکن اگر بالفرض اس کا پورا ہونا تسلیم کرلیا جائے تو بھی بظاہر اُس سے کوئی فائدہ متصور نہیں۔

زمانۂ حال کی ترقیات نے جس طرح علمی دنیا میں انقلابِ عظیم پیدا کردیا ہے اسی طرح لٹریچر کی حالت بہت کچھ بدل ڈالی ہے۔ قدیم طریقے کی شاعری (اگرچہ ابھی تک اس کا نعم البدل پیدا نہیں ہوا) روز بروز نظروں سے گرتی جاتی ہے۔ نظم ونثر میں بجائے صنعتِ الفاظ اور محض خیالی باتوں کے سادگی اور حقیقت طرازی کی طرف طبیعتوں کا میلان زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ جو باتیں پہلے محاسنِ کلام میں داخل تھیں اب ان میں سے اکثر داخلِ عیوب سمجھی جاتی ہیں۔ اگرچہ ہندوستان میں قدیم لٹریچر کا تسلط ابھی بہت کچھ باقی ہے اور پبلک کا مذاق عام طور پر نہیں بدلا مگر زمانے کا رُخ قدیم شاہراہ سے یقینا پھر گیا ہے؛ اور آئندہ تمام قافلوں کو جو اس وادی میں قدم رکھنے والے ہیں زمانے کے ساتھ ساتھ جانا ضرور ہے۔ پس اگر مرزا کو اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کا شاعر فرض کرلیا جائے تو بھی اس زمانے میں ان کی نظم ونثر کے نمونے پبلک کے سامنے پیش کرنے اور ان کے مبلغ کمال کو لوگوں سے روشناس کرانا بظاہر ایک ایسا کام معلوم ہوتا ہے جس کا وقت گزر گیا لیکن ہمارے نزدیک زمانہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرجائے اس کو قدیم نمونوں سے کبھی استغنا حاصل نہیں ہوسکتا؛ خصوصاً ہندوستان کی لٹریری ترقی جس قدر مشرقی زبانوں کے قدیم لٹریچر سے وابستہ ہے ایسی یورپ کے موجودہ لٹریچر سے نہیں ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کے بعض نامور شعرا مشرقی شاعروں کے کلام سے اب تک استفادہ حاصل کرتے اور اس سے صدہا اسلوب بیان اخذ کرتے ہیں تو ہمارے ہم وطن کیونکر اس سے استغنا کا دعوے کرسکتے ہیں۔ جس طرح زمانۂ حال کے انجینئر قدیم عمارتوں اور پرانے کھنڈروں سے انجینئرنگ کے متعلق صدہا مفید نتیجے استخراج کرتے ہیں اسی طرح اس زمانے کے ناظم اور ناثر قدیم لٹریچر سے بہت کچھ لٹریری فائدے حاصل کرسکتے ہیں۔ ہم نے مانا کہ انگلش لٹریچر کی ترقی منتہائے کمال کو پہنچ گئی ہے اور ہمارے لٹریچر نے اسی کی بدولت کچھ عرصے سے آگے قدم بڑھانا شروع کیا ہے مگر جب تک لوگ یہ نہ سمجھیں گے کہ ہم کو انگلش لٹریچر سے کون سی باتیں اخذ کرنی چاہئیں اور اپنے قدیم مشرقی لٹریچر سے کیا سبق لینا چاہیے اس وقت تک ہمارا لٹریچر اصلی ترقی سے محروم رہے گا۔

مرزا کے فارسی کلام کا نمونہ جو ہم نے اس کتاب میں دکھایا ہے اگرچہ ممکن ہے کہ وہ زمانۂ حال کے مذاق کے موافق نہ ہو لیکن اس سے مرزا کے کمالِ شاعری میں کچھ فرق نہیں آتا۔ خود ایران کے بڑے بڑے نامور شعرا۔ جو اپنے زمانے میں مسلم الثبوت تھے۔ آج اہلِ زبان ان کی طرزِ شاعری کو نام رکھتے ہیں؛ خصوصاً متوسطین کے طبقے میں جو لوگ جامی کے بعد ہوئے ہیں اور جن میں تقریباً وہ تمام شعرا داخل ہیں جنھوں نے صفویہ اور مغلیہ کے عہدِ حکومت میں ایران یا ہندوستان میں علَم امتیاز بلند کیا تھا ان کی شاعری کو۔ جیسا کہ رضا قلی خانِ ہدایت نے اپنے تذکرۂ مجمع الفصحا میں تصریح کے ساتھ لکھا ہے۔ آج اہلِ زبان میں کوئی تسلیم نہیں کرتا۔ سب قدما کی روش کو پسند کرتے ہیں اور انھیں کے تتبع کا دم بھرتے ہیں۔ حالانکہ متوسطین کے طبقے میں بڑے بڑے نامور شعرا گزرے ہیں جن کے کمال اور استادی کا انکار نہیں ہوسکتا۔ پس درحقیقت کسی کی شاعری یا انشاپردازی کا پبلک کے موجودہ مذاق کے خلاف ہونا اس کے سوا کچھ معنی نہیں رکھتا کہ جو شے پہلے ایک خاص وضع کے سانچے میں ڈھالی گئی تھی وہ اب دوسری وضع کے سانچے میں نہیں سماسکتی۔

اگرچہ مرزا کی شاعری نے شعرائے متوسطین کے محدود دائرے سے قدم باہر نہیں رکھا؛ وہی چند میدان جن میں انھوں نے گھوڑے دوڑائے تھے ہمیشہ مرزا کی جولانگاہ رہے؛ لیکن جس درجے کا ملکۂ شاعری ان کی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا اس سے پایا جاتا ہے کہ جس طرح دریائے مواج جدھر رخ کرتا ہے اُدھر اپنا رستہ برابر نکالتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ جس میدان میں قدم رکھتے اُس کو کامیابی کے ساتھ طے کرجاتے۔

وہی بارود جو آتش بازی میں بچوں کا جی لبھاتی ہے جب اس کو دوسری طرح کام میں لایا جاتا ہے تو بڑے بڑے قلعوں اور پہاڑوں کو پرِ کاہ کی طرح اڑا دیتی ہے اور وہی ایک چیز تھی جس نے کہیں صرف احباب کے جلسوں اور امیروں کے درباروں کو گرم کیا اور کہیں ملکوں اور قوموں میں حبِ وطن اور قومی ہمدردی کی آگ لگا دی۔

مرزا نے جس وقت شعرِ فارسی کے میدان میں قدم رکھا تھا اس وقت ہندوستان میں دو طرزوں کا زیادہ رواج تھا؛ ایک نظیری و عرفی وغیرہ کی طرز جو اکبر کے زمانے سے چلی آتی تھی؛ دوسری مرزا بیدل کی طرز جو عالمگیر کے عہد میں شائع ہوئی اور علوی و صہبائی پر آ کر ختم ہو گئی۔ جو لوگ شعر فارسی میں کمال بہم پہنچانا چاہتے تھے وہ انھیں دونوں میں سے کوئی طرز اختیار کرتے تھے۔ اگرچہ حافظ اور خسرو کی غزل ان سے بہت زیادہ قبول خاص و عام تھی مگر ان وجوہات سے جو متاخرین کو طرزِ جدید اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہیں اور جن کا ذکر ہم دوسرے حصے میں کر چکے ہیں۔ مرزا نے اوّل بیدل کی رو پر چلنا شروع کیا؛ پھر اس نظر سے کہ اہل زبان اس طرز کو ٹکسال باہر خیال کرتے تھے۔ نظیری و عرفی کی طرز اختیار کی۔ ظاہر ہے کہ ایک ہندی نژاد شاعر۔ جو ایسے ناپرساں زمانے میں پیدا ہوا ہو اور جس نے فارسی شاعری میں نظیری و عرفی وغیرہ کے کلام سے بہتر کوئی ممکن التقلید نمونہ نہ دیکھا ہو۔ وہ سوا اس کے کہ ان کا اتباع اختیار کرے اور کیا کر سکتا تھا۔ رہی یہ بات کہ اُس نے اس طرزِ شاعری میں کس قدر کامیابی حاصل کی ہے اور ان لوگوں کی پیروی کا کہاں تک حق ادا کیا ہے۔ سو اس کو اس طرح ثابت کرنا تو ناممکن ہے جیسے دو اور دو چار؛ البتہ جو لوگ شعر فارسی کا صحیح مذاق رکھتے ہیں وہ اکبری دور کے شعرا اور مرزا کے کلام کا مقابلہ کرنے کے بعد امید ہے کہ مرزا کی اعلیٰ درجے کی قابلیت و استعداد کا اعتراف کریں گے اور اس بات کو تسلیم کریں گے کہ زمانے کا اقتضا اور سوسائٹی کا دباؤ اس شخص کو جس روش پر ڈال دیتا وہ ضرور اس میں کامیاب ہوتا۔ چنانچہ اخیر عمر میں جب حبیب قاآنی کے قصائد مرزا کی نظر سے گزرے تو اس کے کلام کی روانی اور بیساختہ پن دیکھ کر ان کو قاآنی کی روش پر چلنے کا خیال پیدا ہوا تھا؛ اور اسی لیے ان کے سب سے پچھلے قصیدوں اور قطعوں میں بہ نسبت پہلے قصائد اور قطعات کے زیادہ روانی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے لیکن چونکہ اب دوسری چال چلنے کا وقت نہیں رہا تھا اس لیے اس روش کی تکمیل ہونی ناممکن تھی۔

اس کتاب میں۔ جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہے۔ مرزا کو شاعری کے لحاظ سے جا بجا نظیری و عرفی وغیرہم کا۔ جن کو خود مرزا اپنا پیش رو تسلیم کرتے ہیں۔ ہم پلہ قرار دیا گیا ہے سو قطع نظر اس کے کہ کوئی قطعی دلیل اِس دعوے پر قائم نہیں ہو سکتی، اور ناظرین کے ذوق و وجدان کے سوا کوئی چیز اس کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ یہاں دو اور سوال پیدا ہوتے ہیں؛ اول یہ کہ ایک زبان دان آدمی شاعری میں اہلِ زبان کے برابر ہو بھی سکتا ہے یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ ایک پیرو اپنے پیشرؤں کے ساتھ مساوات کا درجہ حاصل کر سکتا ہے یا نہیں؟ سو دوسرے سوال کا جواب تو بالکل صاف ہے۔ دنیا میں ابتدا سے آج تک نہ صرف شعر و شاعری میں بلکہ ہر علم اور ہر فن اور ہر پیشہ میں اکثر پیرو اپنے پیش رؤں کے صرف برابر ہی نہیں بلکہ ان سے فائق اور افضل ہوتے رہے ہیں۔ فردوسی رزمیہ مثنوی میں اسدی اور دقیقی کا پیرو ہے؛ مگر دونوں سے گوے سبقت لے گیا ہے۔ خواجہ حافظ غزل میں سعدی کے قدم بقدم چلے ہیں مگر سعدی سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ قاآنی قصیدے میں تمام قدما

سے بڑھ گیا ہے۔ میر تقی نے تمام اگلے ریختہ گویوں کو۔ جو یقیناً اس کے پیش رو تھے۔ غزل میں اپنے سے بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ میر انیس تمام مرثیہ گویوں سے جو ان سے پہلے ہوئے۔ بازی لے گئے ہیں۔ پس اگر مرزا غالب کو فارسی شاعری میں نظیری و عرفی سے افضل نہیں بلکہ صرف ان کا ہم پلہ قرار دیا جائے تو اِس میں کون سی تعجب کی بات ہے۔

رہا پہلا سوال سو ظاہر ہے کہ شاعری کا ہنر دو مختلف لیاقتوں سے مرکب ہے؛ ایک امیجینیشن یعنی قوتِ متخیلہ کی بلند پروازی، دوسرے مناسب الفاظ کے استعمال پر قدرت۔ ان میں سے پہلی لیاقت۔ جیسا کہ ظاہر ہے ممکن ہے کہ ایک زبانداں بہ نسبت اہلِ زبان کے، ایک کم علم بہ نسبت فاضل تبحر کے، اور ایک دیہاتی گنوار بہ نسبت خواص اہل شہر کے بمراتب افضل اور اعلیٰ درجے کی رکھتا ہو۔ دوسری لیاقت اگرچہ بظاہر اہلِ زبان کے ساتھ مخصوص معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس میں بھی مثلاً ایک ہندی نژاد اکتساب کے ذریعے سے خاص کر اس حصہ زبان میں جو فارسی کی محدود شاعری میں مستعمل ہے اہلِ ایران کی برابری کر سکتا ہے۔ علامہ ابن خلدون عربی زبان کی نسبت۔ جو بمقابلہ فارسی کے نہایت وسیع زبان ہے۔ لکھتے ہیں کہ "ایک عجمی (یعنی غیر عربی) فصحائے عرب کے کلام کی ممارست سے اہلِ زبان میں شمار ہو سکتا ہے" پس فارسی زباں جو بہ نسبت عربی کے نہایت تنگ اور مختصر زبان ہے اِس بات کے زیادہ قابل ہے کہ ایک ہندی نژاد فصحائے ایران کے کلام کی مزاولت سے اہلِ زبان میں شمار کیا جائے۔

مرزا کی فارسی نظم و نثر کے متعلق ہماری رائے کا ماحصل یہ ہے کہ ان کا مرتبہ قصیدہ اور غزل میں عرفی اور نظیری کے لگ بھگ اور ظہوری سے بڑھا ہوا، مثنوی میں ظہوری کے لگ بھگ اور عرفی و نظیری سے بالا، اور نثر میں تینوں سے بالاتر ہے۔ اگرچہ مرزا کی غزل میں کہیں کہیں پیچیدگیاں ہیں،؛ اور نثر میں بھی اکثر فقرے نہایت پیچیدہ نظر آتے ہیں جو ممکن ہے کہ اہلِ زبان کے نزدیک فصاحت کے درجے سے گرے ہوئے ہوں؛ مگر ایسی کسروں سے کسی زبانداں یا اہلِ زبان کا کلام پاک نہیں ہو سکتا؛ اور نہ ایسی جزوی فروگذاشتوں سے کسی کی استادی میں فرق آ سکتا ہے۔

مرزا کے اردو کلام کی نسبت ہم دوسرے حصے میں بقدرِ ضرورت بحث کر چکے ہیں۔ مرزا کا موازنہ شعرائے اردو زبان کے ساتھ صرف غزل میں ہو سکتا ہے؛ کیونکہ غزل کے سوا دیگر اصناف میں اُن کا کلام کان لم یکن ہے؛ اور اردو کی نثر میں دیگر شعرا بمقابلہ مرزا کے صفر محض ہیں۔ مرزا کی غزل کا ڈھنگ اگرچہ میر وسودا کی روش پر نہیں ہے؛ مگر خواصِ اہلِ ملک جو تقلید کی قید سے آزاد ہیں۔ ان کے چیدہ و برگزیدہ اشعار کو میر وسودا کے انتخاب سے کچھ کم پسند نہیں کرتے۔

مرزا کی نثر اردو نے تمام ہندوستاں میں شہرت حاصل کی ہے اور خاص و عام نے بالاتفاق اس کو پسند کیا ہے۔ انھوں نے اردو خط کتابت میں ایک خاص طرز ایجاد کی ہے جو تمام ملک میں مقبول ہوئی ہے اور اکثر لوگوں نے اپنی بساط کے موافق اس کی پیروی کی ہے۔

ان تمام باتوں پر نظر کرنے کے بعد مرزا کی نسبت یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں معلوم ہوتا کہ لٹریری قابلیت کے لحاظ سے مرزا جیسا جامعِ حیثیات آدمی۔ امیر خسرو اور فیضی کے بعد آج تک ہندوستان کی خاک سے نہیں اٹھا؛ اور چونکہ زمانے کا رخ بدلا ہوا ہے اس لیے آئندہ بھی یہ امید نہیں ہے کہ قدیم طرز کی شاعری و انشا پردازی میں ایسے باکمال لوگ اِس سرزمین پر پیدا ہوں گے۔

■

ماخذ: urdunovelistblogspot.com

کلامِ حالی

دل سے خیال دوست بھلایا نہ جائے گا
سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا
تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا
بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں جانتے ہیں وہ
ہم وہ نہیں کہ ہم کو منایا نہ جائے گا
مقصود اپنا کچھ نہ کھلا لیکن اس قدر
یعنی وہ ڈھونڈتے ہیں جو پایا نہ جائے گا
جھگڑوں میں اہل دیں کے نہ حالی پڑیں بس آپ
قصہ حضور سے یہ چکایا نہ جائے گا

رنج اور رنج بھی تنہائی کا
وقت پہنچا مری رسوائی کا
عمر شاید نہ کرے آج وفا
کاٹنا ہے شب تنہائی کا
تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا
کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا
اس سے نادان ہی بن کر ملیے
کچھ اجارہ نہیں دانائی کا
کچھ تو ہے قدر تماشائی کی
ہے جو یہ شوق خود آرائی کا
یہی انجام تھا اے فصلِ خزاں
گل و بلبل کی شناسائی کا
محتسب عذر بہت ہیں لیکن
اذن ہم کو نہیں گویائی کا
ہوں گے حالی سے بہت آوارہ
گھر ابھی دور ہے رسوائی کا

☆

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہوگئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت
کس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گل تر کی صورت
ہے غمِ روزِ جدائی نہ نشاطِ شبِ وصل
ہوگئی اور ہی کچھ شام و سحر کی صورت
اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت
دیکھیے شیخ مصور سے کھچے یا نہ کھچے
صورت اور آپ سے بے عیب بشر کی صورت
واعظو آتش دوزخ سے جہاں کو تم نے
وہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت
حملہ اپنے پہ بھی اک بعد ہزیمت ہے ضرور
رہ گئی ہے یہی اک فتح و ظفر کی صورت
رہنماؤں کے ہوئے جاتے ہیں اوسان خطا
راہ میں کچھ نظر آتی ہے خطر کی صورت
ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں
یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں
کون و مکاں سے ہے دل وحشی کنارہ گیر
اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں
حالی نشاط نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقت صبح رہے رات بھر کہاں

میں تو میں غیر کو مرنے سے اب انکار نہیں
اک قیامت ہے ترے ہاتھ میں تلوار نہیں
کچھ پتا منزل مقصود کا پایا ہم نے
جب یہ جانا کہ ہمیں طاقت رفتار نہیں
ہو چکا ناز اٹھانے میں ہے گو کام تمام
للہ الحمد کہ باہم کوئی تکرار نہیں
بات جو دل میں چھپاتے نہیں بنتی حالی
سخت مشکل ہے کہ وہ قابل اظہار نہیں
اصل مقصود کا ہر چیز میں ملتا ہے پتا
ورنہ ہم اور کسی شے کے طلب گار نہیں

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے
کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے
مطمئن اس سے مسلماں نہ مسیحی نہ یہود
دوست کیا جانیے یہ چرخ کہن کس کا ہے
آج کچھ اور دنوں سے ہے سوا استغراق
عزم تسخیر پھر اے شیخ زمن کس کا ہے
آنکھ پڑتی ہے ہر اک اہل نظر کی تم پر

تم میں روپ اے گل ونسرین وسمن کس کا ہے
عشق ادھر عقل ادھر دھن میں چلے ہیں تیری
رستہ اب دیکھیے دونوں میں کٹھن کس کا ہے
ہیں فصاحت میں مثل واعظ و حالی دونوں
دیکھنا یہ ہے کہ بے لاگ سخن کس کا ہے

کہہ دو کوئی ساقی سے کہ ہم مرتے ہیں پیاسے
گر مے نہیں دے زہر ہی کا جام بلا سے
جو کچھ ہے سو ہے اس کے تغافل کی شکایت
قاصد سے ہے تکرار نہ جھگڑا ہے صبا سے
پیاسے ترے سرگشتہ ہیں جو راہ طلب میں
ہونٹوں کو وہ کرتے نہیں تر آب بقا سے
اک درد ہو بس آٹھ پہر دل میں کہ جس کو
تخفیف دوا سے ہو نہ تسکین دعا سے
جب وقت پڑے دیجیے دستک در دل پر
جھکیے فقرا سے نہ جھکیے امرا سے
حالی دل انساں میں ہے گم دولت کونین
شرمندہ ہوں کیوں غیر کے احسان وعطا سے

آگے بڑھے نہ قصۂ عشق بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم
اب بھاگتے ہیں سایۂ عشق بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم
ہنستے ہیں اس کے گریۂ بے اختیار پر
بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی رازداں سے ہم
اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پاگئے ہیں آپ کے طرز بیاں سے ہم
جنت میں تو نہیں اگر اے زخم تیغ عشق
بدلیں گے تجھ کو زندگی جاوداں سے ہم

مرثیۂ غالب

بلبل ہند مرگیا ہیہات
جس کی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس
پاک دل، پاک ذات، پاک صفات
شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج
رند اور مرجع کرام و ثقات
لاکھ مضموں اور اس کا ایک ٹھٹھول
سو تکلف اور اس کی سیدھی بات
دل میں چبھتا تھا وہ اگر بمثل
دن کو کہتا دن اور رات کو رات
ہوگیا نقش دل پہ جو لکھا
قلم اس کا تھا اور اس کی دوات
تھیں تو دلی میں اس کی باتیں تھیں
لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات
اس کے مرنے سے رگئی دلی
خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات
یاں اگر بزم تھی تو اس کی بزم
یاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات
ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا
دل کو باتیں جب اس کی یاد آئیں
کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں
کس کو جاکر سنائیں شعر و غزل
کس سے داد سخنوری پائیں
مرثیہ اُس کا لکھتے ہیں احباب
کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں
پست مضموں ہے نوحۂ استاد
کس طرح آسماں پہ پہنچائیں
لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں
اہل میت جنازہ ٹھیرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو
سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں
اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح
اہل انصاف غور فرمائیں
قدسی و صائب و اسیر و کلیم
لوگ جو چاہیں ان کو ٹھیرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں
غالب نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت
نثر حسن و جمال کی صورت
نظم غنج و دلال کی صورت
تہنیت اک نشاط کی تصویر
تعزیت اک ملال کی صورت
قال اُس کا وہ آئنہ جس میں
نظر آتی تھی حال کی صورت
اس کی توجیہ سے پکڑتی تھی
شکل امکاں محال کی صورت
اس کی تاویل سے بدلتی تھی
رنگ ہجراں وصال کی صورت
لطف آغاز سے دکھاتا تھا
سخن اُس کا مآل کی صورت
چشم دوراں سے آج چھپتی ہے
انوری و کمال کی صورت
لوح امکاں سے آج مٹتی ہے
علم و فضل و کمال کی صورت
دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے
غالب بے مثال کی صورت
اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ
کہیں ڈھونڈے نہ پائیں گے یہ لوگ

مسدس حالی سے ایک اقتباس

کسی نے یہ اک مرد دانا سے پوچھا
کہ ''نعمت ہے دنیا میں سب سے بڑی کیا؟''
کہا ''عقل جس سے ملے دین و دنیا''

کہا ”گر نہ ہو اس سے انساں کو بہرا“
کہا ”پھر اہم سب سے علم و ہنر ہے
کہ جو باعثِ افتخارِ بشر ہے“
کہا ”گر نہ ہو یہ بھی اُس کو میسر“
کہا ”مال و دولت ہے پھر سب سے بڑھ کر“
کہا ”در ہو یہ بھی اگر بند اُس پر“
کہاں ”اُس پہ بجلی کا گرنا ہے بہتر
وہ ننگِ بشر تا کہ ذلّت سے چھوٹے
خلائق سب اُس کی نحوست سے چھوٹے“
مجھے ڈر ہے اے میرے ہم قوم یارو
مبادا کہ وہ ننگِ عالم تمھیں ہو
گر اسلام کی کچھ حمیت ہے تم کو
تو جلدی سے اٹھو اور اپنی خبر لو
وگرنہ یہ قول آئے گا راست تم پر
کہ ہونے سے ان کا نہ نام ہونا ہے بہتر
رہو گے یوں ہی فارغ البال کب تک
نہ بدلوگے یہ چال اور ڈھال کب تک
رہے گی نئی پود پامال کب تک
نہ چھوڑوگے تم بھیڑیا چال کب تک
بس اگلے فسانے فراموش کردو
تعصب کے شعلے کو خاموش کردو
حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں
ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں
صدائیں یہ ہر سمت سے آرہی ہیں
کہ راجا سے پرجا تلک سب سکھی ہیں
تسلط ہے ملکوں میں امن و اماں کا
نہیں بند رستہ کسی کارواں کا
نہ بدخواہ ہے دین و ایماں کا کوئی
نہ دشمن حدیث اور قرآں کا کوئی
نہ ناقص ہے ملت کے ارکاں کا کوئی
نہ مانع شریعت کے فرماں کا کوئی
نمازیں پڑھو بے خطر معبدوں میں
اذانیں دھڑلے سے دو مسجدوں میں

کھلی ہیں سفر اور تجارت کی راہیں
نہیں بند صنعت کی حرفت کی راہیں
جو روشن ہیں تحصیل حکمت کی راہیں
تو ہموار ہیں کسبِ دولت کی راہیں
نہ گھر میں غنیم اور دُشمن کا کھٹکا
نہ باہر ہے قزاق و رہزن کا کھٹکا
مہینوں کے کٹتے ہیں رستے پلوں میں
گھروں سے سوا چین ہے منزلوں میں
ہر اک گوشہ گلزار ہے جنگلوں میں
شب و روز ہے ایمنی قافلوں میں
سفر جو کبھی تھا نمونہ سقر کا
وسیلہ ہے وہ اب سراسر ظفر کا
پہنچتی ہیں ملکوں میں دَم دم کی خبریں
چلی آتی ہیں شادی و غم کی خبریں
عیاں ہیں ہر اک براعظم کی خبریں
کھلی ہیں زمانہ پہ عالم کی خبریں
نہیں واقعہ کوئی پنہاں کہیں کا
ہے آئینہ احوال روئے زمیں کا
کرو قدر اس امن و آزادگی کی
کہ ہے صاف ہر سمت راہِ ترقی
ہر اک راہ رو کا زمانہ ہے ساتھی
یہ ہر سو سے آواز پیہم ہے آتی
کہ دشمن کا کھٹکا نہ رہزن کا ڈر ہے
نکل جاؤ رستہ ابھی بے خطر ہے
بہت قافلے دیر سے جارہے ہیں
بہت بوجھ بار اپنے لدوا رہے ہیں
بہت چل چلاؤ میں گھبرا رہے ہیں
بہت سے نہ چلنے سے پچتا رہے ہیں
مگر اک تمھیں ہو کہ سوتے ہو غافل
مبادا کہ غفلت میں کھوٹی ہو منزل
نہ بدخواہ سمجھو بس اب یاوروں کو
لٹیرے نہ ٹھہراؤ تم رہبروں کو
دو الزام پیچھے نصیحت گروں کو

ٹٹولو ذرا پہلے اپنے گھروں کو
کہ خالی ہیں یا پر ذخیرے تمھارے
برے ہیں کہ اچھے وتیرے تمھارے
امیروں کی تم سن چکے داستاں سب
چلن ہوچکے عالموں کے بیاں سب
شریفوں کی حالت ہے تم پر عیاں سب
بگڑنے کو تیار بیٹھے ہیں یاں سب
یہ بوسیدہ گھر اب گرا کا گرا ہے
ستوں مرکزِ ثقل سے ہٹ چکا ہے
یہ جو کچھ ہوا ایک شمّہ ہے اس کا
کہ جو وقت یاروں پہ ہے آنے والا
زمانہ نے اونچے سے جس کو گرایا
وہ آخر کو مٹی میں مل کر رہے گا
نہیں گرچہ کچھ قوم میں حال باقی
ابھی اور ہونا ہے پامال باقی
یہاں ہر ترقی کی غایت یہی ہے
سرانجام ہر قوم و ملت یہی ہے
سدا سے زمانہ کی عادت یہی ہے
طلسمِ جہاں کی حقیقت یہی ہے
بہت یاں ہوئے خشک چشمے اُبل کر
بہت باغ چھانٹے گئے پھول پھل کر
کہاں ہیں وہ اہرام مصری کے بانی
کہاں ہیں وہ گُردانِ زابلستانی
گئے پیشدادی کدھر اور کیانی
مٹا کر رہی سب کو دنیائے فانی
لگاؤ کہیں کھوج کلداتیوں کا
بتاؤں نشاں کوئی ساسانیوں کا
وہی ایک ہے جس کو دائم بقا ہے
جہاں کی وراثت اُسی کو سزا ہے
سوا اُس کے انجام سب کا فنا ہے
نہ کوئی رہے گا نہ کوئی رہا ہے
مسافر یہاں ہیں فقیر اور غنی سب
غلام اور آزاد ہیں رفتنی سب

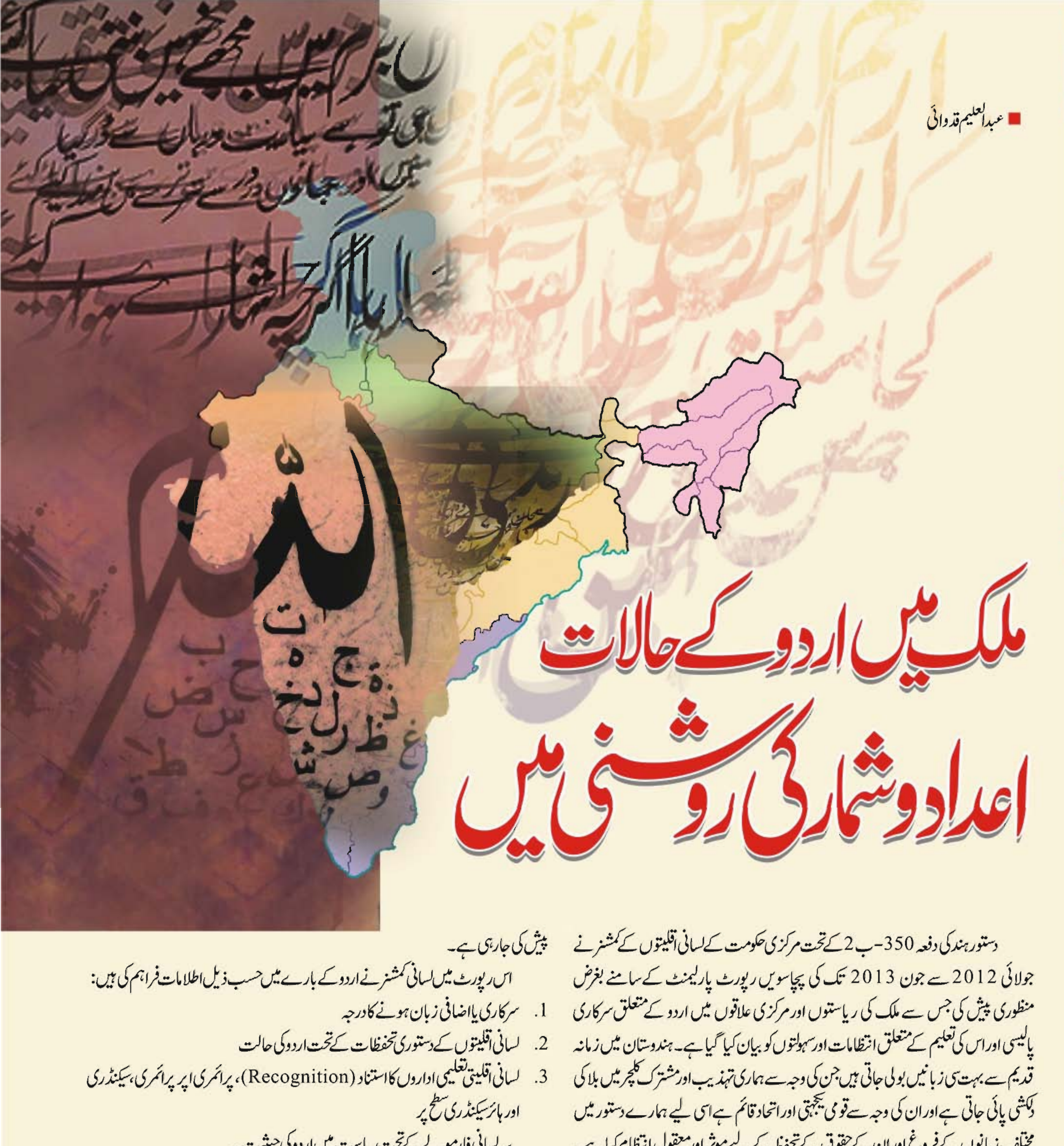

عبدالعلیم قدوائی

ملک میں اردو کے حالات اعداد و شمار کی روشنی میں

دستور ہند کی دفعہ 350-ب 2 کے تحت مرکزی حکومت کے لسانی اقلیتوں کے کمشنر نے جولائی 2012 سے جون 2013 تک کی پچاسویں رپورٹ پارلیمنٹ کے سامنے بغرض منظوری پیش کی جس سے ملک کی ریاستوں اور مرکزی علاقوں میں اردو کے متعلق سرکاری پالیسی اور اس کی تعلیم کے متعلق انتظامات اور سہولتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں زمانہ قدیم سے بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں جن کی وجہ سے ہماری تہذیب اور مشترک کلچر میں بلا کی دلکشی پائی جاتی ہے اور ان کی وجہ سے قومی یکجہتی اور اتحاد قائم ہے اسی لیے ہمارے دستور میں مختلف زبانوں کے فروغ اور ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے موثر اور معقول انتظام کیا ہے۔ بابائے قوم مہاتما گاندھی کی اس ہدایت کے مطابق، کسی بھی تہذیب کے بارے میں ملک کی مختلف اقلیتوں کے ساتھ برتاؤ کی روشنی میں کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔

اس رپورٹ میں ملک کی ریاستوں اور مرکزی علاقوں کے بارے میں اقلیتوں کی بولی جانے والی زبانوں کے متعلق سرکاری سطح پر اعداد و شمار اکٹھا کیے گئے ہیں اور لسانی اقلیتوں سے تبادلہ خیال کے بعد ان کے بہتر تحفظ اور ترقی کے لیے سفارشات پیش کی گئی ہیں۔ اس رپورٹ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی مختلف ریاستوں میں اردو کی اس وقت کیا پوزیشن ہے اور پرائمری سطح پر مادری زبان کی تعلیم اور دستور کی دفعہ 30 کے تحت اقلیتی تعلیمی اداروں میں اس کے لیے کیا انتظامات کیے گئے ہیں اور وہ کہاں تک اطمینان بخش اور مؤثر ہیں۔

چنانچہ اس مختصر مضمون میں اردو کے سلسلے میں اس رپورٹ کی تلخیص قارئین اردو کے لیے پیش کی جارہی ہے۔

اس رپورٹ میں لسانی کمشنر نے اردو کے بارے میں حسب ذیل اطلامات فراہم کی ہیں:

1. سرکاری یا اضافی زبان ہونے کا درجہ
2. لسانی اقلیتوں کے دستوری تحفظات کے تحت اردو کی حالت
3. لسانی اقلیتی تعلیمی اداروں کا استناد (Recognition)، پرائمری اپر پرائمری، سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری سطح پر

سہ لسانی فارمولے کے تحت ریاست میں اردو کی حیثیت۔

اردو اساتذہ کی منظور شدہ تعداد اور ان کے تقررات

اقلیتی زبانوں میں اردو کی درسی کتابوں کی فراہمی

اردو کو ترقی دینے کی کوششیں۔ اردو اکادمی کا قیام اور اس کا سالانہ بجٹ۔

اردو کے دستوری حقوق اور تحفظات کی نشر و اشاعت

لسانی کمشنر کی سفارشات

اس سلسلے میں لسانی اقلیتوں کے کمشنر نے ملک کی تمام ریاستوں اور مرکزی علاقوں کو ایک مفصل سوالنامہ بھیجا جس میں مندرجہ ذیل نکات پر معلومات طلب کی گئی تھیں۔ بعض ریاستوں نے کچھ سوالات کا کوئی جواب نہیں دیا یا نامکمل معلومات دیں اور جو معلومات دی گئیں وہ 2001 کی مردم شماری کے اعداد و شمار پر مبنی ہیں۔

سرکاری یا اضافی زبان کا درجہ: ملک کی حسب ذیل ریاستوں میں اردو کو سرکاری یا اضافی سرکاری زبان قرار دیا گیا ہے۔

1.	دہلی	اضافی سرکاری زبان
2.	جھارکھنڈ	اضافی سرکاری زبان
3.	بہار	دوسری سرکاری زبان
4.	جموں وکشمیر	سرکاری زبان
5.	اترپردیش	اضافی یا دوسری زبان
6.	بنگال	اضافی زبان
7.	آندھراپردیش	اضافی زبان

ملک کی ریاستوں اور مرکزی علاقوں میں اردو بولنے والوں کی تعداد اور ان کے تناسب کا گوشوارہ 2001 کی مردم شماری کے مطابق:

ریاست یا مرکزی علاقہ	1 کل آبادی	2 اردو بولنے والوں کی تعداد	3 فی صد تناسب
1. چنڈی گڑھ	900635	7254	0.81
2. دہلی	13850587	874333	6.31
3. ہریانہ	21144564	260687	1.23
4. جموں اور کشمیر	10143700	-	- اردو ریاست کی سرکاری زبان ہے مگر ریاستی حکومت نے اس کے متعلق معلومات فراہم نہیں کیں
5. پنجاب	24358999	27660	0.11
6. راجستھان	56507188	662983	1.17
7. بہار	82998509	9457548	11.39
8. جھارکھنڈ	26945829	2324411	8.63
9. مدھیہ پردیش	60348023	1186364	1.97
10. اتراکھنڈ	8489349	497081	5.86
11. اترپردیش	166197921	13272080	7.99
12. اڑیسہ	36804600	611509	1.6
13. بنگال	80176197	16,53739	2.66
14. گوا	1347668	54163	4.02
15. گجرات	50671017	550630	1.09
16. کرناٹک	52850562	5539910	10.48
17. مہاراشٹر	96878627	6895501	7.12
18. آندھرا	76210007	6575033	8.63
19. تامل ناڈو	62405679	9,42299	1.51

ان اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی 7 ریاستوں نے اردو کو سرکاری یا اضافی سرکاری زبان کا درجہ دیا ہے۔ ملک میں سب سے زیادہ اردو بولنے والے اترپردیش میں اور سب سے کم پنجاب میں ہیں۔ تعجب اور افسوس ہے کہ کشمیر، کیرالہ، شمال مشرقی ریاستوں اور لکش دیپ نے کمشنر کے بار بار لکھنے کے باوجود یہ اطلاعات فراہم نہیں کیں۔

لسانی اقلیتوں کے دستوری تحفظات اور حقوق کے مطابق اردو کی حالت مختلف ریاستوں اور مرکزی علاقوں میں اردو کی تعلیم کے پرائمری اَپر پرائمری سیکنڈری اور ہائیر سیکنڈری سطح پر نظم، طلبہ و اساتذہ کی تعداد سہ لسانی فارمولے میں اردو کا درجہ، اردو اکادمی، اردو کی درسی کتابوں کی اشاعت کی فراہمی کی اطلاعات دی گئی ہیں۔

ہماچل پردیش: 100 اردو ٹیچروں کی منظور شدہ جگہوں پر 34 کا تقرر کیا گیا۔ سولن میں حکومت ہند کی طرف سے 1973 میں اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر قائم کیا گیا ہے۔

راجستھان: پرائمری سطح پر 2548 مدرسے موجود ہیں اور 3548 اسکولوں میں 21404 طلبا اردو پڑھ رہے ہیں اور 4468 اردو ٹیچروں کو ٹھیکے پر رکھا گیا ہے۔ اَپر پرائمری کے 279 مدرستوں میں 9596 طالب علم 825 اساتذہ ہیں اور 1867 اسکولوں میں 88926 طلبا اور

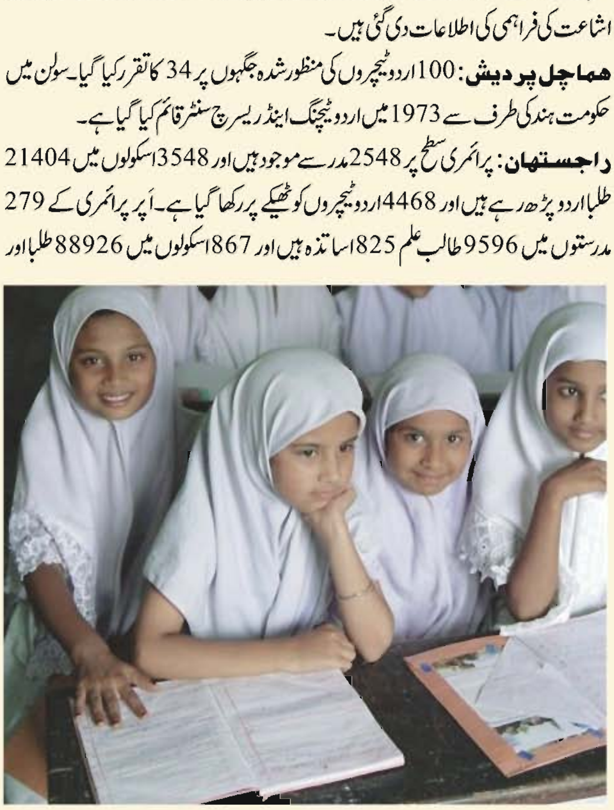

585 اساتذہ ہیں۔ سیکنڈری 347 اسکولوں میں 21600 طلبا اردو پڑھ رہے ہیں اور 469 اساتذہ کام کر رہے ہیں۔ سہ لسانی فارمولے میں اردو کو تیسری زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔ 1979 میں راجستھان اردو اکادمی قائم کی گئی جس کا 13-2012 میں 98 لاکھ کا بجٹ تھا۔

چھتیس گڑھ: 3 پرائمری اسکولوں میں 150 طلبا اور 16 اساتذہ ہیں۔ اَپر پرائمری اسکولوں میں 150 طالب علم اور 10 اساتذہ ہیں۔ 2 ہائیر سیکنڈری اسکولوں میں 175 طلبا اور 7 اساتذہ ہیں۔ اردو کو دوسری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ چھتیس گڑھ ٹکسٹ بک کارپوریشن لسانی اقلیتی طلبا کو درسی کتابیں مفت دیتی ہے۔ 2003 میں چھتیس گڑھ اردو اکادمی قائم کی گئی۔ 13-2012 میں 45 لاکھ روپے کا بجٹ منظور کیا گیا۔

مدھیہ پردیش: 72 مسلم تعلیمی اداروں کو ریاستی اقلیتی کمیشن نے تسلیم کیا ہے۔ 68 سیکنڈری اسکولوں میں 6246 طلبا اردو تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور 98 اردو ٹیچر ہیں۔ ہائیر

سیکنڈری سطح پر 29 اسکولوں میں 1873 طلبا اردو پڑھ رہے ہیں اور 32 اساتذہ کام کررہے ہیں۔ سہ لسانی فارمولے میں اردو کو تیسری زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔ 1976 میں اردو اکادمی قائم کی گئی۔ 12-2011 میں 55 لاکھ روپے کا بجٹ منظور کیا گیا۔

اتر پردیش: ضلع سنبھل میں 80 فیصد لوگ اردو بولتے ہیں۔ سیکنڈری سطح پر ریاست کے 1756 اسکولوں میں 46569 طلبا اردو پڑھ رہے ہیں جس میں 256 اردو کے اساتذہ کام کررہے ہیں۔ ہائر سیکنڈری سطح پر 464 اسکولوں میں 31617 طلبا اور 488 اساتذہ ہیں۔ سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو کو تیسری زبان کی حیثیت دی گئی ہے۔ اردو اکادمی 1972 میں قائم کی گئی جس کا 13-2012 میں 418 لاکھ روپے کا بجٹ تھا۔ درسی کتابیں لسانی اقلیتوں کے طلبا کو فراہم کی جاتی ہیں۔ 1976 میں فخر الدین میموریل کمیٹی قائم کی گئی جس کا 13-2012 کا بجٹ 44.83 لاکھ روپے تھا۔ درسی کتابیں لسانی اقلیتوں کے طلبا کو فراہم کی جاتی ہیں۔

اڑیسہ: اپر پرائمری سطح پر ریاست کے 53 مدرسوں میں 1073 طلبہ اردو پڑھ رہے ہیں اور 53 اساتذہ موجود ہیں۔ سیکنڈری سطح پر 150 اسکولوں میں اردو کے 4515 طلبا اور 150 اساتذہ ہیں۔ قادری کتب خانہ اردو کی درسی کتابیں شائع کرتا ہے۔ اڑیسہ اسٹیٹ بورڈ آف مدرسہ ایجوکیشن 1971 میں قائم کیا گیا ہے اور اس کے لیے 13-2012 میں 8000 روپے کا بجٹ منظور کیا گیا۔

بنگال: پرائمری سطح پر 476 اسکولوں میں 284147 طلبا اردو پڑھ رہے ہیں اور 1263 اساتذہ کام کررہے ہیں۔ 112 اَپر پرائمری اسکولوں میں 62478 طلبہ اور 702 اساتذہ ہیں۔ سیکنڈری سطح پر 191 اسکولوں میں 24112 طلبا اور 84 اساتذہ ہیں۔ ہائر سیکنڈری سطح پر 131 اسکولوں میں 51247 طلبا اور 498 اساتذہ ہیں۔ سہ لسانی فارمولے میں اردو پہلی زبانوں کی فہرست میں شامل ہے۔ 1978 میں ریاست میں اردو اکادمی قائم کی گئی جس کا 14-2013 کا بجٹ 8 کروڑ روپے کا تھا۔ ریاست کا محکمہ اطلاعات و ثقافتی امور اخبارات اور الیکٹریکل میڈیا کے ذریعے لسانی اقلیتوں کے دستوری تحفظات کی نشرواشاعت کرتا ہے۔

گوا: 4 پرائمری اسکولوں میں 1047 طلبہ اور 47 اساتذہ ہیں اور 2 اپر پرائمری اسکولوں میں 404 لڑکے 15 استادوں سے اردو پڑھ رہے ہیں۔ سہ لسانی فارمولے میں اردو تیسری زبان کا درجہ رکھتی ہے۔ DIET انسٹی ٹیوٹ میں اردو کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔

گجرات: ریاست کے 138 پرائمری اسکولوں میں 44050 طلبا اور 1111 اساتذہ ہیں۔ اَپر پرائمری 185 اسکولوں میں 54843 طلبا اور 1205 اساتذہ ہیں۔ ہائر سیکنڈری 16 اسکولوں میں 6131 طلبا اور 202 ٹیچر موجود ہیں۔ سہ لسانی فارمولے میں اردو پہلی زبانوں کی فہرست میں شامل ہے۔ اردو اکادمی 1993 میں قائم کی گئی۔

کرناٹک: 8 تعلقوں میں 20 فیصد سے زیادہ لوگ اردو بولتے ہیں اور 13 اضلاع میں 15 فی صد سے زیادہ لوگ اردو بولتے ہیں۔ 2321 پرائمری اسکولوں میں 339317 طلبا اور 5831 اساتذہ ہیں اور 2425 اپر پرائمری اسکولوں میں 145474 طلبا اور 15151 اساتذہ ہیں۔ 532 سیکنڈری اسکولوں میں 84690 طلبا اردو پڑھ رہے ہیں اور 4864 ٹیچر موجود ہیں۔ اردو پہلی زبانوں کی فہرست میں شامل ہے۔ اردو اکادمی قائم ہے جس کا بجٹ 40.50 لاکھ روپے ہے۔

مہاراشٹر: ریاست کے 4 اضلاع میں 31-50 فیصد کے مابین لوگ اردو بولتے ہیں اور 17 اضلاع میں 30 فیصد لوگ اردو بولتے ہیں۔ 1408 پرائمری اسکولوں میں 68819 طلبا اور 5597 اساتذہ ہیں اور 2125 اَپر پرائمری اسکولوں میں 358903 طلبا 17019 استادوں سے اردو پڑھ رہے ہیں۔ 833 سیکنڈری اسکولوں میں 178840 طلبا اور 6407 استاد ہیں۔ ہائر سیکنڈری سطح پر 419 اسکولوں میں 69213 طلبہ اور 6549 ٹیچر ہیں۔ اردو پہلی زبانوں کی فہرست میں شامل ہے۔ اردو اکادمی 1975 میں قائم کی گئی۔ 14-2013 میں 20 لاکھ روپے کا بجٹ منظور کیا گیا۔ مہاراشٹر بیورو آف ٹکسٹ بکس لسانی اقلیتوں کی درسی کتابیں چھاپتا ہے۔

کیرالہ: ریاست کے 455 سیکنڈری اسکولوں میں 38315 طلبا 377 استادوں سے اردو کی تعلیم حاصل کررہے ہیں۔

تامل ناڈو: ریاست کے ایک ضلع ویلور میں 19.31 فی صد کی زبان اردو ہے۔ 251 پرائمری اور مڈل اسکولوں میں 26450 طلبا اور 1807 اردو ٹیچر ہیں۔ 72 اپر پرائمری اسکولوں میں 9400 طلبا 848 استادوں سے اردو پڑھ رہے ہیں۔ سیکنڈری سطح پر 9 اسکولوں میں 866 طلبا اور 45 اردو ٹیچر موجود ہیں۔ لسانی اقلیتوں کے لیے درسی کتب تامل ناڈ، ٹکسٹ بک کارپوریشن فراہم کرتی ہے۔ 2006 میں ریاست میں اردو اکادمی قائم کی گئی۔

لسانی کمشنر نے ریاستی حکومتوں کے پاس اپنی سفارشات الگ الگ بھیجی ہیں جس میں زور دیا گیا ہے کہ وہ دستور ہند کی دفعہ 350 ب 2 کے تحت لسانی اقلیتوں کے تحفظات پر پوری طرح عمل درآمد کریں اور ان کے جائز حقوق کو عملی شکل دیں تاکہ ملک میں لسانی اقلیتی زبانوں کو ترقی کرنے کا پورا موقعہ ملے۔ ان سفارشات میں ریاست میں لسانی اقلیتی زبانوں کے استعمال، ان کے اسکولوں اور اساتذہ کی طرف خاص توجہ کرنے کے لیے کہا گیا ہے اور اس پروگرام کی نگرانی اور جانچ پڑتال کے لیے ایک موثر ادارہ یا محکمہ قائم کرنے کی صلاح دی گئی ہے۔

■

Abdul Aleem Qidwai, Zahida Manzil, 4/873, New Friends Colony, Aligarh - 202001 (UP)

زرینہ خانم

اردو ناول میں سادیت پسندی

انسانی شخصیت میں بہت سی الجھنیں کارفرما ہوتی ہیں وہ اس لیے کہ انسانی دماغ ایک پیچیدہ تہہ خانہ ہے جو کہ مختلف مرحلوں سے گذر کر کئی مختلف الجھنوں سے جوجھتا رہتا ہے۔ ہر انسان میں ایک وحشی جانور بھی ہوتا ہے ظلم وجبر کرنا یا کروانا اس کی فطرت کا تقاضا ہے۔

سادیت پسندی یعنی Sadism جس میں فرد کا جارحانہ رویہ ہوتا ہے۔ سامنے والے کو بے انتہا مارنے، پیٹنے یا ستانے پر تل جاتا ہے جس کا وہ کسی کمزور یا اس سے چھوٹے انسان کو اپنی سادیت کا شکار بناتا ہے تب سادیت پسند انسان ظالم اور سادیت سہنے والے مظلوم ہو جاتے ہیں۔

نفسیاتی لغت میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

"Sadism: The association of sexual pleasure with the inflicting of pain upon another. Note that pain here may take many forms other than the purely physical."
(Dictionary of Psychology - Penguin Books)

''جنسی لطف کے ساتھ دوسروں کو ایذا پہنچانا سادیت ہے۔ خاطر نشین رہے کہ ایذا دہی سے مراد محض جسمانی ایذا نہیں ہے۔''

'اذیت دہی' یا 'سادیت' (Sadism) اور اذیت جوئی یا مساکیت (Masochism) یہ دونوں جوڑے تضاد کی مثال دیتے ہیں۔ یہ عملی سے بے عملی میں تبدیل ہوتا ہے۔ اسے 'تماشیت' (Exhibitionism) اور تماشا کرنا یعنی 'اسکوپوفیلیا' (Scopophilia) یا 'نظریہ اذیت' بھی کہا جاتا ہے یہ عمل صرف جبلتوں کے اثر سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب عملی مقصد یعنی (اذیت دہی اور تماشا کرنا) کی جگہ بے عملی مقصد (اذیت جوئی اور تماشیت یا اپنے اوپر نظر ڈلوانا) سے لیتا ہے۔ اس کی یہ مثال ہو سکتی ہے جیسے محبت کا نفرت میں تبدیل ہو جانا۔ اس طرح وہ فرد جو مساکی یا اذیت جو اپنی ذات پر حملہ کے لطف میں خود بھی شامل ہوتا ہے اور تماشائی (Exhibitionist) دوسروں کی نظر میں اپنی نمائش کر کے خود بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔

سادیت یا اذیت دہی کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسرے شخص پر بے انتہا توانائی یا قوت کا استعمال کرنا چاہتا ہے۔

فرائڈ نے انسانی شخصیت کی جبلتوں میں تضاد کے جوڑوں پر زور دیا ہے۔ (1) سادیت (Sadism)، (2) مساکیت (Masochism)۔

سادیت کا مفہوم ہے ''ایذا رسائی یا اذیت دہی'' یعنی دوسروں کو اذیت دے کر اس سے لذت حاصل کرنا یا لطف لینا۔ مساکیت یا اذیت جوئی جو کہ اس کی متضاد صورت ہے یعنی خود اپنے آپ کو تکلیف پہنچا کر لذت حاصل کرنے سے ہے۔ سادیت اور مساکیت دونوں کی کارکردگی سب سے نمایاں طور پر جنسی عمل میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جنسی خواہش کی تکمیل میں مرد کا رول سادیت یا اذیت دہی کا ہوتا ہے اور عورت کا رول مساکیت یا اذیت جوئی ہوتا ہے اور دونوں اپنے اس عمل سے جنسی لذت حاصل کرتے ہیں۔ اکثر اوقات یہ کم و بیش نارمل جنسی رویہ اس قدر شدت حاصل کر جاتا ہے کہ مریضانہ شکل اختیار کر لیتا ہے کہ جنسی فعل کے علاوہ بھی مرد کو اذیت دینے اور عورت کو اذیت پانے میں لذت یا تسکین حاصل ہوتی ہے۔ جس کی مثال قبائلی زندگی کی کئی رسومات سے بھی مل سکتی ہیں اور ہمارے ادب خصوصاً فکشن میں کئی ایسے کردار پیش کیے گئے ہیں۔ یہ اذیت مار پیٹ تک بھی پہنچ سکتی ہے اور جنسی خواہش کی تسکین کا ایک ذریعہ معلوم ہوتی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے ناولٹ 'ایک چادر میلی سی' منفرد مثال ہے جو ایک جبلت کی بے حد فطری اور فنکارانہ پیش کش ہے۔

سادیت انفرادی بھی ہو سکتی ہے اور اجتماعی بھی، قومی اور سیاسی بھی۔ مثلاً بچوں میں اکثر یہ رجحان جانوروں کو ستانا، نوچنا اور بڑوں کا رویہ بچوں پر ظلم کرنا، سزا دینا، مار پیٹ کرنا وغیرہ۔ جس سے فرد لذت یا تسکین حاصل کرتا ہے۔ آئیے اب ہم چند ناولوں کے کرداروں کا اس نفسیاتی کیفیت کا جائزہ لیں۔

کرشن چندر کے ناول 'شکست' میں پنڈت سروپ سنگھ کا کردار سادیت پسند کردار ہے۔ وہ برہمن ذات کا نمائندہ ہے۔ اس کی شخصیت میں عیاری مکاری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ وہ سفید لباس میں سیاہ کارنامے انجام دیتا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر رام رام اور بغل میں چھری رہتی ہے۔ وہ روایت پرست اور جاہلیت کی مضبوط چٹان بن کر مظلوموں پر ظلم کرتا ہے۔

سروپ کشن سماج کے فرسودہ رسوم و رواج کی آڑ لے کر موہن سنگھ اور چندرا کی محبت کے درمیان چٹان بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ روایتوں کی آڑ میں اذیت دینا، محبت کا خون کرنا اس کی سادیت پسندی کو سکون دیتا ہے۔ فرسودہ روایات کے خلاف نوجوان نسل کی طاقت بے جان ہو جاتی ہے۔ سروپ کشن پرانی قدروں کو لے کر ان کی محبت کو کامیاب ہونے نہیں دیتا۔ جس کے متعلق شیام کہتا ہے۔ شیام اور ونتی کی محبت کا خون ہو رہا تھا۔ شیام سروپ کشن کے خلاف کہتا ہے کہ:

''اگر چندرا باغی تھی تو سروپ کشن روایت پرست۔ ایسا کٹر روایت پرست اس نے اپنی زندگی میں بہت کم دیکھا تھا۔ موجودہ تہذیب سے کہیں بھی کسی حالت میں بھی وہ صلح

کرنے کو تیار نہ تھا۔ یا وہ شاید سچ مچ ایک وحشی، بیدرد سنگ دل انسان تھا جسے اپنے ہم جنسوں کو ذلیل کرنے اور ستانے میں مزہ آتا تھا۔ وہ کیوں ان دونوں نوجوان دلوں کی رفاقت کو تباہ و برباد کرنا چاہتا ہے۔ اس سے اسے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ شاید زندگی جس دھارے پر جا رہی تھی وہ اس کی رو میں چٹان بن کر کھڑا ہونا چاہتا ہے اور دنیا کو بتا دینا چاہتا ہے کہ پرانی قدریں اب بھی صحیح ہیں۔''

(بیسویں صدی میں اردو ناول: ڈاکٹر یوسف سرمست، ص 382)

قاضی عبدالستار کا ناول 'غبار شب' میں جمیل اور چودھری اقبال نرائن کی ذہنی کشمکش کو پیش کیا گیا ہے، جس میں چودھری اقبال نرائن سادیت پسند ہے۔ اس کا کاروبار سود پر چلتا ہے۔ جمیل ایک پیدائشی زمین دار ہے۔ زمین داری کے خاتمے کے بعد چودھری جمیل پر برتری حاصل کرنے کے لیے فرقہ پرستی کا سہارا لیتا ہے۔ لوگوں پر ظلم و جبر سے پیش آتا ہے۔ فرقہ واریت کے بل پر چودھری اقبال نرائن اپنے آدمیوں کے ساتھ ملو قصائی کو پیٹتا ہے۔ جس سے وہ زخم اور پیاس کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔

جمیل وہاں پہنچ کر ملو قصائی کو بھجوا دینا چاہتا تھا۔ پر چودھری نے اس کی بات نہیں مانی اور ان سنی کر دی۔ کیوں کہ زمین داری ختم ہونے کے بعد چودھری کا پلڑا بھاری تھا، چودھری فرقہ پرستی کی آڑ میں اذیت رسانی سے کام لے رہا تھا۔

''آدمی کی جان لے لی، اب اور کیا لوگے اقبال نرائن'' وہ اتنے زور سے چیخا کہ خاموشی چھا گئی۔

''ایک دیوی کی جان کے بدلے میں ایک ہزار جانیں بھی تھوڑی ہیں بھیا جی... اور آپ کا قصائی تو ابھی زندہ ہے۔''

اقبال نرائن نے زہریلے انداز میں جواب دیا ''تو کاٹ دوگا۔''

''کاٹ بھی دیں گے تو کون مائی کا لال روک لے گا۔''

(قاضی عبدالستار فکر، فن اور فنکار۔ ڈاکٹر احمد خاں، ص: 101,102)

چودھری اقبال نرائن سادیت پسند انسان تھا اور جمیل کی زمین داری سے حسد کرتا تھا۔ وہ فرقہ پرستی کا سہارا لے کر ملو قصائی کو اپنے ظلم و جبر کا نشانہ بناتا ہے اور جمیل کے مقابلے اپنے آپ کو برتر ثابت کرتا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کے ناولٹ 'ایک چادر میلی سی' میں تلوکا کا کردار جارحانہ رویہ رکھتا ہے۔ تلوکا رانو کا شوہر ہے کوٹلہ گاؤں میں یکہ چلاتا ہے۔ تلوکا شراب پیتا تھا اور رانو کو شراب سے سخت نفرت تھی، وہ شراب کو تمام برائیوں کی جڑ سمجھتی تھی جس میں تلوکا اپنے آپ میں مست الست سب کچھ بھول جاتا تھا۔ رانو کو شراب کی بو بھی سخت ناگوار لگتی تھی۔ تلوکا اور رانو کے درمیان تو تو میں میں، گالی گلوچ، مار پیٹ آئے دن کا معمول ہو گیا اور ان کی گھریلو زندگی میں پس گھل گیا۔ تلوکا شراب میں اتنا غرق ہو جاتا تھا کہ پھر اسے صبح تک رانو کے وجود کی خبر نہ ہوتی۔ اس لیے شراب رانو کے لیے سوت ٹھہری اور سوت سے بھلا کوئی عورت کیسے نباہ کر سکے۔

رانو بوتل لینے دوڑی اور چشم زدن میں تلوکا نے اس کے اڑتے ہوئے بالوں کو پکڑ کر اس کو ٹیڑھا کر دیا۔ رانو تلوکا سے بے تحاشا ٹکرا گئی اور اس نے اپنے دانت تلوکا کے ہاتھ میں گاڑ دیے اور تلوکا نے غیظ و غضب میں اس بے رحمی سے بار بار دیوار کے ساتھ دے مارا اور ایسی موٹی موٹی گالیاں دیں جو شاید اس نے کبھی اپنی گھوڑی بگھی کو بھی نہ دی ہوں گی۔ گھر میں ہنگامہ

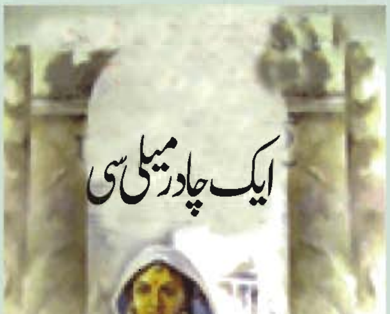

برپا ہو گیا۔ رانو غم و غصہ میں مغلوب کہے جا رہی تھی:

''میں نہیں رہوں گی میں نہیں رہوں گی۔'' تلوکا نے اکھڑی اکھڑی آواز میں رانو سے بولا'' جا، جا دیکھتا ہوں کہاں جاتی ہے؟'' ''کہیں بھی جاؤں تجھے کیا؟'' رانو روتے ہوئے بولی ''جہاں بھی جاؤں گی محنت مزدوری کر لوں گی، اپنا پیٹ بھر لونگی۔ دو روٹیوں کے لیے منگنی نہیں کہ گاؤں بھر میں جگہ نہیں میرے لیے دھرم شالہ تو ہے۔'' دھرم شالے کا نام سنتے ہی تلوکا کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہی دھرم شالہ جو گناہ گاروں اور زنا کاروں کی آماجگاہ ہے جہاں معصوم جاترنوں کی عصمت لٹتی ہے۔ پھر وہ اسے گھر میں واپس بلا لیتا ہے اور اسے موم کرنے کے لیے رادھا کرشن کی محبت کی داستان سناتا ہے، رانو موم ہو جاتی ہے۔

دوسری صبح تلوکے کی مونچھ ویسے ہی اونچی ہو گئی۔ گھوڑی کے پیروں والی کلغی ہوا میں لہرانے لگی اور وہ بولا:

''یہ نہ سمجھنا میں تجھ سے ڈر گیا ہوں''، ''میں کب کہتی ہوں؟'' رانو نے ٹالتے ہوئے کہا۔ تلوکا اس پر بھی چپ نہ ہوا ''عورتوں سے وہ ڈرتے ہیں جو نامرد ہوتے ہیں آج میں پھر لاؤں گا مٹھے لٹے کی بوتل دیکھوں گا کیسے روکتی ہے؟''

(راجندر سنگھ بیدی کے فکشن کا نفسیاتی مطالعہ۔ زرینہ خانم، ص 91)

اور یہ کوئی خالی خالی دھمکی نہ تھی بلکہ آنے والے طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ تلوکا اپنی خود سری اور رعونت میں کچھ بھی کر گزرنے پر آمادہ تھا۔ کیوں کہ وہ نامرد نہ تھا رانو نے خاموش رہنا ہی قرین مصلحت جانا کیوں کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

غضنفر کے ناول 'دویہ بانی' میں بابا کا کردار ایک Sadist کردار ہے۔ بابا جسے سوامی بھی کہتے ہیں۔ وہ ذات پات میں بھید بھاؤ رکھتا ہے۔ وہ پرانے ریت رواج، پوجا پاٹ کو مانتا ہے۔ برہمن ذات کو اعلیٰ طبقہ مانتا ہے اور ان سے کوئی برابری نہ کرے اس لیے 'دویہ بانی' سننے نہیں دیتا۔ سننے پر بڑی دردناک سزا دیتا ہے۔ جھگرو بابا کا سیوک جانے انجانے میں 'دویہ بانی' سن لیتا ہے۔ جس سے بابا جھگرو کے کان میں سیسا ڈال کر سزا دیتا ہے۔ جس سے جھگرو ہون کنڈ کے چبوترے کے نیچے پتھریلی زمین پر جھگرو کسی بلی چڑھنے والے جانور کی مانند پچھاڑیں کھا رہا تھا، آنکھوں کے ڈیلے باہر نکل آئے تھے، چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا، رگڑ سے جسم کی جلد جگہ جگہ سے چھل گئی تھی اور اس سے خون رس رہا تھا۔ اس کی دردناک چیخ دور دور تک گونج رہی تھی۔

مگر بابا کے چہرے پر اضطراب کے بجائے اطمینان تھا۔ ان کی آنکھوں میں چمک بھی تھی۔

''اس نے اپراد کیا ہے۔ ودھان کو توڑا ہے۔ مریادا کو بھنگ کیا ہے۔'' (دویہ بانی۔ غضنفر، ص 1)

جیلانی بانو کے ناول 'ایوان غزل' کا کردار ہمایوں ایذا دہی کا شکار ہے۔ وہ اپنی بیٹی غزل کو ہر وقت مارتا تھا۔ اس لیے غزل مارنے کے ڈر سے رونا بھی بند کر دیتی تھی۔ غزل کی ماں مر چکی تھی۔ بیٹی ہونے پر وہ ناخوش تھا۔ ہمایوں ایک عیش پسند انسان تھا وہ بہت ہی خود غرض تھا، وہ اپنے بیٹوں کو آنے والی دولت تصور کرتا تھا۔ غزل کی آمد نے اسے مایوس کر دیا تھا۔

ہمایوں بیٹی کی کمائی کھاتا تھا، غزل کو چودہ سال کی عمر میں ہی اسے زبردستی غلط جگہوں پر بھیجا کرتا اور پیسے کماتا تھا۔ غزل کے انکار پر مارنے لگتا تھا۔ غزل والدین کے پیار و محبت سے محروم، محبت کو پانے کی آس میں غلط راہیں اختیار کر کے راستہ بھٹک جاتی ہے جس کی وجہ سے غزل کی زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ جب اسے اس بات کا احساس ہوتا ہے تو وہ اپنا جی پھاڑ کر روتی ہے۔ جس سے گھر کے لوگ پریشان ہو جاتے ہیں۔ اس گھر کی خادمہ سایا نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا:

''رو رو کر مر جائے گی کیا۔ تیرا ابا تو ہمیشہ ہی مارا کرتا ہے۔''

(ایوان غزل۔ جیلانی بانو،ص 207)

غزل رونے سے بھی اپنے ابا سے ڈرتی تھی کیوں کہ وہ اسے اور مارے گا۔ ایک دن غزل مشہور ہستی بلگرامی کے جھوٹے پیار کو سچا پیار سمجھ کر اسے اپنا سب کچھ سونپ دیتی ہے اور اپنے آپ کو ہلکا محسوس کرنے لگتی ہے۔ وہ گھر آ کر رات کو ہنسے جا رہی تھی کہ اب اس کی زندگی بدلنے والی ہے۔ بلگرامی اس سے شادی کرے گا۔ غزل ہنسے جا رہی تھی۔ اس دن رات کو غزل کے ابا نے اس کے دہکتے بدن پر اور چار لاتیں رسید کیے تب بھی وہ ہنسے جا رہی تھی۔ جیسے آج ابا کی لاتیں پھول بن کر اسے لگ رہی ہوں۔

ہمایوں غزل سے اذیت سے پیش آتا تھا۔ شیوراج غزل کو بمبئی اکیلی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا شیوراج کئی لاکھ روپے فلمی بزنس میں لگا رکھا تھا۔ اس کی شرط یہ تھی کہ اس کے ساتھ چند رات رہو تو وہ فلم ہیروئن بنائے گا۔ مگر ہمایوں غزل کے ساتھ بمبئی آنا چاہتا تھا۔ لیکن شیوراج نہیں مانا اور پلین کی ٹکٹ کینسل کر کے چلا گیا۔ یہ سن کر ہمایوں نے سارا غصہ غزل پر اتارا۔ وہ تھوڑی دیر تک اپنی انگلیوں سے کنگھی کرتا رہا پھر غزل پر لاتوں اور گھونسوں کی بوچھار شروع کر ڈالی۔ روتی بلکتی غزل کو وہیں چھوڑ کر اپنا سامان لیے چلا گیا۔

غزل درد کی شدت سے تڑپتی گئی۔ اس کے دانتوں سے خون بہہ رہا تھا اور اس کے گال بھی سوج گئے تھے۔ ایروڈروم کی جگمگاتی روشنی میں وہ اکیلی بیٹھی رو رہی تھی۔

پیغام آفاقی کا ناول 'مکان' میں کمار اور اس کی بیوی آشا ایذادہی کی شکار ہے۔ نیرا کا مکان قبضہ کر لینا، ان کا مقصد ہے اس لیے وہ نیرا اور اس کی ماں کے ساتھ اذیت سے کام لیتے ہیں۔ نیرا میڈیکل کالج کی طالبہ ہے۔ دن میں نیرا کو کالج جانا ہوتا ہے، نیرا کی غیر حاضری میں کمار اور آشا نیرا کی ماں پر زیادتیاں کرتے ہیں۔ اس بوڑھی عورت کے ساتھ جارحانہ رویہ برتتے ہیں۔ نیرا کو ان کے ستائے جانے کا خوف اس کے کالج کلاسس میں بھی کھائے جاتا ہے۔ وہ دلچسپی سے کلاسس بھی سن نہیں پاتی کیونکہ آئے دن کمار اور آشا کی زیادتیاں بڑھتی جاتی ہیں۔

ایک دن نیرا کالج سے واپس آئی تو دیکھا کہ ماں بستر پر بے جان سی پڑی تھی۔ آنسوؤں سے تکیہ کا کنارا بھیگ گیا تھا۔ نیرا کے آنے کے بعد بیمار ماں اٹھ کر لرز کر بتایا:

''انھوں نے دھیرے دھیرے رک رک کر... ادھر ادھر جملوں میں بتایا کہ دن میں کیا ہوا تھا...''

نیرا آنگن میں جا کر کمار اور آشا سے بے بسی اور ٹوٹی ہوئی آواز میں پوچھا:

''آپ نے آج کتنی زیادتی کردی میری ماں کے ساتھ۔''

کمار کی بیوی آشا کو دھمکا کر کہتی ہے:

''ابھی کیا کیا ہے... تم تھانے جاتی ہو اب جاؤ دیکھوں وہاں پر کون تمھارا خصم بیٹھا ہے۔ اس بڈھی کا تو میں ابھی ہاتھ پاؤں توڑوں گی... اور تمھارا خاتمہ تو ایسے کراؤں گی کہ لوگ سمجھیں گے کہ تم نے خودکشی کرلی ہے یا کسی حادثے کا شکار ہوگئی ہو۔''

(پیغام آفاقی۔ مکان، ص 80)

نیرا کی ماں غیر معمولی ذہنی تناؤ کی مریض تھی۔ اس لیے نیرا نے اپنی ماں کو پھوپھی کے یہاں شملہ بھیج دیا کیوں کہ وہ کمار اور آشا کی اذیت سے مر جائے گی۔ اس کو بچانے کا یہی ایک طریقہ تھا۔

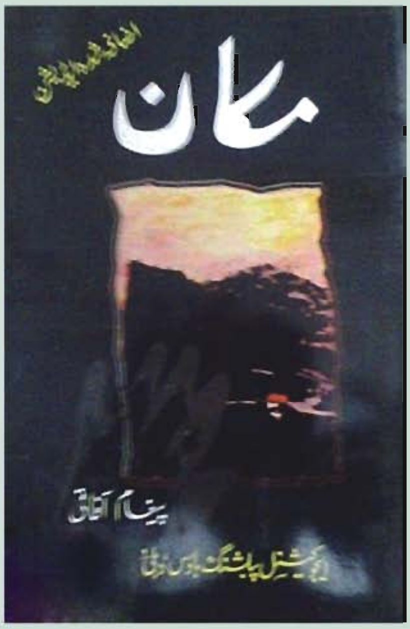

کمار اور اس کی بیوی آشا سادیت پسند ہیں۔ وہ نیرا کے گھر میں کرائے پر رہتے ہیں لیکن نیرا کے والد کے انتقال کے بعد ان بے سہارا عورتوں کو اکیلا پا کر کمار اور آشا مکان پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس مکان سے نیرا اور اس کی ماں کو بھگانے کے لیے اذیت سے پیش آتے ہیں۔ تا کہ ڈرا دھمکا کر اس مکان پر اپنا قبضہ ناحق جتانا چاہتے ہیں۔ اس لیے نیرا اور اس کی ماں پر کمار اور آشا ایذادہی سے کام لے رہے ہیں۔

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کے ناول 'کہانی کوئی سناؤ متاشا' میں متاشا کے پاپا ایذادہی کا شکار ہیں۔ وہ بات بات پر لوگوں سے جھگڑا مول لیتے ہیں جس کی وجہ سے ان پر پولیس مقدمات قائم ہوجاتے ہیں۔ وہ بہت غصے والے شخص تھے۔ دماغ کی گرمی نے آخر ایسے دن دکھائے کہ بیل پہاڑ میں ٹاٹا کی ایکسپورٹ اینٹ کی فیکٹری میں فورمین کی نوکری کرنی پڑی، جب کانٹریکٹ ہاتھ میں تھے، دادی ہمیشہ سمجھاتی رہتی تھیں:

''کم سے کم انگریزوں سے تو جھگڑا مت مول لے۔ یو بل ڈاگ، کو چھوڑ کر بات ہی نہیں کرتا۔''

(ڈاکٹر صادقہ نواب سحر۔ کہانی کوئی سناؤ متاشا، ص 15)

دادی نے بتایا کہ پاپا بڑی گندی گالیاں دیتے تھے، دوست انھیں زیادہ پیارے تھے اور وہ ہنسی مذاق میں بھی گالی گلوچ کرتے تھے۔ پاپا ممی کے ساتھ گالی گلوچ سے بات کرتے لیکن یہاں رویہ کچھ اس طرح تھا کہ وہ ممی کے ساتھ بڑی بے رحمی سے پیش آتے۔ متاشا کی ممی کو پاپا دو گھڑی بیٹھنے نہیں دیتے اور نہ دو گھڑی ان کے ساتھ بیٹھتے۔ ممی کی پٹائی کرتے وقت پاپا یہ نہیں دیکھتے کہ وہاں کوئی اور موجود ہے یا نہیں۔ ایک دن پاپا نے نانا کے سامنے ممی کو تھپڑ مارا:

''ارے یہ...'' نانا کی آواز پہلی بار داماد پر گونج اٹھی، پاپا کا ہاتھ اٹھا رہ گیا اور وہ تیزی سے کچن میں جاتے ہوئے دھیرے سے بڑبڑائے تھے۔''

انسان میں جہاں رحم و کرم، محبت، اطاعت وغیرہ جیسے مثبت اور تعمیری جذبات موجود ہیں، وہیں، انتقام، ہوس اور ظلم و جبر جیسے منفی اور تخریبی جذبات بھی اس میں فطری طور پر کارفرما ہیں۔ اس پر حالات زندگی، آدابِ معاشرہ اور مذہب کی پابندیاں وغیرہ اس کی نفسیاتی کیفیات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ سے آدمی کے حرکات وسکنات کو سمجھنا دشوار ہوجاتا ہے۔ چناں چہ کبھی کسی رندِ بلانوش سے کوئی نیکی کا کام انجام پاتا ہے تو کبھی بہت ہی نیک اور مہذب انسان بھی وحشت کا شکار ہو کر نازیبا اور غیر اخلاقی حرکتیں کر بیٹھتا ہے۔

ناول میں کرداروں کے ذریعے انسانی نفسیات کے مختلف زاویوں کو پیش کرنے کی بہت زیادہ گنجائش ہوتی ہے۔ ناول نگار اپنے کرداروں کے ذریعے نہ صرف اپنی اور اپنے عہد کی نفسیاتی کیفیات یا نفسیاتی الجھنوں کو پیش کرتا ہے بلکہ وہ کچھ اس طرح کا طرز بیان اختیار کرتا ہے کہ اسے پڑھ کر قاری کی کیتھارسس ہوجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب قاری کے لیے موجبِ تسکین قلب ہوتا ہے۔

اس مطالعے سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اردو ناولوں میں انسانی نفسیات کے سیکڑوں پہلو چھپے ہوئے ہیں۔ جس میں ایذادہی ایک پہلو ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ انھیں تلاش کیا جائے اور نفسیات کی مختلف شاخوں میں تقسیم کیا جائے۔ اس طرح نفسیات، ادب اور تنقید کا رشتہ مضبوط ہوجائے گا۔

■

Dr. Zareena Khanam, Flat No. 505, Arun Residency, H.No. 7-3-18/1 TO3/AR/505 Sagar Enclave, Birmalguda Village, Saroornagar Mandal, RR Distt. Telangana State - 500079(TL)

محمد سلمان بلرام پوری

میر کی شاعری میں عشق کا مقام اور مایوسی

میر کے تنقید نگاروں اور شارحین نے شعروادب کے حوالے سے میر کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے ان میں بہت کچھ ایسا ہے جو کہ آج بھی تشریح طلب ہے۔ اس کی صحیح قدروقیمت پہچاننے کی ضرورت ہے۔ ان کی عظمت کے اعتراف کے باوجود بہت کم لوگوں نے ان کی زندگی اور شاعری کو صحیح معنوں میں پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہیں غالب اور اقبال کو دیکھا جائے تو ان پر نہ جانے کتنے صفحات سیاہ کر ڈالے گئے ہیں۔ بہت سے تنقیدی مضامین لکھے جاچکے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ایک ہی دیوان اور کلیات پر کئی لوگوں نے کئی کئی شرحیں لکھی ہیں۔ لیکن یہاں بھی میر اپنے دل کے مرثیے لیے کھڑے رہے۔ اثر لکھنوی سے محمد حسن عسکری تک جن چند لوگوں نے ان کی شاعری اور شخصیت کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے انھیں بھی میر کی صحیح قدروقیمت پہنچاننے میں کافی دشواری ہوئی۔ میر کا شمار ان شاعروں میں ہوتا ہے جس نے خود کو چھپانے اور ظاہر کرنے میں طرح طرح کے تصورات قائم کیے۔ میر کا تصور عشق بھی ان میں سے ایک ہے۔ گویا میر کی تلاش اس منزل کی تلاش ہے جو عشق سے عشق کی منزل ہے۔

خود میر کے والد نے انھیں سب سے پہلے عشق کی تعلیم دی جس کو خود میر نے اپنی کتاب 'ذکر میر' میں نقل کیا ہے:

''بیٹا عشق کیا کرو، عشق ہی اس کارخانے میں تصرف ہے اگر عشق نہ ہوتا تو نظم کل قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ بے عشق زندگی وبال ہے۔ عشق میں جی کی بازی لگا دینا کمال ہے۔ عشق بناتا ہے، عشق ہی کندن کر دیتا ہے، دنیا میں جو کچھ ہے عشق کا ظہور ہے۔ عشق آگ کی سوزش ہے، پانی عشق کی رفتار ہے، خاک عشق کا قرار ہے، ہوا اس کا اضطرار ہے، موت عشق کی مستی ہے، زندگی عشق کی ہوشیاری ہے، رات عشق کا خواب اور دن عشق کی بیداری، مسلمان عشق کا جمال ہے، کافر عشق کا جلال ہے، نیکی عشق کا قرب ہے، گناہ عشق کی دوری ہے، جنت عشق کا شوق ہے، دوزخ عشق کا ذوق ہے۔ عشق مقام عبودیت و عارفیت و زاہدین و صدیقیت و خصوصیت ومشاقیت وخلیت وجبیت سے بہت بلند ہے۔''

(ذکر میر، مترجم نثار احمد فاروقی)

عشق وہ تصور ہے جسے صوفیا کرام نے دیا، عشق ایک مزرع زندگی ہے جہاں جان سے گزرنے کے علاوہ کچھ نہیں انا الحق کی صداؤں میں انھیں صرف یہ یاد رہا:

''عشق ایک مزرع گلاب ہے اس کی پگڈنڈیاں ان کے لیے ہیں جو عاشقوں کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ عشق کی نشانیاں توفیق اور مہربانیاں ان کی منزلیں ہیں اور مجبوریاں غم خاموش اور برداشت کبھی نہ ختم ہونے والا سوز ہمیشگی اور اذیت ناکی اس کی شان ہے۔ اس کے سوا باقی سب گم کردہ منزل جہالت اور وحشت جہالت اور وحشت تنہائی اور بے جا گردش ہے عشق مزرع زندگی ہے۔'' (دشت سوس جمیلہ ہاشمی)

صوفیائے کرام سے متاثر ہونے کے باوجود میر کا عشق اس سے قدرے مختلف تھا، ان کا عشق تو انسانی جذبات، جسمانی تقاضوں ہجر و وصال اور انسانی رشتوں کی جستجو تھا جو صدیوں سے انسان کے دل کی دھڑکن تھے۔ اس عشق نے تو خود انھیں اس جنون میں مبتلا کر دیا تھا۔ جس کے بارے میں خود میر اپنی کتاب ذکر میر میں لکھتے ہیں کہ:

''چاندنی رات میں ایک پیکر خوش صورت کمال خوبی کے ساتھ کرہ قمر سے میری طرف بڑھتا اور مجھے بے خود کر دیتا تھا۔ جدھر بھی میری آنکھ اٹھتی اس رشک قمر پر پڑتی۔ جس طرف بھی دیکھتا تھا اسی غیرت حور کا تماشا کرتا تھا۔ میرے گھر کے در و بام اور صحن (گویا) ورق تصویر ہو گئے تھے یعنی شش جہت میں وہی حیرت افزا (چہرہ) نظر آتا تھا کبھی چودہویں کے چاند کی طرح سامنے ہوتا کبھی منزل دل اس کی سیرگاہ ہوتی اگر کل مہتاب پر نظر پڑ جاتی تو گویا جان بے تاب میں آگ سی لگ جاتی۔ ہر رات اس سے صحبت رہتی اور ہر صبح اس بن

وحشت رہتی۔ جب سفید سحر نمودار ہوتا تو وہ جلے دل سے ٹھنڈی آہ بھرتی یعنی ایک آہ بھر کر چاند کی طرف واپس ہوجاتی۔ میں تمام دن جنون کرتا اور اس کی یاد میں دل کو خون کرتا۔ دیوانہ ومست کی مانند کف برلب ہاتھوں میں پتھر لیے پھرتا میں افشاں، خیزاں اور لوگ مجھ سے گریزاں۔''

(ذکر میر: مترجم نثار احمد فاروقی)

اس اقتباس سے یہ بات تو صاف طور سے واضح ہوجاتی ہے کہ عشق کی اس گرمی کو میر نے چاند میں ایک صورت نظر آنے کی بات کہہ کر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس جنون کے پیچھے کوئی راز ضرور تھا۔ اب یہ چاہے خان آرزو کے گھر یا خاندان کی کوئی لڑکی ہو یا کوئی اور ماہ پارہ مگر اس سے ایک بات واضح ہوجاتی ہے کہ صوفیانہ میلان کے باوجود میر کا عشق، میر کا عشق تھا نہ کہ ان کے والد علی متقی کا عشق جو کہتے تھے عشق الٰہی کو اپنا پیشہ کر۔ یہ میر کا اپنا عشق تھا:

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے ہو
ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
اس سے بھی تو پوچھتے کیوں اتنے تم پیارے ہوئے

گلی میں اس کی گیا سو گیا نہ بولا پھر
میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا

یہ تو حقیقت ہے کہ میر یار باش نہیں تھے۔ ہر کسی سے وہ تعلق نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی ہر کسی سے ملاقات کا شیوہ تھا۔ مگر ایسے بھی نہیں تھے کہ وہ ابن آدم سے بیزار ہوں۔ دلی پر مسلسل حملوں نے دلی کی صورت بگاڑ دی تھی۔ وہ تھے احمد شاہ ابدالی، نادر شاہ درانی اور جاٹ اور مرہٹوں کے حملے:

اے مصحفی اس کا کروں مذکور کہاں تک
اوصاف تو یہ گلشن دہلی میں خزاں تھے

ان سب کے باوجود دلی کو وہی مرکزیت حاصل تھی جو زمانۂ سلطنت اور مغلیہ دور میں اس کا طرۂ امتیاز تھا، میلے ٹھیلے، رقص وسرود اور دوسرے رسوم ورواج اور معمولات جاری تھے۔ جیسے پہلے ہوتے آئے تھے۔ شاعروں کی دھوم تھی۔ میر سجاد، میاں، صلاح الدین، میاں کمترین، میاں علی نقی، حافظ حلیم، میر درد، اور خواجہ میر کے ہاں ہر ماہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ قزلباش خان امیر، میاں شرف الدین مضمون، محمد شاکر ناجی اشرف علی خاں پیام، محمد حسین کلیم، کرم اللہ خاں درد، میاں سعادت علی خاں سعادت، اشرف علی فغاں اور دیگر شعرائے دہلی سے میر کے تعلقات اچھے تھے۔

یہ تمام سطریں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ میر انسانوں میں رہ کر انسانوں سے دور نہ تھے۔ وہ بھی سماجی زندگی کا ایک حصہ تھے جس میں حسن وعشق، عورت مرد کے جنسی تعلقات حتی کہ امرد پرستی تک کے بہانے موجود تھے:

دل عجب شہر تھا خیالوں کا
لوٹا مارا ہے حسن والوں کا

اے عشق بے محابا تو نے تو جان مارے
تک حسن کی طرف ہو کیا کیا جوان مارے

حسن اے رشک مہ نہیں رہتا
چار دن کی ہے چاندنی یہ بھی

کام تھے عشق میں بہت پر میر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

میر کے عشق پر یہ تمام اشعار اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ میر صرف درد و غم اور تیر و نشتر کے صرف شاعر نہیں بلکہ یہ خیالات اور نظریات تو میر کو اس میر سے جدا کر دیتے ہیں جس کے گواہ خود میر کے اشعار ہیں میر کے کلیات کا مطالعہ کیے بغیر اس طرح کے فیصلے میر شناسی میں کتنے معاون ہیں یہ تو وہی سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے تیر و نشتر کا شوشہ چھوڑ کر ہمیں اس میر سے دور کرنے کی کوشش کی ہے جس کے اشعار میں زندگی کا ہر رنگ موجود ہے وہ جس شہر سے گزرے وہاں محبت کی ایک نئی داستان چھوڑ آئے۔

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میر دل چاہتا ہے کیا کیا کچھ

وصل میں رنگ اُڑ گیا میرا
کیا جدائی کو منہ دکھاؤں گا

لپٹ کر سونے سے شب کی چھپی پھولوں کی جو بدھی
تو کیا ہوکر وہ جھگڑالو گلے کا ہار اُٹھ بیٹھا

میر کی وہ مثنویاں جو کہ عشق وعاشقی سے معمور ہیں، شعلہ عشق دریائے عشق، اعجاز عشق، معاملات عشق، جوش عشق وغیرہ ہیں۔ ان تمام مثنویوں کے شروع کے چند اشعار کو چھوڑ کر جو خدا اور رسول پر مبنی ہیں باقی سارے اشعار اسی عشق کی کہانی ہیں جو مرد اور عورت کی محبت کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔

میر 'شعلہ عشق' میں:

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبت مسبب محبت سبب
محبت سے آتے ہیں کار عجب

میر 'دریائے عشق' میں:

عشق ہے تازہ کار و تازہ خیال
ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال
دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا
کہیں سینے میں آہ سرد ہوا

میر 'معاملات عشق' میں

عشق سے رنگ زرد ہوتا ہے
عشق سے دل میں درد ہوتا ہے
رہتے ہیں عشق میں مژگاں تر
یہیں دیکھی ہیں آنکھیں آتے بھر

میر 'جوش عشق' میں

یعنی میرا ایک خستہ غم تھا
سرتاپا اندوہ و الم تھا
آنکھ لڑی اس کی ایک جاگہ
بے خودی ہوگئی ہے جان آگہ

میر 'اعجاز عشق' میں

رہے عشق نیرنگ سازی تری
کہ ہے کھیلنا جی پہ بازی تری
تجھی سے ہے آب رخ زرد زرد
تجھی سے میرے دل میں اٹھتا ہے درد

میر ''درحال عشق'' میں

عشق اپنا آپ ہی شیدا ہوا
تھا جو پنہا پردے میں پیدا ہوا
نظم کل کل ڈول ڈالا عشق نے
انس سے انساں نکالا عشق نے

میر کے عشق پر یہ تمام اشعار اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ میر صرف درد وغم اور تیر ونشتر کے صرف شاعر نہیں بلکہ یہ خیالات اور نظریات تو میر کو اس میر سے جدا کردیتے ہیں جس کے گواہ خود میر کے اشعار ہیں میر کے کلیات کا مطالعہ کیے بغیر اس طرح کے فیصلے میر شناسی میں کتنے معاون ہیں یہ تو وہی سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے تیر ونشتر کا شوشہ چھوڑ کر ہمیں اس میر سے دور کرنے کی کوشش کی ہے جس کے اشعار میں زندگی کا ہر رنگ موجود ہے وہ جس شہر سے گزرے وہاں محبت کی ایک نئی داستان چھوڑ آئے۔ میر تقی میر کے مطابق چاہے صوفیا کا عشق ہو یا پھر عام انسانوں کا عشق، دنیا میں ہر طرف عشق ہی عشق ہے:

عشق ہی عشق ہے جدھر دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

Mohd Salman Balrampuri, 137, S S Hall North, AMU, Aligarh - 202002 (UP)

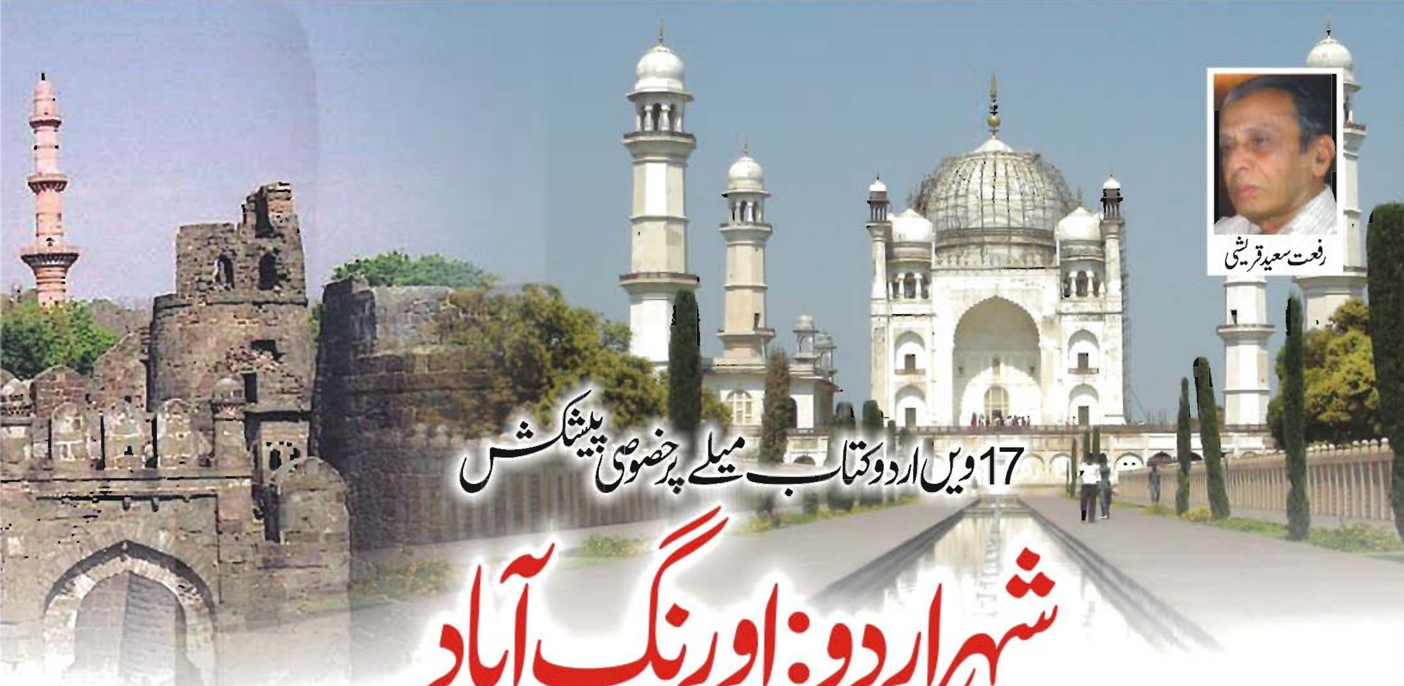

رفعت سعید قریشی

17ویں اردو کتاب میلے پر خصوصی پیشکش

شہرِ اردو: اورنگ آباد

اورنگ آباد کا شمار ہندوستان کے چند اہم تاریخی شہروں میں ہوتا ہے۔ اس کا قدیم نام کھڑکی تھا۔ جو کھام ندی کے کنارے واقع ایک سخت چٹان پر بسایا گیا تھا۔ لفظ کھڑکی علاقائی زبان میں چٹان کو کہا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے کھڑکی کہا گیا ہے۔

ملک عنبر نے اِسی مقام پر ایک جنگ میں مغلوں کو شکست دی اوراس فتح کی خوشی میں اس نے کھڑکی نام کے اس قریہ کوایک خوبصورت شہر میں تبدیل کردیا۔

ملک عنبر مرتضیٰ نظام شاہ ثانی کا ایک وفادار سپہ سالار اور وزیرالسلطنت ہی نہیں بلکہ ایک بہترین مہندس بھی تھا۔ فن تعمیر کا اچھا ذوق رکھتا تھا۔ اس کے اسی تعمیری ذوق وشوق نے کھڑکی کو ایک عالی شان شہر کی صورت عطا کی، مساجد، محلات، سرائیں وحمامات کی تعمیر کی۔ باغوں، فواروں اور جھرنوں سے شہر کو سرسبز وشاداب کیا۔ وسیع اور کشادہ سڑکوں اور خوبصورت بازاروں سے شہر کی زینت بڑھائی اور عوام الناس کے لیے نہری نظام کے ذریعے اس نے پانی کی فراہمی کا معقول بندوبست کیا۔ نہر عنبری اپنی نوعیت کی ایک انوکھی تنظیم تھی۔ کسی بھی فنی پیچیدگی سے عاری ہونے کے ساتھ ساتھ حیرت انگیز بھی۔ یہی وجہ تھی کہ نظام شاہی دربار کے امرا ووزرا نے اس نہر کی تعمیر کو بعید از قیاس بتایا تھا۔

چنانچہ ایک وزیر ملّا محمد خراسانی نے دربار میں ملک عنبر کی اس تجویز کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا تھا "اس نہر کی تعمیر کے لیے عمر نوح، صبر ایوب اور خزانۂ قارون درکار ہوگا۔"

درباری امرا کی یہ تخریبی تنقید اور حریفوں کا یہ سلوک ملک عنبر کے لیے ایک کرب سے کم نہ تھا لیکن خلقِ خدا کے لیے پانی کی فراہمی کا دلی جذبہ ملک عنبر کی ہمت کو پست نہ کرسکا۔ اس کرب و ناگواری کے عنصر کو دل سے نکال کر اُس نے اپنی تمام تر توجہ اس نہر کی تعمیر پر مرکوز کردی۔ اُسے اندازہ تھا کہ نہر کے بن جانے کے بعد کس طرح خلقت اس سے فیض یاب ہوگی۔ نہر کی اہمیت اور قدر و قیمت ملک عنبر جیسا صاحب ایمان اور ولی صفت انسان ہی جان سکتا تھا۔ نہر کی تعمیر میں ملک عنبر کی توجہ اور انہماک کے ساتھ ساتھ اُس کا اعلیٰ ذوق بھی اس راہ میں بے حد مددگار ثابت ہوا کہ اس کا یہ ذوق وشوق ایک جذباتی کیفیت بن کر نمودار ہوا جس نے اس عہد کی ایک اہم انسانی ضرورت کی تکمیل کی۔ پانی کی وافر مقدار میں فراہمی اورنگ آباد کے لاکھوں بندگان خدا کی اجتماعی ضرورت تھی۔ غرض تعمیر شروع ہوئی اور پندرہ مہینوں کی قلیل مدت میں 1024 ہجری میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔ اس کا مادہ تاریخ 'خیر جاری' 1024ھ مطابق 1620 نکلتی ہے۔

ساکنان اورنگ آباد نے نہر عنبری سے نہ صرف اپنی پیاس بجھائی بلکہ باغوں اور کھیتوں کی بھی آبیاری کی۔ یہی وجہ تھی کہ اورنگ آباد باغوں، فواروں اور آبشاروں کا شہر بن گیا۔ شہر کے ان حسین اور جانفزا نظاروں کو دیکھ کر مرزا صادق اصفہانی جو شاہ جہاں سے ملنے جُنّیر جارہا تھا۔ یہاں ٹھہر گیا اور شہر پر اپنے تاثرات یوں فی البدیہہ رقم کیے ہیں:

شہر کر کی بدید شرناگاہ	چاردم اوز چوں سپردم راہ
آب ابردہ آبجوئے بہشت	شہر عنبر نسیم مشک سرعشرت
راستی آں بنا و عنبر بود	خاک آں بقعہ مشک اوزبود
برزمین آمد آسماں گوئی	ساکنان نس ملک بہ نیکوئی

ملک عنبر جہاں میدان جنگ میں ایک حوصلہ مند، دلیر اور جنگجو سپاہی تھا وہیں شہری زندگی کا ایک مدبر، ذمے دار، باصلاحیت انسان اور عظیم معمار بھی تھا۔ اُس نے کھڑکی کے میدانی علاقے میں ایک بلند و بالا دروازہ 'بھڑکل' کی تعمیر کی۔ اِس عالی شان دروازہ کا طول وعرض مساوی ہونے کی وجہ سے یہ ایک مربع نما عمارت لگتی ہے۔ دروازے کے کواڑوں پر لگی نوک دار برچھیاں دروازے کو مزید دبدبہ اور عظمت عطا کرتی ہیں ان نوکدار برچھیوں کا ذکر عادل شاہی دربار کے شاعر ملا نصرتی نے اپنی مثنوی میں یوں کیا ہے:

اچھیں جیب خار یوں ڈاٹ کر
سینیاں ہیں بھڑکل کے جوں پاٹ کر

اِس شعر کو دور آصف جاہی کے ایک تعلقدار غلام احمد خاں نے ایک کتبہ کی شکل میں بھڑکل دروازے پر نصب کروایا، جو آج بھی اچھی حالت میں ہے۔ بھڑکل کی اوپری منزل عموماً نوبت خانے کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔ اس بھاری بھرکم دروازے کی تعمیر کے بعد بیجاپور کے حکمرانوں نے اسی فن تعمیر کے خطوط پر مشہور گول گنبد کی تعمیر کروائی۔ ملک عنبر کی تعمیر کردہ دیگر عمارتوں میں نوکنڈہ محل جامع مسجد، کالا چبوترہ اور سات کالی مساجد شامل ہیں۔ اس کے علاوہ 'پنڈت خانہ' جو ہندو دانشوروں کی مجالس اور مباحثوں کے لیے تعمیر کی گئی تھیں آج ٹاؤن ہال کے نام سے منسوب ہے۔

ملک عنبر کے ذاتی حالات: ملک عنبر کی ابتدائی زندگی انتہائی پرسوز، غیر مستحکم اور حزن وملال سے لبریز تھی۔ وہ سرزمین حبش (افریقہ) کے ایک مفلس، وحشی اور جنگجو قبیلے 'مایا' میں پیدا ہوا۔ تنگ دستی اور بھکمری کے شکار ماں باپ نے اپنے اس لخت جگر کو بردہ فروشوں کے ہاتھوں فروخت کردیا۔ لیکن قسمت نے یاوری کی کہ اُس کا آقا اور مالک ایک مہذب تعلیم یافتہ اور نیک انسان مکہ کا قاضی احمد حسین تھا جس نے اپنی اولاد کی طرح اس بچے کی پرورش کی۔ اسی تعلیم وتربیت کے نتیجے میں یہ مفلس ونادار بچہ ایک متمدن شہری اور شائستہ انسان بنا۔ اپنی محنت، لگن اور ایمان داری سے اس نے ترقی کی منزلیں طے کیں اور احمد نگر کے نظام شاہی مملکت کا

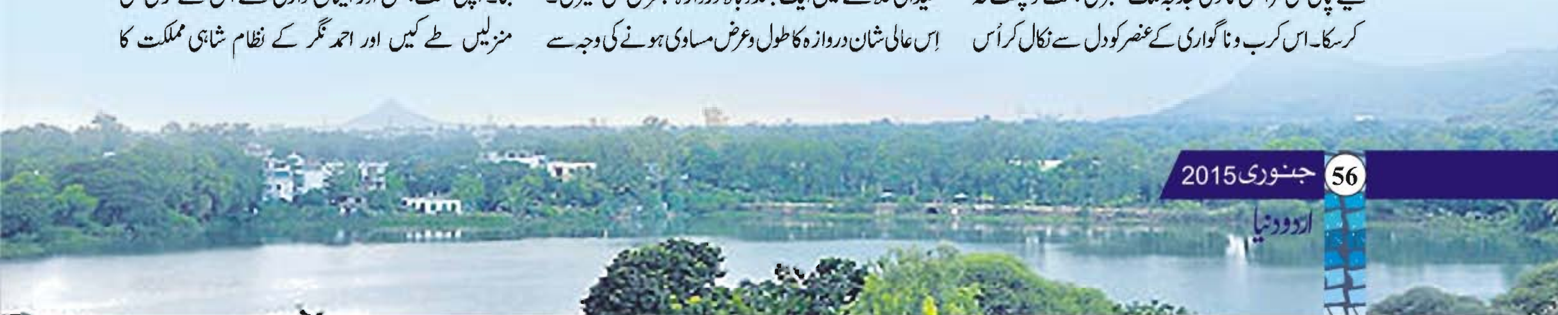

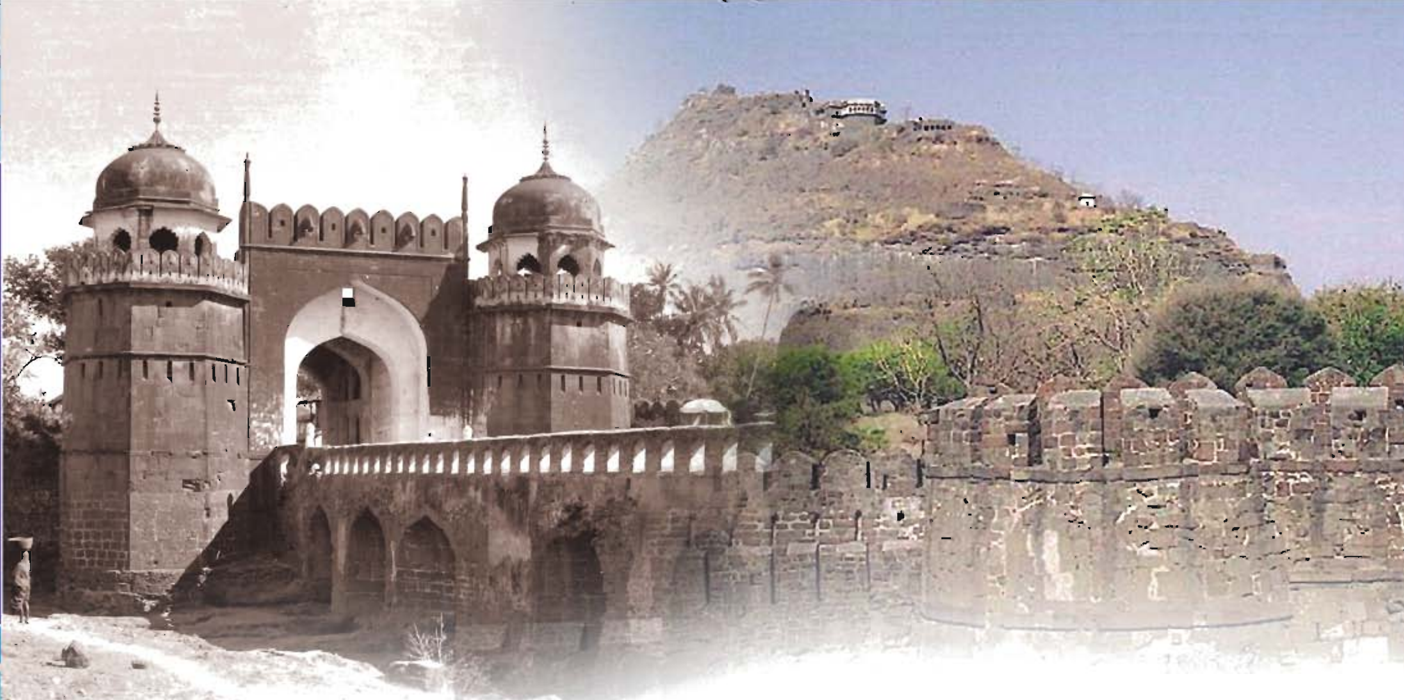

وزیر السلطنت اور سپہ سالار اعظم بن گیا۔ مغلوں کے ساتھ اس نے کئی معرکوں میں فتح حاصل کی۔ اسی لیے جہانگیر نے اسے 'سیاہ بداختر' جیسے ذلت آمیز ناموں سے یاد کیا؟ لیکن کہیں کہیں اس کی تعریف بھی کی اور کہا 'ملک عنبر' نے اپنی زندگی باعزت بسر کی۔ کسی تاریخ میں نظر سے نہیں گزرا کہ کوئی حبشی غلام اس مرتبے کو پہنچا ہو۔'' بہر حال ملک عنبر کی تمام زندگی جہاں شاندار کارناموں سے لبریز ہے وہیں نشیب و فراز کی دلسوز داستاں بھی:

کبھی مفلسی سے حقیر تھا کبھی مال و زر سے امیر تھا
کبھی کوچہ گرد فقیر تھا کبھی شاہِ شہر و دیار تھا

دکن کے اس عظیم سپوت نے 29 شعبان 1035 ہجری مطابق 1626 میں اسّی سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس کا مقبرہ خلدآباد میں حضرت خواجہ منتجب الدینؒ اور حضرت راجو قتال حسینیؒ کی درگاہوں کے درمیان واقع ہے۔ بعد وفات اس کا بیٹا فتح خاں اس کی جگہ مقرر ہوا۔ اس نے کھڑکی کا نام بدل کر اپنے نام پر فتح نگر رکھا۔

1633 میں مغلوں نے قلعہ دولت آباد کا محاصرہ کرلیا۔ فتح خاں نے اپنے بیٹے عبدالرسول کے ذریعے صلح کی پیش کش کی اور قلعے کی کنجیاں مغلوں کے حوالے کردی۔ اس طرح دولت آباد کی فتح کے ساتھ فتح نگر بھی مغلوں کے قبضے میں آگیا۔ شاہ جہاں نے اورنگ آباد میں جو صوبہ دکن کا پایہ تخت تھا، صوبہ دار مقرر کیے۔ چنانچہ اورنگ زیب 1644 تک اورنگ آباد میں صوبے دار کی حیثیت سے سلطنت کے امور انجام دیتا رہا۔ 1658 تک وہ اورنگ آباد میں رہا اور پھر جانشینی کی جنگ جیت کر اسی سال 'اورنگ زیب عالمگیر' لقب سے تخت نشین ہوا اور اورنگ آباد کے نام کے ساتھ 'خجستہ بنیاد' کا اضافہ کیا جس کا مادہ تاریخ خجستہ سے 1068 ہجری نکلتا ہے۔ 1662 میں اس نے خان جہاں کوکلتاش کو حکم دیا کہ شہر کے اطراف ایک مضبوط فصیل تعمیر کی جائے جس میں دروازے نصب ہوں۔ 1682 میں جب وہ دہلی سے اورنگ آباد آیا تو اُس نے دیکھا کہ شہر پناہ ہنوز نامکمل ہے اُس نے فوراً یہ کام دیانت خاں (دیوانِ دکن) کے سپرد کیا۔ دیانت خاں نے چار مہینے کی قلیل مدت میں اِس شہر پناہ کا کام مکمل کیا۔ شہر کی فصیل میں کئی دروازے نصب کیے گئے۔ ان میں دہلی دروازہ، مکئی دروازہ، پٹن دروازہ، روشن دروازہ، اسلام دروازہ، ظفر دروازہ، بارہ پُلّا دروازہ، خاص دروازہ، خونی دروازہ اہم دروازے شمار کیے جاتے ہیں۔ جبکہ قلعہ ارک محل کے دروازوں میں رنگین دروازہ قلعہ ارک دروازہ کالا دروازہ، عادل دروازہ اور عام خاص میدان سے متصل ایک دروازہ۔ اس طرح پانچ دروازے قلعہ ارک محل کے مختلف جانب تعمیر

کیے گئے تھے۔ قلعہ ارک کے علاوہ شہر کی فصیل کے باہر بھی دو محلات کی تعمیر عمل میں آئی تھی۔ بجانب مغرب بیگم پورہ میں جو محل تعمیر ہوا اُس میں دلرس بانو بیگم عرف رابعہ دورانی کا قیام تھا۔ دوسرا محل جانب مشرق بانجی پورہ میں تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ محل رحمت النسا بیگم عرف نواب بیگم یا نواب بائی کی قیام گاہ تھی۔ افسوس کہ آج دونوں محلات کے صرف کھنڈر دکھائی دیتے ہیں۔ قلعہ ارک میں بھی اب ہر طرف افسردگی اور ویرانی چھائی ہوئی ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور قوم کی لاپرواہی نے اِس محل کو بھی جائے عبرت بنا دیا ہے۔

قلعہ ارک: مغل بادشاہ فن تعمیر کے حسن شناس تھے۔ انھوں نے عمارتوں کی تعمیر میں جگہ کے انتخاب کو ہمیشہ اہمیت دی۔ چنانچہ دریا یا تالاب کا کنارہ اور بلندی ان کی پہلی پسند تھی۔ عمارتوں کی تعمیر میں ان کی جمالیاتی حِس کو بڑا دخل رہا۔ قلعہ رک کی تعمیر کے لیے بھی جس جگہ کا انتخاب کیا گیا وہ شہر کا سب سے بلند مقام تھا۔ اِس کے علاوہ ایک تالاب کا کنارہ بھی جو دورِ وسطیٰ میں تالاب خورد کہلاتا تھا۔ قلعہ ارک کی وقعت کا اندازہ اِس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ مشرق میں دہلی دروازہ سے جانب مغرب میدانِ عام خاص تک تقریباً 3 لاکھ مربع فٹ کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اِس وسیع و عریض محل میں مختلف عمارتیں ہیں۔ ان میں زنانہ محل (محل زینت النسا بیگم) مردانہ محل پامرکوٹھی اور تین مساجد شامل ہیں۔ ان میں سے ایک موتی مسجد ہے جو دہلی کی موتی مسجد کی طرز پر بنائی گئی ہے۔ اسی مسجد میں اورنگ زیب نے 25 سال عبادت کی اور قرآن پاک کی کتابت بھی۔ کتابت کے لیے پتھر سے تراشی گئی ایک خاص میز آج بھی مسجد میں موجود ہے۔ بیگم زینت النسا کا محل جانب مغرب ایک کافی بلند کرسی پر تعمیر کیا گیا ہے۔ محل کے نشیبی حصے میں ایک بڑا سا حوض ہے جس میں

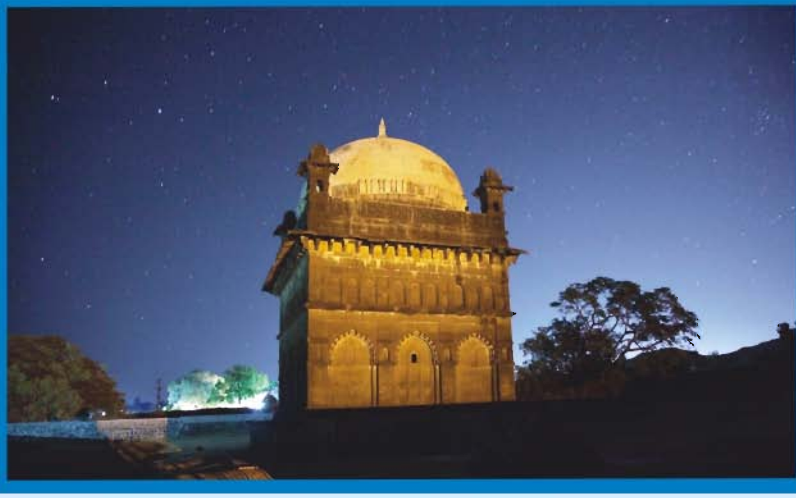

ہر وقت کنول کھلے رہتے تھے۔ نشیبی حوض سے پرے ایک باغ خالص مغل طرز پر بنایا گیا ہے۔ جو زنانی تقریبات اور بیگمات کی تفریح کے لیے مخصوص تھا۔ شاہان مغلیہ کی سرپرستی میں پلنے والی تہذیب وثقافتی سرگرمیاں اب کہاں آج قلعہ ارک میں ہر طرف ایک سناٹا ہے۔ وہاں اب نئے دور کی زنجیروں میں جکڑا ہوا بے ربط ماحول ہے۔ قوم کی اور متعلقہ محکمے کی لاپرواہی اور بے عقیدگی نے اس عظیم الشان محل کو ایک جائے عبرت بنا دیا۔

بی بی کا مقبرہ: اورنگ زیب عالمگیر کے دور کی اہم یادگار 'بی بی کا مقبرہ' ہے جو دلرس بانو بیگم عرف رابعہ دورانی کی جائے مدفن ہے۔ اس کی تعمیر 1660 میں تکمیل پائی۔ 1653 میں ایک یوروپین سیاح ٹیورنیر نے اپنے سفرنامہ 'ٹراویلس انڈیا' میں اس عمارت کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے اُس نے اورنگ آباد سے کچھ دوری پر تین سو بیل گاڑیاں دیکھی جن پر سنگ مرمر لدا ہوا تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ پتھر ملکہ کے مقبرے کی تعمیر کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔

بی بی کا مقبرہ کے متعلق عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ یہ مشہور زمانہ تاج محل آگرہ کی نقل ہے۔ پہلی نظر میں یہ ہو بہو تاج محل جیسا نظر آتا ہے۔ مقبرے کی مرکزی عمارت رقبہ میں تاج محل کے مقابلے میں 30 فیصد چھوٹی ہے۔ تاج محل کے مینار گول ہیں جب کہ مقبرے کے مینار ہشت پہلو ہیں۔ تاج محل کا مرکزی گنبد اس کے میناروں سے اونچا ہے جب کہ مقبرے کے مینار گنبد سے اونچے ہیں۔ تاج محل کی مکمل عمارت سنگ مرمر سے تیار کی گئی ہے جب کہ بی بی کا مقبرہ کا صرف مرکزی حصہ سنگ مرمر کا ہے اور باقی حصہ اسٹکو پلاسٹر ہے۔

بی بی کا مقبرہ کا جملہ رقبہ 500 گز لمبا اور 300 گز چوڑا ہے۔ اس کا مرکزی چبوترہ 72 چورس فٹ ہے اور میناروں کی بلندی بھی 72 فٹ ہے جو عمارت کو زیادہ متناسب بناتے ہیں۔ اس تمام عمارت کو 'چہار باغ' کے اصول پر تعمیر کیا جو پورے احاطے کو چار مساوی حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ مرکزی حصے میں گنبد کی عمارت ہے اور چاروں جانب باغات، حوض اور نہریں ہیں۔ اس چوکور زمین کا ہر حصہ 1240 فٹ ہے۔ ان کے علاوہ نہر نما مستطیل لمبے حوض اور ان میں لگے فوارے عمارت کو مزید دلکش بناتے ہیں۔ یہ حوض 488 فٹ طویل، عرض 9 فٹ اور تین فٹ گہرے ہیں۔ ہر حوض میں اکسٹھ فوارے مغلیہ طرز تعمیر کا اہم جز ہیں جو مغلوں کی آن بان اور شان کے مظہر ہیں۔

بوقت تعمیر پانی کی فراہمی یقیناً ایک مسئلہ تھا۔ اس پر قابو پانے کے لیے بڑے بڑے کنویں کھدوائے گئے تھے جنھیں ہاتھی کنویں کہتے ہیں۔ مقبرے کے عقب میں یہ کنویں آج بھی دکھائی دیتے ہیں۔ مقبرے کا دروازہ دراصل دو منزلہ عمارت لگتا ہے۔ اس کا مرکزی دروازہ دو کواڑوں پر مشتمل ہے جن پر دھات کی چادر چڑھائی گئی ہے اور ان پر عمدہ نقش ونگار کی صناعی کی گئی ہے۔ بائیں بازو کے کواڑ پر معمار کا نام 'عطاء اللہ بعمل ہیبت رائے' کندہ کیا ہوا ہے۔

عمارت کے شمال جانب بارہ دری، مشرق میں آئینہ محل اور مغرب میں ایک عالی شاہ مسجد ہے اور جنوب میں داخلہ دروازے کی دو منزلہ عمارت۔ غرض بی بی کا مقبرہ مغلیہ فن تعمیر کا ایک بہترین نمونہ ہے جو نہ صرف اورنگ آباد کی شان ہے بلکہ شناخت بھی۔

واضح رہے کہ اورنگ زیب کی چار بیگمات تھیں۔ بیگم اوّل دلرس بانو عرف رابعہ دورانی ایرانی النسل تھیں اور شاہ نواز خاں صفوی کی صاحب زادی۔

دیگر بیگمات میں رحمت النسا بیگم عرف نواب بیگم یا نواب بائی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کشمیر کے راجہ راجوری کی صاحب زادی تھیں۔

اورنگ زیب نے اپنی ان دونوں بیگمات کے لیے دو محل بنوائے تھے۔ دلرس بانو بیگم کے لیے بیگم پورہ میں اور نواب بیگم کے لیے بائی جی پورہ میں۔ اب دونوں محلات کھنڈر میں تبدیل ہو چکے ہیں۔

تیسری بیگم اودے پوری محل تھیں۔ یہ شہزادہ کام بخش کی والدہ تھیں۔ مورخ اور سیاح منوچی کے مطابق یہ جارجیا کی رہنے والی تھیں اور داراشکوہ کے حرم میں تھیں۔ دارا کے قتل کے بعد اورنگ زیب کے حرم میں داخل ہوئیں۔ چوتھی بیگم اورنگ آبادی محل کے نام سے جانی جاتی ہیں چونکہ یہ اورنگ آباد کے حرم میں داخل کی گئی تھیں اس لیے بیگم اورنگ آبادی محل کہلائی۔ اکتوبر 1688 میں پلیگ کے مرض میں مبتلا ہو کر بیجاپور میں انتقال کر گئیں۔ ان چار بیگمات کے علاوہ اورنگ زیب کے حرم میں ایک ایسی کنیز کا اضافہ ہوا جس کا ذکر مختلف تواریخ میں کیا گیا ہے۔

اورنگ زیب نے اپنی زندگی کے 25 سال اورنگ آباد میں بسر کیے۔ یہاں وزرا، امرا، رؤسا اور ان کے راجپوت سرداروں نے کوٹھیاں اور حویلیاں تعمیر کیں اس طرح یہاں اورنگ آباد میں کئی محلے آباد ہوئے۔ ان میں نواب پورہ، بیگم پورہ، مغل پورہ، اورنگ پورہ، منظورہ پورہ، کوتوال پورہ، فاضل پورہ، چیلی پورہ، رنمست پورہ، قطب پورہ، داؤد پورہ، پہاڑ سنگھ پورہ، جے سنگھ پورہ، اینگٹی پورہ، بلوچ پورہ، جسونت پورہ، کرن پورہ، پدم پورہ، سلطان پورہ، اہیر پورہ، مومن پورہ، سبکرن پورہ، وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ محلے ان راجگان کے تھے جو اورنگ زیب کے ساتھ اورنگ آباد آئے تھے اور جنھیں اورنگ زیب نے جاگیریں عطا کی تھیں۔ ان محلوں کے علاوہ شہر میں کئی بازار تھے ان میں شاہ گنج ایک اہم بازار تھا دیگر بازاروں میں دلال واڑی، ٹکسالی، خادم بازار، دال منڈی، چاول منڈی، صرافہ بازار، چوک، راجہ رام بازار، گروگنج، گل منڈی وغیرہ شامل ہیں۔

اورنگ زیب نے پچاس برس دو مہینے اٹھائیس دن حکومت کی اور اکیانوے برس کی عمر میں انتقال کیا۔ وفات کی تاریخ 'عالم گیر از جہاں رفت' اور 'آفتاب عالم تاب من' سے نکالی گئی۔ تدفین درگاہ حضرت زین الدینؒ کے پائیں میں ہوئی۔ شاہزادہ اعظم شاہ نے اپنے باپ کے کئی عروس پابندی کے ساتھ کیے۔ کئی عرصے تک نواب حمیدالدین خاں نے قبر کے احاطے کی جاروب کشی کی۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد معظم شاہ، بہادر شاہ کے لقب سے بادشاہ بنا۔ لیکن رفتہ رفتہ مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہوتی گئی اور آصف جاہ اوّل نے دکن میں خودمختاری کا

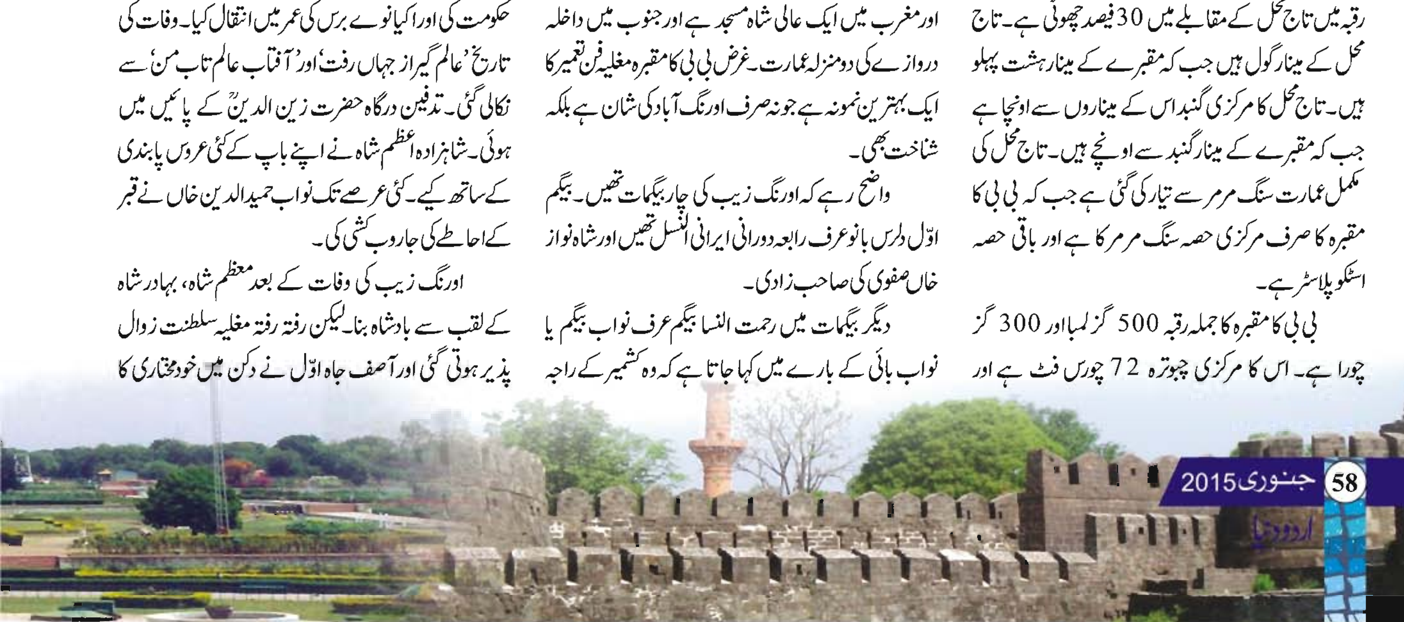

اعلان کرتے ہوئے اورنگ آباد کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ آصف جاہ اوّل نے بیس سال تک حکومت کی۔ ان کے انتقال کے بعد ناصر جنگ تخت نشین ہوئے لیکن ایک لڑائی میں شہید کردیے گئے۔ آصف جاہ اوّل کے بعد تیرہ سال تک دکن میں بڑی کشمکش رہی۔ بالآخر نظام علی خاں نے دوسرے نظام کی حیثیت سے گدی سنبھالی۔ وہ 1803 تک حکمراں رہے ان کے بعد نواب سکندر جاہ ان کے جانشین ہوئے ان کے دور حکومت میں اورنگ آباد زوال پذیر ہوتا گیا کیونکہ مذکورہ نظام نے اپنا پایہ تخت اورنگ آباد سے حیدرآباد منتقل کردیا۔ یہ اورنگ آباد کی تاریخ کا سیاہ باب تھا۔ پایہ تخت کی منتقلی سے شہر کی رونق پھیکی پڑگئی اس وقت نظام سوم نے ایک اور بے وقوفی یہ کی اس نے اورنگ آباد کا تاریخی 'بی بی کا مقبرہ' حیدرآباد لے جانے کی راہ ہموار کی۔ چنانچہ کچھ پتھر بھی نکال لیے گئے کہ اچانک کچھ ایسے واقعات ظہور پذیر ہوئے کہ اسے اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ اِس غلط ارادے اور کوشش کے ازالے کے طور پر اُس نے بی بی کا مقبرہ کے بائیں جانب مغربی حصے میں دو میناروں کے درمیان ایک مسجد تعمیر کی۔ دورِ آصف جاہی میں جن عمارتوں کی تعمیر عمل میں آئی ان میں مسجد شاہ گنج، بارہ دری گلشن محل (موجودہ کمشنر کی رہائش گاہ) دمڑی محل، صوبے داری، اور نظام بنگلہ شامل ہیں۔

چھٹے نظام میر محبوب علی خاں کے زمانے میں ان کی سلور جوبلی کی تقریبات کے موقعے پر شاہ گنج میں ایک کلاک ٹاور تعمیر کیا گیا۔ اسی وقت بھڑکل کے قریب جوبلی پارک بنایا گیا۔ اس کے علاوہ انٹرمیڈیٹ کالج کی عمارت بھی تیار ہوئی۔

پن چکی: شہر کے جانب مغرب قطب پورہ کے قریب یہ خوبصورت مقام دراصل دو صوفی بزرگوں حضرت بابا سعید پلنگ پوش اور حضرت بابا شاہ مسافر کی جائے مدفن ہے۔ سرکاری گزیٹیر کے مطابق حضرت بابا شاہ مسافر اورنگ زیب کے پیر تھے لیکن مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے جو مشہور کتابوں مآثر الکرام اور خزانۂ عامرہ کے مصنف ہیں اور بابا شاہ محمود کے ہمعصر بھی، وہ اورنگ زیب کی حضرت بابا شاہ مسافر سے ارادت مندی کے بارے میں خاموش ہیں البتہ آپ کے مرشد و ماموں حضرت بابا پلنگ پوش کے بارے میں اتنا ضرور معلوم ہوا کہ وہ نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ کے لشکر میں شریک تھے اِس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ زمانہ اورنگ زیب کا ہی تھا۔ بابا شاہ سعید پلنگ پوش کا انتقال 1110 ہجری میں ہوا۔ جسد مبارک شاہ مسافر کے اہتمام میں اورنگ آباد لایا گیا اور احاطہ پن چکی میں دفن کیا گیا۔ پن چکی کی تاریخی حیثیت صرف ایک صوفی خانقاہی نظام تک محدود نہیں بلکہ یہ اپنے نہری نظام کے لیے بھی مشہور ہے جو نہر عنبری کی

تکنیک پر ہی بنائی گئی ہے۔ پن چکی کی یہ نہر اپنے مبداء سے لے کر درگاہ شریف تک تقریباً ساڑھے چار میل لمبی ہے۔ اس نہر سے 24 گھنٹوں میں 8 لاکھ گیلن پانی آتا ہے۔ اس پانی سے اناج پیسنے کا طریقۂ کار اپنی نوعیت کا ایک انوکھا نظم ہے جس میں پانی کے دباؤ سے اناج کی چکی کو چلایا جاتا ہے۔

حضرت بابا شاہ مسافر کے واقعات و حالات میں بیان کیا گیا جاتا ہے کہ آپ ایک بڑی رقم جو بطریق نذر ملتی تھی۔ سب غریبوں، فقیروں، بیواؤں اور یتیموں پر خرچ کردیتے۔ اورنگ آباد کے مشہور و معروف چوک بازار میں اکثر آپ کی آمد ہوتی تو آپ نان بائی کی دوکان سے نان خرید کر اپنے تکیہ واقع پن چکی بھجوا دیتے۔ اسی چوک سے کپڑا خرید کر آپ غریب بوڑھی اور بیوہ عورتوں میں تقسیم کردیتے۔ حضرت اکثر علمی مباحثوں میں حصہ لیتے اور مشاعروں اور محفل سماع میں شرکت کرتے۔ چنانچہ شہر کے محمدی باغ (آج کا حمایت باغ) کے چاندنی چبوترہ کی خانقاہ میں یہ محفلیں جمتیں۔ علاقہ پن چکی اپنے کتب خانے کے لیے بھی مشہور تھا۔ یہ ایشیا کی سب سے بڑی لائبریری تصور کی جاتی تھی جس سے مستفید ہونے کے لیے یوروپین ممالک سے بھی لوگ کتابوں کی تلاش میں یہاں آتے تھے۔ مشہور دانشور مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنی زندگی کا ایک بہترین حصہ اس کتب خانے میں گزارا۔ اب پن چکی کا وہ حسن باقی ہے اور نہ ہی کتب خانہ، سوائے چند کتابوں کے تمام اثاثہ برباد ہوگیا۔

اورنگ آباد کی ادبی سرگرمیاں: شہر اورنگ آباد کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ اردو زبان کی ابتدا یہیں سے ہوئی۔ جب 1327 میں محمد تغلق نے اپنا پایہ تخت دہلی سے دولت آباد منتقل کیا تو دہلی کے متعدد علما و فضلا، شعراء، ادبا، اور مشائخین کی ایک بڑی تعداد یہاں پہنچ گئی۔ ان کی زبانیں ترکی اور فارسی تھیں اور سپاہیوں کی زبان 'برج بھاشا' اودھی اور پوربی تھیں۔ مقامی زبانیں تیلگو، مراٹھی اور کنڑی تھیں۔ ان تمام زبانوں کی آمیزش سے ایک نئی زبان وجود میں آئی جو دکھنی کہلائی۔ دکھنی زبان میں بتدریج نکھار پیدا ہوتا گیا اور یہ اپنی اعلیٰ شکل میں اردو کہلائی۔ آصف جاہ اوّل کی خودمختاری کے اعلان کے بعد جیسے ہی اورنگ آباد دکن کا پایہ تخت بنا شمال کی بالادستی رفتہ رفتہ ختم ہوتی گئی۔ شعری و ادبی میدان میں بھی دکن نے اپنی علیحدہ شناخت بنائی اور شمال کی ریختہ کے بجائے اسے زبان اورنگ آبادی کا نام دیا۔ اس طرح شہر اورنگ آباد کی لسانی اہمیت بڑھتی گئی۔ مشہور و معروف شاعر ولی اورنگ آبادی عرف ولی دکھنی نے اردو غزل کو اس مقام پر پہنچایا کہ اُس کی گونج سے دہلی کے گلی کوچے چونک اٹھے۔ ولی کی غزلوں کو شمالی ہند میں اس لیے بھی مقبولیت ملی کہ ان کی زبان میں ہندوی یا دکنی کے ساتھ ساتھ فارسی ادبی روایات کی جھلک بھی نمایاں طور پر محسوس کی گئی لیکن ولی کا دکھنی لب و لہجہ بھی اپنی جگہ قائم رہا۔ شمالی ہند کے شعر و ادب شناسوں نے ولی کے کلام کو حسنِ قبول کی سند عطا کی جس نے دکن بالخصوص اورنگ آباد کے شعری ادب کے اعتبار کو قائم رکھا۔

اس طرح ولی نے شمال اور دکن کے درمیان جو پل بنایا اُسے اورنگ آباد کے ایک اور شاعر سراج اورنگ آبادی نے اپنے لسانی شعور سے شہر کی لسانی خصوصیت کو برقرار رکھا۔ سراج اس ادبی روایت کے وارث تھے جو تیرہویں صدی عیسوی سے فروغ پارہی تھی اور جو ملا وجہی سے لے کر ولی تک مختلف مدارج طے کرتے ہوئے سراج تک پہنچی۔ ڈاکٹر محمد حسن نے سراج اورنگ آبادی کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''ادبی تاریخ میں ایسی مثالیں کم ملتی ہیں کہ تصنیف، مصنف سے زیادہ مقبول ہوئی ہو۔ سراج اورنگ آبادی کی غزل ''خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی' ایسی ہی چند نادر مثالوں میں شامل ہے۔ اگر سراج نے صرف یہی ایک غزل لکھی ہوتی تو بھی ادبی تاریخ سے ان کا نقش کبھی محو نہ ہوتا۔''

اس طرح ہند و پاک کی ادبی تاریخ میں اورنگ آباد کی ادبی

حیثیت کو ایک نمایاں مقام حاصل ہوا۔

اورنگ آباد کے دیگر قدیم شعراء میں عارف الدین خاں عاجز، ضیاء الدین پروانہ، شاہ فضلی، عنایت اللہ فتوت، میاں داؤد خاں سیاح، حمید اورنگ آبادی، داؤد اورنگ آبادی۔ اسد علی خاں تمنا اور لطف النساء امتیاز شامل ہیں۔

میاں داد خاں سیاح نے اپنے کلام کے لیے مرزا غالب جیسے استاد شاعر سے داد حاصل کی۔ غالب، سیاح کے صرف استاد ہی نہیں بلکہ دوست بھی بن گئے تھے۔ غالب کے شاگردوں، دوستوں اور طرف داروں میں سیاح اورنگ آبادی کا نام ایک افسانوی حیثیت رکھتا ہے۔ مشہور زمانہ 'ضرب المثل' ''خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو'' سیاح کی غزل کا مصرعہ اولیٰ ہے اس غزل نے میاں داد خاں سیاح اورنگ آبادی کو انجمن سخن میں ایک نمایاں مقام عطا کیا ہے۔ پورا شعر یوں ہے:

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

صفی اورنگ آبادی نے بھی فن شاعری میں اورنگ آباد کا نام روشن کیا۔ 4 فروری 1883 میں محلہ نواب پورہ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ پاکیزگی اور صفائی کو یقیناً آدھا ایمان جانتے تھے۔ کہتے ہیں:

1. آلائش زمانہ سے دامن بچا صفی
کتا بھی بیٹھتا ہے جگہ اپنی جھاڑ کے

خودداری ان کی رگ وجان میں سرایت کر گئی تھی۔

ایک اور شاعر

سکندر علی وجد اورنگ آبادی نے جہاں خوبصورت غزلیں لکھیں۔ وہیں ان کی نظموں کے اشعار قاری کو صرف پسند نہیں آتے بلکہ دل میں اتر جاتے ہیں۔ مشہور زمانہ نظم 'اجنتا' ہو کہ کاروانِ زندگی، تاج محل ہو کہ رقاصہ ہر شعر قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا ان کی نظم 'اجنتا' کا معاملہ تقریباً وہی ہے جو سراج کی 'خبر تحیر عشق سن' کا ہے کہ وجد کی نظم اجنتا نے بھی عالمی شہرت پائی۔

اورنگ آباد کا ثقافتی پس منظر: اورنگ آباد کی تہذیب وثقافت تقریباً 2 ہزار سال پرانی ہے جہاں شہر کے قرب و جوار میں واقع غارہائے اجنتا اور ایلورہ میں ماہرین فن نے اپنے کمال کا جادو جگایا ہے ان پرسکون وادیوں میں ہنرمندوں نے تخیل انسانی کے وہ لاجواب اور لافانی نقش بنائے ہیں جسے دیکھ کر ناظرین دنگ رہ جاتے ہیں۔ غاروں میں موجود فن سنگ تراشی اور مصوری کے شاہ کار ہمیں حیات و کائنات کے گہرے رموز سے آگاہ کرتے ہیں۔ ان عظیم فن کاروں کے پاس ایسا فکر آمیز اور فکر انگیز تخیل تھا جو ہمیں حقائق کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اسی لیے سکندر علی وجد اپنی نظم اجنتا میں کہتے ہیں:

یہ تصویریں بظاہر ساکت و خاموش رہتی ہیں
مگر اہل نظر پوچھیں تو دل کی بات کہتی ہیں

اورنگ آباد کے اِس ثقافتی ورثے کو قائم رکھنے اور ان کے تحفظ کے لیے نظام حیدر آباد نے مولوی غلام یزدانی کو محکمہ آثار قدیمہ کا ناظم مقرر کر کے ان غاروں کی بقا کو ممکن بنایا۔ اورنگ آباد کے نامور مصور سید احمد خان بہادر اور نظیر محمد صدیقی نے ان مصوری کے نادر نمونوں کو کینوس پر اتار کر پینٹنگز کے دھندے نقوش کو نئی زندگی دی۔

اورنگ آباد کی اس تہذیبی ثقافت کو ملک و بیرون ملک عام کرنے کے لیے آرٹ و تاریخ کے قدردانوں نے شہر میں ثقافتی میلے کا اہتمام کیا جو 'اورنگ آباد ایلورہ فیسٹول' کے نام سے دنیا بھر میں مشہور ہوا اس میلے کے روح رواں ڈاکٹر مورو پنچی کر اور ڈاکٹر دلاری قریشی نے میلے کے ذریعے اورنگ آباد کو عالمی شہرت دلائی۔ اِس میں رقص و موسیقی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کو بھی اجاگر کیا گیا۔ مشاعروں اور قوالی کے اہتمام سے مسلم ثقافت کو روشناس کروایا گیا۔ کیونکہ یہ دیکھا جا رہا ہے کہ نئی نسل اپنی تاریخ و ثقافت اور میراث سے نابلد ہوتی جا رہی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اپنی زبان اردو سے بھی لاتعلق ہوتی جا رہی ہے اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ ماضی کی تہذیب وتمدن کو جدید حقائق کی روشنی میں عظمت رفتہ کی بازیابی کو ممکن بنایا جائے۔

اورنگ آباد کے دانشوروں، مورخوں اور ادبا نے ہماری تاریخ وثقافت کو اپنی تصنیفات کے ذریعے اورنگ آباد کا ہمہ جہت تعارف پیش کیا ہے جو یقیناً قیمتی تاریخی دستاویزی مرقع ہیں۔ مآثر الامرا، منتخب الباب، تاریخ فرشتہ، مآثر عالم گیری، روضۃ الاقطاب، واقعات مملکت بیجاپور، دکن کے بہمنی سلاطین، روضۃ الاولیا، خزانۂ عامرہ، رحلہ، ملفوظات نقشبندیہ وہ قابل قدر تصنیفات ہیں جو ہمیں دکن، بالخصوص اورنگ آباد دکن کی تاریخی وتہذیبی روایتوں سے واقف کراتی ہیں۔

اورنگ آباد کی ثقافتی تاریخ کا یہ باب نامکمل رہے گا تاوقتیکہ اس میں یہاں کی دستی مصنوعات، روایتی کھانوں اور لباس کا ذکر نہ کیا جائے۔ ہمیں محمد تغلق کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس کی دولت آباد آمد نے اورنگ آباد کے ساکنان کو لشکری کھانا (نان قلیہ) لشکری زبان (اردو) اور خوبصورت دستی صفت ہمرو مشروع جیسے قیمتی تحفے جات دیے ہیں۔ محمد تغلق کے سپاہوں، علماء کرام، دانشوروں اور دیگر عوام وخواص نے جب مقامی لوگوں سے بازاروں میں ربط پیدا کیا تو ہر دو کی زبانوں کی آمیزش سے جو زبان بنی وہ دکھنی یا ہندوی تھی۔ یہ دکھنی بتدریج نکھرتی گئی اور نئی نئی صورت میں اردو کہلائی۔ ترکی میں اردو کے معنی لشکر کے ہوتے ہیں چنانچہ یہ زبان اولاً لشکر کے سپاہیوں اور مقامی بازاروں میں لین دین سے ظہور میں آئی۔ اس طرح اورنگ آباد اردو کا مورد قرار پایا۔

محمد تغلق کی فوج میں موجود سپاہیوں کے کھانے کے لیے ایک ایسے حکام کا بندوبست کیا گیا جو کم وقت میں ہزاروں لوگوں کو افراط سے کھانا کھلا سکے چنانچہ کسی منظم ضابطہ اور مسالوں کی مقدار کا تعین کیے بغیر بڑی بڑی دیگوں میں اشیائے خوردنی وگوشت ڈال کر قلیہ تیار کیا گیا۔ اسی طرح روٹی کے لیے زیر زمین تندور لگا کر بہ یک وقت ہزاروں نان پکائے جاتے اور یہی کھانا 'نان قلیہ' کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ روایتی کھانا اورنگ آبادیوں کی مرغوب ترین غذا ہے۔ اس روایتی کھانے کے بغیر کوئی بھی تقریب ادھوری سمجھی جاتی ہے۔

محمد تغلق کی منتقلی پایہ تخت نے ہمیں ایک اور ورثہ دستی صنعت کی صورت میں عطا کیا جو ایران سے دہلی ہوتے ہوئے دلی سے دولت آباد اور پھر اورنگ آباد پہنچی۔ یہ صنعت ہمرو مشروع اور کمخواب کے نام سے آج بھی اورنگ آباد میں تیار کی جاتی ہے۔ سوت اور ریشم کے تانے بانے سے تیار کردہ ہمرو آج کل بیرون ملک کے سیاحوں میں زیادہ مقبول ہے۔ دورِ وسطیٰ میں اس کے اچکن تیار ہوتے تھے۔ دور آصف جاہی میں ہمرو کی شیروانیاں بہت مقبول لباس تھا۔ شہر کے قدیم قریشی خاندان کی اپنی اِس آبائی صنعت سے دلچسپی نے اسے آج تک زندہ رکھا ہے۔

عام خاص میدان: شہر کا قدیم کھیل کود کا میدان عام خاص بادشاہوں کے لیے ہی نہیں بلکہ عوام کے لیے بھی کھلا تھا۔ یہاں شہزادے مخصوص اوقات میں چوگان کھیلتے اور باقی اوقات میں یہ عوام کے لیے دے دیا جاتا تھا۔ آج اس میدان میں نوجوان نسل فٹ بال اور کرکٹ کھیلتی ہے۔ یہاں پر نمائشیں بھی لگائی جاتی ہیں نیز سیاسی تقاریر کے لیے بھی اس میدان کا استعمال کیا جاتا ہے۔ تاریخی جامع مسجد اور فصیل کے درمیان واقع عام خاص میدان میں کل ہند اردو میلے کا انعقاد یقیناً ایک نیک شگون ہے۔ اردو کے چاہنے والوں کے لیے، اردو کتابیں تصنیف کرنے والوں کے لیے، قلمکاروں کے لیے اور ان قارئین کے لیے جو اردو کتب کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہتے ہیں۔ ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' کے عہدے داران و اسٹاف قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس تاریخی شہر میں اردو کی ترقی کے لیے ایک ایسا قدم اٹھایا ہے جو یقیناً اردو زبان اور اردو والوں کے حق میں فالِ نیک ثابت ہوگا۔

■

Rifat Sayeed Qureishi, Plot No. 4, Professors Colony, Dehli Gate, Aurangabad - 431001 (MS)

اسما مسعود

جیت آپ کی مٹھی میں ہے

آپ کیا ہیں؟ اور کیا بننا چاہتے ہیں؟ آپ اپنے سے یہ دو سوال کیجیے۔ ایپل کے اسٹیو جابس نے ایک بار بہت پتے کی بات کہی تھی کہ آپ کی زندگی کا سب سے اہم لمحہ وہ ہے جس میں آپ یہ طے کر پاتے ہیں کہ آپ کو کرنا کیا ہے؟ اپنی صلاحیتوں، اپنی کمزوریوں، اپنی دلچسپی اور اپنے مقصد کی تلاش ضروری ہے۔ جو انسان بغیر مقصد کے وقت گزارتا ہے وہ ترقی نہیں کرسکتا۔ workless انسان warthless ہوتا ہے۔ آپ کی اصلیت آپ کے مقصد اور آپ کے خواب میں چھپی ہے۔ جب کوئی خواب آنکھ کھولتا ہے یا کوئی مقصد انگڑائی لیتا ہے تو اسے جیت لینے کا عزم اور حوصلہ سانس لینے لگتا ہے۔ اگر کوئی خواب ہی نہیں کوئی مقصد ہی نہیں تو کہاں کی امنگ اور کہاں کا حوصلہ؟

آپ کا مقصد تبھی پورا ہوسکتا ہے جب وہ واضح ہو۔ صرف خواب دیکھنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اپنے مقصد کی گائڈ لائن بنائیے۔ ایک طے شدہ وقت اور Goal سامنے رکھیے۔ ساتھ ہی اپنی خوبیوں اور کمزوریوں پر بھی نظر رکھیے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ انجینئر بننے کا مقصد طے کرلیں اور حساب میں اور تیج ہوں۔ اپنی صلاحیتوں کو نظر میں رکھتے ہوئے اپنا مقصد طے کیجیے۔ مقصد طے ہونے کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ وہ آپ کے لیے ناممکن نہ ہو لیکن اپنی صلاحیتوں کو کم مت آنکیے۔ میں یہ کر ہی نہیں سکتا۔ یا دیکھتا ہوں کہ میں یہ کرسکتا ہوں کہ نہیں۔ اس طرح کا غیر یقینی نظریہ آپ کو ابتدا میں ہی شکست سے ہم کنار کردے گا۔ اپنی خوبیوں پر یقین رکھیے اور کمزوریوں پر قابو پائیے۔ اے پی جے عبدالکلام نے ہمارے ملک کے نوجوانوں سے کہا تھا کہ اپنی آنکھوں میں کوئی خواب سجائیے اور انھیں سچ کرنے کے لیے پوری طاقت سے جٹ جائیے۔

اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے حوصلہ، امنگ اور لگن ہونا ضروری ہے۔ Disire کے ساتھ Fire ہونا چاہیے۔ آپ کے اندر کی آگ اس وقت تک جلتی رہنی ضروری ہے جب تک آپ اپنی زندگی کے مقصد کو حاصل نہ کرلیں۔ آپ کے اندر کی آگ اور لگن آپ کو خود اعتمادی سے بھر دے گی۔ یہ اندر سے آپ کو مضبوط بنائے گی اور آپ رکاوٹوں کا سامنا کرتے ہوئے آگے بڑھتے جائیں گے۔ خود کو بار بار Motivate کیجیے۔ چھوٹی سی کامیابی پر بھی پیٹھ تھپتھپائیے۔ یہ عمل آپ کو نئی طاقت سے بھر دے گا اور خود اعتمادی پیدا کرے گا کہ واقعی آپ یہ کرسکتے ہیں۔

اپریل اور مئی کا مہینہ اکیڈمک اور پروفیشنل امتحانات کا وقت ہوتا ہے۔ ہر نوجوان اپنا کریئر بنانا چاہتا ہے۔ لیکن کامیابی صرف چند ہی لوگوں کو حاصل ہو پاتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ کامیابی کے لیے کوئی شارٹ کٹ نہیں ہے۔ بہترین کریئر career بنانے اور زندگی میں بلندی پر پہنچنے کے تین کی ورڈس Key-words ہیں۔ علم، عمل اور صلاحیت سے Knowledge, Action & Skill

مقابلے کے اسی دور میں ایک رات جاگ کر کی گئی پڑھائی یا ایک مہینے کی پڑھائی سے ہم کامیاب نہیں ہوسکتے۔ یہاں وہی کامیاب ہوتا ہے جس کی اپنے علم پر گہری پکڑ ہو۔ کامیابی حاصل کرنے کے لیے Basics کلیئر کیجیے۔ آپ جس کریئر کا یا جس مقصد کا انتخاب کریں اس کے بنیادی علم پر مضبوط پکڑ بنائیے۔ کام کرنے کے بنیادی طریقے اور فارمولوں کی سمجھ ہونا ضروری ہے۔ مقابلے کے امتحانات کی تیاری کرنے والے کئی سال قبل سے تیاری شروع کردیتے ہیں۔ امتحانات میں کامیاب طلبہ کو دیکھیں گے تو پائیں گے کہ ان ہی کو کامیابی ملتی ہے جن کا بیسکس کلیئر ہے۔

علم کے ساتھ عمل ضروری ہے۔ لیکن عمل کا بنیادی اصول یہ ہے کہ صحیح وقت پر صحیح کام کیا جائے۔ وقت کی اہمیت پہچانیے۔ وقت بڑا کرشمائی ہوتا ہے۔ آج ہم جو وقت بچاتے ہیں وہی کل ہم بناتے ہیں۔ مقابلے کے امتحانات کی تیاری میں اگر آپ لگاتار ڈیڈ لائن بیسڈ اسٹڈی کرتے ہیں اور اپنے ہر سبجیکٹ کو برابر وقت دیتے ہیں تو کامیابی یقینی ہے۔ کامپیٹیشن کے دور میں ایک ایک منٹ قیمتی ہے ایسے میں ٹائم مینجمنٹ کا ہنر جاننے والوں کو کوئی پیچھے نہیں کرسکتا۔

یہ زمانہ صرف کتابی علم تک خود کو محدود رکھنے کا نہیں ہے۔ اپنے Skill کو سنواریے۔ بنیادی صلاحیتوں کے علاوہ ہر فیلڈ کی مخصوص Professional Skills بھی اہمیت رکھتی ہیں۔ اپنے کریئر کی باریکیوں اور ضرورتوں کو سمجھیے اور صلاحیتوں اور لیاقت کو بڑھائیے۔

Skills کو سنوارنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ جہاں بھی ہیں کچھ نہ کچھ ضرور سیکھتے رہیے اور ہر پل خود کو کچھ نیا سیکھنے کے لیے تیار رکھیے۔ نئی ٹیکنالوجی کا علم آج کی ضرورت ہے۔ کمپیوٹر علم میں مہارت، سوشل نیٹ ورکنگ کی سمجھ، کمپیوٹر اپلی کیشن، رائٹنگ، اسپیکنگ وغیرہ میں مہارت آپ کی کامیابی کے مواقع بڑھانے میں مددگار ہیں۔

صرف ٹیکنالوجی کا علم ہی نہیں کمیونیکیشن اسکل اور سافٹ اسکل بھی آج کے وقت کی بڑی ضرورتیں ہیں۔ کریئر کے بہت سے میدان جیسے مثلاً مارکیٹنگ، ٹیچنگ، وکالت وغیرہ جہاں کمیونیکیشن اسکل میں مہارت ترقی کی پہلی سیڑھی ہے۔ اسی طرح بات چیت کا پراثر طریقہ، نرم لہجہ، انگریزی میں مہارت یہ سب آپ کی شخصیت کونکھارتے ہیں اور آپ کے کریئر کوتابناک بناتے ہیں۔

اپنی شخصیت کونکھارنے کے لیے کچھ باتوں پر عمل کیجیے:

(1) اندر سے خوش رہیے۔
(2) روز صبح آئینے کے سامنے کھڑے ہوں اور ہاتھ پھیلا کر کہیے۔ I am the best
(3) اپنے آپ سے کہیے ''میں کرسکتا ہوں''، ''میں کروں گا''/''میں کروں گی'' I can, I will
(4) DNA اور PPF آپ کے دوست ہیں انھیں پہچانیے۔

DNA یعنی Discover Your natural awareness اپنی فطری لیاقت کو پہچانیے اور اسے بڑھانے کی کوشش کیجیے۔

PPF یعنی Patience, Potential & Performance صبر رکھیے۔ اپنی طاقت اور پرفارمینس کو بڑھایئے۔

(5) اپنا ایک Vision بنایئے اور اس پر پوری محنت اور لگن سے آگے بڑھیے۔
(6) بزرگوں اور ٹیچرس کی عزت کیجیے اور ان کے مشوروں کی روشنی میں زندگی سنواریئے۔
(7) چھوٹی شروعات سے ڈریئے مت۔ امبانی ہوں یا نارائن مورتی سب نے ایک چھوٹی جگہ سے شروعات کی تھی۔
(8) کسی ایک زبان پر Command حاصل کرنے کی کوشش کریں۔
(9) علم بہت ضروری ہے۔ آپ جس میدان سے بھی تعلق رکھتے ہوں اس پر Command حاصل کرنے کی کوشش کریں۔
(10) پڑھنے کی عادت ڈالیے۔
(11) زندگی صرف ایک بار ملتی ہے اپنے وقت کو برباد مت کیجیے۔ ایسے جیو کہ زندگی کل ہی آ کر لے جائے گی۔
(12) محنت کی عادت ڈالیے آرام کے ساتھ کچھ نہیں ملتا۔
(13) جب بھی کوئی کام ہاتھ میں لیجیے تو اسے پورا کیجیے۔
(14) غیر ضروری کاموں میں اپنی زندگی کو برباد مت کیجیے۔ ہر چیز کی Priority طے کیجیے۔ کام کرنے سے پہلے خود سے پوچھیے کہ یہ کام ضروری ہے؟ یا یہ کام جلدی کا ہے؟ Important پر Urgent کو حاوی مت ہونے دیجیے۔
(15) اپنی خوبیوں کو پہچانیے اور انھیں grow کیجیے۔
(16) ہمیشہ خود کو upgrade کرتے رہیے اور وقت کے قدم سے قدم ملا کر چلیے۔

محنت اور جدوجہد کامیابی کی بنیادی سیڑھیاں ہیں۔ انگریزی میں کہا جاتا ہے Struggle and Shine۔ یہ بے حد طاقت دینے والا جملہ ہے اور زندگی میں آگے بڑھنے کے لیے ہمیں تیار کرتا ہے۔ زندگی صرف خوشیوں اور کامیابیوں کا نام نہیں ہے۔ یہاں مشکلیں بھی آتی ہیں۔ رکاوٹیں بھی آتی ہیں۔ لیکن ان ہی تجربوں سے ہم کامیابی کی طرف بڑھتے ہیں۔ بدقسمت ہیں وہ لوگ جو بغیر ٹھوکر کھائے منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے ہاتھ تجربوں سے خالی رہ جاتے ہیں۔ اس لیے مشکلوں اور رکاوٹوں سے گھبرانے کے بجائے ان کا سامنا کیجیے۔ جیتنے کے لیے جدوجہد کیجیے۔ یقینا یہ مشکلیں اور رکاوٹیں آپ کی شخصیت کو اور نکھار دیں گی۔ کیونکہ ایک پرسکون سمندر میں کبھی کوئی ملّاح باصلاحیت نہیں بن سکتا۔

A smooth sea never made a skillful mariner.

آپ جیتنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ یاد رکھیے آپ کا نظریہ آپ کو کامیاب یا ناکام بناتا ہے۔ آپ کا چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، آپ کا پہناوا اور اپنے آپ کو پیش کرنے کا طریقہ یہ سب آپ کے خیالات اور آپ کے نظریے کو ظاہر کرتے ہیں۔ جو کچھ ہم بننے کا یقین رکھتے ہیں وہی بن جاتے ہیں۔ چیزوں کو دیکھنے کا مثبت positive نظریہ ہمیں فتح کے قریب لے جاتا ہے اور منفی Negative نظریہ ہمیں دماغی طور پر ہار جانے کے لیے تیار کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جیسا ہمارا نظریہ ہوگا ویسے ہی ہم بن جائیں گے۔

لگاتار جدوجہد کرنا اور زندگی کو دیکھنے کا مثبت نظریہ کس طرح کامیابی کو ہمارے قدموں میں ڈال دیتا ہے۔ اس کی بہترین مثال KFC یعنی Kentucky Fried Chicken کے کرنل سینڈرسی ہیں۔ جب انھوں نے زندگی میں کچھ کرگزرنے کا فیصلہ کیا تو جیب میں رقم بہت معمولی تھی۔ وہ کھانے کی ایک ریسیپی Recipee بیچنے کے لیے گھر سے نکلے لیکن اس کا خریدار ڈھونڈھنے کے لیے انھیں بہت پاپڑ بیلنے پڑے۔ آخر کار قریب ایک ہزار دروازوں پر دھکے کھانے کے بعد انھیں اس کا خریدار ملا۔ اگر وہ پہلے کچھ دروازوں پر انکار سننے کے بعد ہار کر بیٹھ جاتے یا عام ہارنے والوں کی طرح سوچتے کہ میں نے تو بہت کوشش کی شاید جیتنا میرا مقدر نہیں تھا تو آج وہ پوری دنیا میں KFC کے نام سے مشہور نہ ہوتے۔

اسی لیے نظریہ بدلیے منظر خود بہ خود بدل جائے گا۔

مختصر یہ کہ اپنے خواب کو بیچیے مت۔ اپنے مقصد کو زندہ رکھیے۔ جو اپنے خواب اپنے مقصد کو بھلا دیتا ہے وہ اپنی شکست کی عبارت خود لکھ دیتا ہے اور اپنا بھروسہ اپنا یقین اور اپنا حوصلہ سب کچھ گنوا دیتا ہے۔ ہمیں ہارنا نہیں ہے۔ ضرورت ہے اپنا مقصد بنانے کی۔ اس پر لگاتار محنت کرنے کی اور وقفے وقفے سے اس پر نظر ثانی کرتے رہنے کی۔ کیونکہ کامیابی تکّے سے نہیں ملتی، محنت سے ملتی ہے۔ سیکھیں نتیجوں پر محنت کرنے کا ہنر۔ اگر آپ کریئر career کے کسی خاص مقام کو پانا چاہتے ہیں تو نتیجوں پر محنت کریں اور خود کو ثابت قدم رکھیں:

جو مل گیا ہے اس سے بھی بہتر تلاش کر
قطرے میں بھی چھپا ہے سمندر تلاش کر
ہاتھوں کی ان لکیروں نے مجھ سے یہی کہا
کوشش سے اپنی اپنا مقدر تلاش کر

■

Dr. Asma Masood, Lecturer, Govt. P.G Dungar College, Bikaner (Raj)

تبصرہ وتعارف

کلیات محمد قلی قطب شاہ

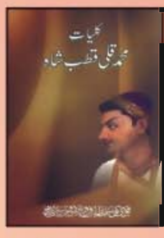

مرتبہ: ڈاکٹر سیدہ جعفر
صفحات: 823، قیمت: 233 روپے، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: خلیق الزماں نصرت، پلاٹ نمبر 5، سائی نگر کالونی، ممبئی

اردو کی ابتدا دکن سے ہوئی۔ اس نظریے سے اختلاف اپنی جگہ ہے لیکن دکھنی شاعری اردو کی ابتدائی شاعری ہے۔ خود میر نے کہا تھا:

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے — معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

شمال کی ابتدائی اردو کو ریختہ کہا جاتا ہے۔ شمالی ہند کی اردو شاعری سے قبل دکن میں شاعری شروع ہوگئی تھی۔ سلطان محمد قطب شاہ 1565 مطابق 14 رمضان 973ھ بروز جمعہ پیدا ہوئے۔ وہ اپنے والد ابراہیم قطب شاہ کے انتقال کے بعد 15 جون 1680 کو تخت نشیں ہوئے۔ جہاں انھوں نے مدرسے، مسجدیں، خانقاہیں اور بڑی بڑی عمارتیں بنوائیں وہیں دکھنی زبان میں شاعری بھی کی۔ انھوں نے فنونِ لطیفہ کو فروغ دیا۔ وہ خود بھی شاعر تھے اور مشاعروں اور ادب نوازوں کی عزت بھی کرتے تھے۔ وہ شاعری میں قطب تخلص کرتے تھے۔ محمد قلی قطب شاہ دکن کے پروردہ تھے۔ دکھنی شعر وادب نے اردو کے ابتدائی دور کو سنبھالے ہوئے موجودہ دور کی اردو تک پہنچایا ہے۔ اس لیے بھی اس زمانے کی شاعری کے مطالعے کی اہمیت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اس کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے محمد قلی قطب شاہ کا کلیات شائع کیا ہے۔ اپنی روایت کے مطابق یہ کتاب کافی خوبصورت چھپی ہے۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اس کتاب کی مرتبہ دکھنی ادب کی ماہر لسانیات محترمہ ڈاکٹر سیدہ جعفر ہیں۔ اس میدان میں انھوں نے کافی کام کیا ہے۔ مرتبہ کی صلاحیت کا ہر کوئی معترف ہے۔ قومی کونسل نے نایاب یا کمیاب کتابوں کے شائع کرنے کا سلسلہ کافی عرصے سے جاری رکھا ہے اور اس کی نکاسی کے بھی معقول اور جدید راستے نکالے ہیں۔ ہندوستان کے کونے کونے میں اردو کونسل کا گشتی کتب خانہ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ وقتاً فوقتاً ہندوستان کی خاص خاص جگہوں پر کتاب میلہ لگانے کی وجہ سے کتابوں سے لوگوں کی دلچسپی بڑھی ہے۔ ابھی حال ہی میں مالیگاؤں (مہاراشٹر) کے کتاب میلہ نے ماضی کے تمام ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔

اب آئیے محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کے بارے میں بات کریں۔ ابتدا میں مرتبہ کے 280 صفحات پر مشتمل مقدمہ ہے جو اردو کے اسکالر اور طلبہ کے لیے نہایت کارآمد ہے۔ اس میں محترمہ نے علم وادب کا گراں مایہ سرمایہ مہیا کر دیا ہے۔ اس میں انھوں نے قطب شاہی دور کی پوری معلومات دی ہے جو کسی تاریخ کے اوراق لگتے ہیں۔ اس میں جابجا تصویریں دی گئی ہیں جس سے کتب بینی کو تقویت ملتی ہے۔ کتاب میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ قابل ذکر بات تو یہ ہے کہ جگہ جگہ پر حوالے دیے گئے ہیں تاکہ ان کے پڑھنے والوں کو کچھ اور جاننا ہو تو اس کتاب کو بھی دیکھ سکتے ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ کی شاعری اس کے عہد کی عکاس ہے۔ اس میں ہندوستان کی طرز زندگی، رسومات اس قدر سمائے ہوئے ہیں کہ یہ پوری چیز داستان سی لگتی ہے۔ کئی شعر میں تو لباس کا ذکر ہے، کہیں محلات اور کھیل کود کے واقعات درج ہیں۔ اس زمانے کے جشن کا جگہ جگہ ذکر ہے۔ ان تمام باتوں کو پڑھنے کے بعد محمد قلی قطب شاہ کی قادر الکلامی کا پتہ چلتا ہے۔ ایک سلطان وہ بھی اس قدر ذہین وفطین، یہ خوبی بہت کم سلطانوں میں نظر آتی ہے۔ یہ تمام چیزیں اردو ادب کے خزانے کا گراں بہا سرمایہ ہے۔ بسنت رت کے بارے میں قلی قطب شاہ کے چند اشعار دیکھتے ہیں:

پپیہا گاوتا ہے میٹھے بیناں — مدھر رس دے ادھر پھل کا پیالہ
گرج بادل تھے دادر گیت گاوے — کوئل کوکے سو پھل بن کے خیالا
(بیناں = بین کی جمع — دادر = مینڈک — خیالا = خیال)

عید رمضاں کے بارے میں صرف ایک شعر ہے.....

رمضان عید آیا ہے مل کر فیروزی سوں — خوشی وخرمی ہوا سوں آنند نوروزی

اب یہ شعر دیکھیں.......

ہمارا سجن خوش نظر باز ہے — تو اس دل میں سب عشق کا راز ہے
پیاری کے نیناں ہیں جیسے کٹارے — نہ سُم اس کے انگے کوئی ہیں دودھارے

ان اشعار کو پڑھنے کا لطف تب آئے گا جب آپ ان کو ہماری زبان اردو کی ابتدائی شاعری (دکھنی) سمجھ کر پڑھیں گے۔

ترتیب کے پرانے طریقوں میں ایک اضافے کی ضرورت ہے۔ ہر شعر کے دکھنی یا عربی فارسی کے الفاظ کے معنی اس کے نیچے حاشیے میں دیے جائیں۔ دکھنی الفاظ کی ایک فرہنگ کتاب کے آخر میں دی گئی ہے۔ یہ بھی بہت کارآمد ہے۔ اس کلیات میں محمد قلی قطب شاہ کا غیر مطبوعہ کلام بھی شامل ہے۔ اس سے مرتبہ کی مشکل پسندی کا اندازہ ہوتا ہے۔

کونسل کا یہ قدم قابلِ تحسین ہے۔ ریاستی سرکار کی اکادمیوں کو بھی اس طرز پر کام کرنا چاہیے۔ اس کمر توڑ مہنگائی کے زمانے میں بھی کونسل کم قیمت پر نایاب کتابیں شائع کر رہی ہے۔ اس کی وجہ سے بھی ایک کتاب کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو رہے ہیں۔

اسلامی تہذیب و تمدن

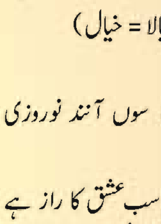

مصنف: عماد الحسن آزاد فاروقی
صفحات: 197، قیمت: 76 روپے، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر عبدالحمید، گیسٹ لیکچرر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'اسلامی تہذیب وتمدن' عماد الحسن آزاد فاروقی کی شہرۂ آفاق کتاب

ہے۔ انھوں نے اسلامی تہذیب وتمدن اور اس کے پس منظر کو اردو زبان میں تصنیف کر کے اردو کے قارئین کو ایک نئی دنیا سے روشناس کرایا جو لائق ستائش ہے حالانکہ اس موضوع پر اور بھی کتابیں اردو زبان میں دستیاب ہیں لیکن ان میں کہیں نہ کہیں ان مواد سے متعلق یا ان موضوعات سے متعلق تشنگی پائی جاتی ہے۔ جبکہ مذکورہ کتاب، مواد، موضوع، ہیئت اور حجم کے اعتبار سے مکمل ہے۔ اس میں ان تمام چیزوں کو شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ابواب بندی میں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں اسلامی تہذیب وتمدن کے علاوہ ان تہذیبوں پر بھی خامہ فرسائی کی گئی ہے جو اسلامی تہذیب کے فروغ واستحکام میں مدومعاون ثابت ہوئی ہیں یا جن کے ڈانڈے اسلامی تہذیب وتمدن سے ملتے ہیں۔ مثلاً یونانی تہذیب، رومی تہذیب، مصری تہذیب، ساسانی تہذیب اور سمیری تہذیب وغیرہ ان تہذیبوں کو اسلامی تہذیب کے پس منظر کے طور پر بیان کیا ہے۔

فاضل مصنف نے اس کتاب کو گیارہ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب اسلامی تہذیب کا گہوارہ— ہلال زرخیز، اسلامی تہذیب اور ہلال زرخیز۔ ہلال زرخیز میں تہذیب کی ابتدا اور اس کی ترقی پر منحصر ہے۔ دوسرا باب سمیری تہذیب پر مبنی ہے جس میں تعارف، سیاسی اور سماجی تنظیم، بین الاقوامی تجارت، علوم وفنون، فن تحریر کی ایجاد، فن تعمیر، ہلال زرخیز کی دیگر تہذیبیں زیر بحث ہیں۔ اس طرح تیسرا باب مصری تہذیب، تعارف، سیاسی وسماجی تنظیم، علوم وفنون اور علوم پر چوتھا باب حتیٰ اور فونیقی تہذیب، پانچواں باب یونانی تہذیب پر مبنی ہے اس میں مائسینی تہذیب، یونانی تہذیب کا احیا، یونانی تہذیب کی منفرد دین، نیز فلسفہ اور سائنس پر گفتگو کی گئی ہے جبکہ چھٹا باب ایرانی تہذیب، تعارف و تاریخ انتظام سلطنت، فن تعمیر، ساتواں باب وسیع تر یونانی یا ہیلنی تہذیب، تعارف، فلیپ اور سکندر اعظم، ڈیاڈوچی یا ملوک الطوائف، اسکندریہ کا کتب خانہ، سائنسی ترقیات، فلسفیانہ رجحانات اور فنون لطیفہ جیسے موضوعات پر منحصر ہے۔ آٹھواں باب رومی حکومت اور تمدن، تعارف، رومی قانون آثار قدیمہ، رومی سلطنت کا زوال، نواں، باب، بازنطینی سلطنت اور تمدن، تعارف، انتظام سلطنت، بین الاقوامی تجارت، فوجی نظام، علوم وفنون، فنون لطیفہ، دسواں باب، ساسانی تمدن، تعارف و تاریخ، سماجی طبقات اور انتظامیہ، معاشرتی زندگی، فلسفہ اور دنیوی علوم، فنون لطیفہ اور گیارہواں اور آخری باب مغربی ایشیائی ورثہ اور اسلامی تہذیب کا ارتقا پر مرکوز ہے۔

مذکورہ ابواب میں عنوانات اور موضوعات کی مناسبت سے ان پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ سیاسی، سماجی، معاشی اور سائنسی اثرات ان تہذیبوں پر کہاں تک مرتب ہوئے ہیں۔ فن تعمیر، فنون لطیفہ اور دیگر علوم وفنون ان پر کس طرح کے اثرات ثبت کیے، ان سب کو شرح وبسط کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ درحقیقت یہ کتاب گرچہ اسلامی تہذیب وتمدن پر منحصر ہے لیکن ماخذ ومواد اور موضوع کے اعتبار سے اسلامی تہذیب کے پس منظر پر محیط ہے، جو اسلامی تہذیب وتمدن کے ارتقا اور اس کو فروغ واستحکام بخشنے میں مدومعاون ہیں۔ مصنف نے اس کتاب میں موقع وضرورت کی مناسبت سے ان سلطنت کے نقشے بھی شامل کیے ہیں جن کے تہذیب وتمدن کو اس میں جگہ دی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے رہن سہن، عادات واطوار، طرز زندگی اور طرز معاشرت کو بھی بیان کیا ہے۔ سماجی طبقات اور انتظامی امور کو بھی بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف لائق مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اردو قارئین کے روبرو ایسی کتاب پیش کی جو ان کے علم وادراک میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اردو داں طبقہ اس کتاب سے مستفید ومستفیض ہوں گے۔

ہمارے جسم کا معجزاتی نظام

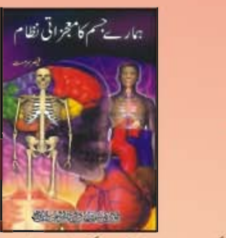

مصنف: قیصر سرمست

صفحات: 216، قیمت: 41 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: محمد رحمت اللہ اشرف

صحت کو ہزار نعمت سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن قدرت کی اس انمول نعمت کی قدر و قیمت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب جسمانی و ذہنی نظام کی کارکردگی کسی وجہ سے متاثر ہوتی ہے۔ انسان کا جسمانی و ذہنی نظام اور بذاتِ خود انسان قدرت کی سب سے اعلا وارفع تخلیق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے احسن تقویم کا درجہ حاصل ہے۔ اس کا یہ درجہ محض ظاہری شکل وصورت کی بنا پر نہیں بلکہ اس کا دارومدار ان تام افعال ذہنی وجسمانی پر مشتمل ہے جن سے انسان عبارت ہے۔ قیصر سرمست کی زیرنظر تصنیف 'ہمارے جسم کا معجزاتی نظام' میں دراصل انھیں افعال ذہنی وجسمانی کو سائنٹفک انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ایک دقت طلب کام ہے۔ قیصر سرمست نے اپنے فرائض کی انجام دہی کی خاطر مختلف نظام جسمانی کے ساتھ ساتھ مختلف اعضائے جسمانی کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔ قیصر سرمست کی پیش نظر تصنیف 36 ابواب پر مشتمل ہے لیکن کتابت کی سہو کی بنا پر 36 کی جگہ 39 درج ہے۔ اس کتاب کا پہلا باب 'اپنا درد' کے عنوان سے ہے جس میں مصنف نے تصنیف کی غرض وغایت اور تکمیل کے مختلف مراحل میں پیش کرنے والی دشواریوں کا ذکر کیا ہے۔

پیش نظر تصنیف میں موضوعات کی شروعات باب دو سے ہوتی ہے اور باب 2 تا باب 34 مختلف نظام جسمانی واعضائے جسمانی پر مشتمل ہے۔ آنکھ، دانت، کان، جگر، معدہ، پھیپھڑے اور طحال وغیرہ جیسے اعضائے جسمانی کو الگ الگ باب کے تحت پیش کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی دوران خون اور قلب، حسیاتی نظام، ذائقہ کی حس، ڈھانچہ اور عضلاتی نظام وغیرہ جیسے نظام جسمانی سے متعلق منفرد ابواب قائم کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں حتی الامکان اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ موضوع گنجلک نہ ہونے پائے۔ اس کام کی انجام دہی کی خاطر جہاں ایک طرف موضوعات کی مناسبت سے معروضیت کا خیال رکھا گیا ہے وہیں دوسری طرف مناسب اردو اصطلاحات کی فراہمی کی بھی حتی الوسع کوشش کی گئی ہے۔ اردو میں اس موضوع پر کتاب کی کمیابی کی صورت میں قیصر سرمست کے لیے اپنی ذمے داریوں سے نبردآزما ہونا کسی چیلنج سے کم نہیں رہا ہوگا لیکن ان مشکلات کے باوجود مصنف اپنے فرائض کی انجام دہی میں پورے طور پر کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کی یہ کتاب ایک نئے موضوع کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کا ایسا تجربہ ہے جو معلوماتی بھی ہے اور سریع الفہم بھی۔ قیصر سرمست نے افہام وتفہیم کی آسانی کی خاطر متن میں انگریزی اور اردو دونوں اصطلاحات کو یکجا رکھا ہے اور جہاں اردو اصطلاحات معانی تک رسائی میں معاون نہیں ہوسکی ہیں وہاں انگریزی اصطلاحات پر ہی اکتفا کیا ہے۔ ساتھ ہی قارئین کی آسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے صراحت کی غرض سے اسکیچیز بھی بنائے گئے ہیں۔ ان کی وجہ سے کتاب کی جاذبیت میں بھی اضافہ ہوا ہے اور مختلف عضو کے افعال وتشریح کا مرحلہ بھی آسان ہوگیا ہے۔

زیرنظر کتاب کا 35 واں باب 'تشریحات' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں قیصر سرمست نے کتاب میں مستعمل اصطلاحات کی وضاحت وصراحت پیش کی ہے۔ اس باب کی تکمیل اس کتاب کا مشکل ترین مرحلہ قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ اختصار و جامعیت کے ساتھ اردو میں غیر مانوس اصطلاحات کی توضیح وتشریح کوئی آسان کام نہیں۔ لیکن یہاں بھی قیصر سرمست اپنی ایجاز پسندی اور معروضی انداز بیان کی بنا پر کامیاب ہوئے ہیں۔ اس تصنیف کا اختتام کتابیات کے آخری باب پہ ہوتا ہے۔

یہ کتاب اپنے موضوع اور پیش کش دونوں ہی اعتبار سے اردو میں ایک نئی جہت کا اضافہ ہے۔ ساتھ ہی معلوماتی اعتبار سے بھی یہ ہر خاص و عام کے لیے سودمند ہے۔ لہٰذا یہ توقع ہے کہ یہ کتاب پذیرائی کے زیور سے آراستہ ہوگی۔

اقبال کا حرفِ شیریں

مصنف/ ناشر: پروفیسر عبدالحق
صفحات: 228، قیمت: 300/روپے
مبصر: محمد نظام الدین، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی

اقبالیات اور اقبال شناسوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ ان میں چند کو یدطولیٰ کی حیثیت حاصل ہے۔ ان چند میں پروفیسر عبدالحق کی تقریباً ایک درجن کتابیں شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں، جن کی ادبی حلقوں میں کافی ستائش ہوئی۔ وہ گہرے مطالعے، غور وفکر، تجزیہ اور تحقیق وجستجو کا مزاج رکھتے ہیں۔ جس کا استعمال وہ تعمیری اور تحقیقی کاموں میں کرتے ہیں۔ مرحلہ تحقیق کا ہو یا تقریر کا، پڑھنے وسننے والوں پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔ جس سے ان کی تحریر، الفاظ اور جملے گوہر آبدار بن جاتے ہیں۔

زیر نظر کتاب کے بیشتر مضامین کا تعلق تحقیق سے ہے۔ چند مضامین تاثراتی ہیں جبکہ کچھ تبصرے ہیں۔ تحقیقی مضامین میں سے بعض منفرد اور بعض بالکل نئے ہیں۔ جو اقبال اور اقبالیات کے مختلف پہلوؤں اور زاویوں کو واکرتے ہیں جیسے 'اقبال صورت گر غزل'، 'اقبال کے معاشی مقدمات'، 'اقبال مغربی ادب کے حوالے سے'، 'اقبال کے لفظ ومعنی کا ثقافتی منظر نامہ' اور 'اقبال کے ہم معنی فارسی وار دو اشعار' وغیرہ۔ ان مضامین میں موصوف نے تخلیق کار کی روح اور ضمیر تک رسائی کی ہے اور تخلیق کار کے داخلی احساسات اور باطنی کیفیات کے تلاطم کو محسوس کرنے کی کوشش کی ہے۔

مضمون 'اقبال صورت گر غزل' کا بنظر غائر مطالعہ کے بعد یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ اقبال صرف نظم کے شاعر نہیں بلکہ غزل کے خوگر بھی ہیں۔ یہ بات جان کر حیرت ہوتی ہے کہ اقبال نے غزل کی بستی میں نئی اور پرشکوہ عمارت کھڑی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں بھی فکر اور معنی کا ایک جہاں آباد ہے۔ اقبال نے الفاظ، جملے اور تراکیب کی جدت اور ندرت سے غزلوں کی صورت گری کی ہے تو وہیں معانی، مفاہیم اور افکار کے موتی پیرونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ گویا اقبال نے مروجہ مطالب اور مفاہیم کو یکسر بدل کر اسے نئے معانی اور مفاہیم کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ اس مضمون سے ایک بات اور واضح ہوجاتی ہے کہ علامہ اقبال نے سب سے پہلے غزل کی زبان میں ہی گنگنانا شروع کیا تھا اور اس کے حوالے بھی موجود ہیں۔

'اقبال کے معاشی مقدمات' گہرائی اور گیرائی سے لبریز ایک منفرد مضمون ہے۔ اس مضمون میں موصوف نے اقتصادیات سے متعلق علامہ اقبال کے نظریات اور افکار کو دلائل واستناد کی روشنی میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ موصوف نے دعویٰ کیا ہے کہ مارکس کے فکر وفلسفے سے قبل اور انقلاب روس کی بازگشت سے پیشتر علامہ اقبال معاشیات کی اہمیت اور معنویت کو بیان کرچکے تھے۔ سماج اور معاشرے میں پائی جانے والی عدم مساوات اور عدم توازن کے اسباب میں سے ایک سبب معاشیات کو قرار دے چکے تھے۔ موصوف نے صرف دعویٰ ہی نہیں کیا ہے بلکہ دلیل سے اسے ثابت کرنے کی بھی سعی کی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ علامہ اقبال نے سب سے پہلی کتاب اقتصادیات کے موضوع پر لکھی جس کی طرف بہت کم محققین نے توجہ مبذول کی ہے لیکن پروفیسر عبدالحق نے اقبال کے اس پہلو کی جانب خصوصی توجہ مرکوز کی اور اقبال کے معاشی مقدمات سے لوگوں کو آگاہ کیا۔

کتاب میں شامل مضمون 'اقبال مغربی ادب کے حوالے سے' یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے کہ اقبال کے سامنے مشرقی ادبیات سے لے کر دور جدید تک کی تمام تاریخ موجود تھی، اقبال مشرقی ومغربی علوم کے قائل تھے۔ ان کے خیال میں یورپ اور مغرب کے علوم عقل ودانش میں اضافے کا سبب ہیں تو دوسری طرف عرفان وآگہی کے حصول میں مشرقی علوم کا کوئی جواب نہیں۔ اقبال کی کچھ نظمیں ایسی ہیں جو مغربی شعراء کے کلام سے ماخوذ ہیں۔ اس حوالے سے اقبال کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اقبال نے لفظ سے گریز کرکے نفس مضمون کو اپنے تخیلات میں ڈھال کر نئی تخلیق کی شکل دی ہے، جس سے ان کے اوپر ترجمہ کا گمان نہیں ہوتا۔ سب سے زیادہ پڑھی جانے والی نظم 'بچے کی دعا' ترجمہ ہے۔

کتاب میں موجود مضمون 'اقبال کے لفظ ومعنی کا ثقافتی منظر نامہ' بایں معنی اہمیت کا حامل ہے کہ لفظ ومعنی ایک دوسرے کے لیے جز ولاینفک ہیں۔ لفظ بغیر معنی کے مہمل ہے تو معنی بغیر لفظ کے عدم وجود اور نہ اظہار ہونے والا خیال ہے۔ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوجاتا ہے کہ علامہ اقبال بھی لفظ ومعنی کے باہمی رشتے کے قائل تھے۔ لفظ ومعنی کے انضمام کو جان وتن یا جسم وروح کا رشتہ قرار دے کر اس حقیقت کو تسلیم کیا تھا 'ارتباط لفظ ومعنی کو ارتباط جان وتن' کہنے والے وہی ہیں۔ اور یہ بات بھی طے ہے کہ معنی ومفہوم کے بہتر اظہار کے لیے خوبصورت الفاظ کا انتخاب ضروری ہے۔ موصوف نے اقبال کے حوالے سے یہ بات بتانے کی کوشش کی ہے کہ اقبال معنی کے بہترین اظہار کے لیے خوبصورت اور مناسب الفاظ کے انتخاب میں یکتائے روزگار ہیں۔ معنی دار اور معنی خیز الفاظ کے استعمال پر اقبال کو حددرجہ دسترس وقدرت حاصل ہے۔

مضمون 'اقبال کے ہم معنی فارسی وار دو اشعار' کتاب کا لب لباب ہے۔ صاحب کتاب نے اقبال کے فارسی اور اردو کلام کی وادیوں میں صحرانوردی کرتے ہوئے جن ہم معنی فارسی اور اردو اشعار کو یکجا کرنے کی انتھک کوشش کی ہے وہ ان کے ادبی شعور اور ذوق سلیم کا پتہ دیتے ہیں۔ اس مضمون میں اس غلط فہمی کو دور کرنے کی بھی کوشش ہے کہ ہم معنی فارسی اور اردو اشعار سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ بجنسہ ترجمہ یا ایک دوسرے کا اعادہ ہے، بلکہ ملتے جلتے خیالات کا پرتو ہے۔

کتاب ایک انمول خزانہ ہے۔ امید ہے کہ قارئین اس کتاب کو اپنے مطالعہ کا حصہ بنائیں گے۔

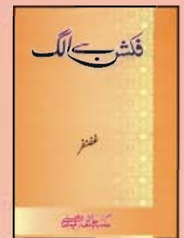

فکشن سے الگ

مصنف: غضنفر علی
صفحات: 200 قیمت: 176 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025
مبصر: محمد حذیفہ صدیقی، این 139 بی، قادری مسجد گلی، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

بیسویں صدی کی نصف دہائی میں جن قلم کاروں نے مختلف ادبی حوالوں سے اپنی شناخت قائم کی ان میں غضنفر کا نام بھی شمار کیا جاتا ہے۔ فکشن، شاعری، تدریس وتنقید اور لسانیات کے موضوع پر تقریباً دو درجن کتابوں کا اشاعت پذیر ہونا ان کے علمی اور ادبی دائرہ کار کو نشان زد کرتا ہے۔ غضنفر بنیادی طور پر تخلیق کار ہیں۔ کتاب میں انھوں نے شعرا پر اظہار خیال کیا ہے۔ بعض ادبی رویوں پر بحث کی ہے۔ کتابوں کا ذکر کیا ہے، طباعت و اشاعت اور اردو قاعدوں کی بے قاعدگیوں پر بھی نظر ڈالی ہے۔

کتاب کے پہلے مضمون میں مصنف نے اپنے دوستوں کا ذکر کیا ہے خاص طور پر شہر یار سے اپنی قربت اور ان کی انکساری کا ذکر، دوستوں سے شہر یار کی محبت اور الفت کو بیان کیا ہے۔ ان کو اپنی فیملی ممبر جیسا پیش کیا ہے۔ ان کی بیماری کے زمانے کی مختلف

کیفیتوں پر روشنی ڈالی ہے اور اس سلسلے میں ان کے اشعار بھی پیش کیے ہیں۔

مرکز کا دل اور حاشیے کا درد میں دلت کی زندگی اور اس کے کرب واستحصال کو بڑی بیبا کی سے بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ اس کی خواہشات اور تمناؤں کا ذکر کیا ہے۔ مرکز کا دل سرمایہ دار کو اور حاشیے کا درد دلت اور کمزور طبقے کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس مضمون میں دلت کی صورت حال کی ترجمانی ہی نہیں کی گئی ہے بلکہ اس صورت حال کو پیدا کرنے والے اسباب تک رسائی بھی حاصل کی ہے۔

'احساس کمتری کے شکنجے میں کسی ہوئی زبان' اردو زبان کی صورت حال پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کی سیاسی، تنظیمی اور تعلیمی صورت حال پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اس کا مناسب حل بھی عوام کے سامنے پیش کیا ہے۔

اردو قاعدوں کی بے قاعدگیاں، میں مختلف اردو قاعدوں کو پیش کیا ہے اور ان کی خامیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ساتھ ساتھ اردو املا نامہ کے حوالے پیش کیے گئے ہیں۔ 'جمال پرست شبلی کا سماجی اور تاریخی شعور، میں غضنفر نے مولانا شبلی کی جمال پرستی کا تذکرہ کیا ہے اور انھوں نے 'تین' شاعر کے معیاروں پر پوری عجمی شاعری کا مدلل تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔

'میرا تخلیقی عمل' میں تخلیق کے عمل کی پیچیدگی اور اس کے اسرار ورموز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے مشہور افسانے 'پانی' کا تفصیلی جائزہ لیا ہے کہ کس کرب و بے چینی واحساس نے مجھ سے یہ افسانہ لکھوایا غضنفر نے اس افسانے کا دوسرے افسانوں سے موازنہ بھی کیا ہے اور دو افسانوں 'مم' اور 'دویہ بانی' کی تخلیق کے اسباب کو بیان کیا ہے۔ تذکروں کی خوبیوں اور خامیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی تاریخی اہمیت کو پیش کیا ہے۔

مضمون 'وشواس گھات کے رنگ' جتندر بلّو کی تحریروں اور 'مکان ٹوٹنے کے بعد کی کہانی' میں مضمون نگار نے پیغام آفاقی کے ناول 'مکان' کے بارے میں لکھا ہے۔ 'سوانح نگاری کا فن' میں اس کی خوبیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اسے سرور وانبساط کا فن بتایا گیا ہے۔ یہ نفسیاتی پہلو کو بھی اجاگر کرتا ہے۔

''فرحت احساس رونا کیوں چاہتا ہے؟'' میں مصنف نے 'میں رونا چاہتا ہوں' کے عنوان سے شائع ہونے والے فرحت احساس کے شعری مجموعہ پر گفتگو کرتے ہوئے شاعر رونے کی خواہش کی وجوہات غم عشق، غم ذات، غم روزگار، غم کائنات اور غم ملت کا ذکر کیا ہے۔ مولانا آزاد کی صحافت نگاری بھی ایک مضمون میں کہا گیا ہے کہ مولانا نے صحافت کا راستہ اس لیے اختیار کیا کہ اس کے سہارے قوم اور معاشرے میں بیداری لائی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر کیول دھیر ایک دردمند افسانہ نگار میں غضنفر نے کیول دھیر کی سوچ اور اظہار میں پنجاب کا ماحول کس حد تک داخل ہے۔ اس پر گفتگو کی ہے۔

'کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے' کا ایک افق۔ مضمون میں پروفیسر اختر الواسع کی کتاب 'باب ذوق' سے ماخوذ مضامین کے اقتباس پیش کیے گئے ہیں اور ان کی ادبی خدمات کو سراہا گیا ہے جو انھوں نے اردو زبان کے لیے انجام دیں۔ اس مضمون میں جو باقی مضامین کے اقتباس پیش کیے گئے ہیں۔ وہ ان کے ادبی ذوق اور اردو ادب سے ان کے گہرے لگاؤ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اقبال دائروں کو توڑنے والا شاعر مضمون میں شاعر کی آفاقیت کو پیش کیا گیا ہے۔

اردو ذریعۂ تعلیم امکانات اور مسائل میں مادری زبان اردو کو تعلیم کا ذریعہ بنانے میں کس طرح کے مسائل درپیش ہیں ان کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور اس کا حل بھی اس مضمون میں پیش کیا گیا ہے۔

خورشید اکبر کے ادبی جریدے 'آمد' اور ماجد دیوبندی کے شعری مجموعے 'شاخ دل کا رنگ' پر بھی دو مضمون کتاب میں شامل ہیں۔ 'ریڈیو فیچر' والے مضمون میں غضنفر نے اس ریڈیائی صنف کی افادیت پر بحث کی ہے۔

اس طرح غضنفر ایک فکشن نگار ہوتے ہوئے بھی ان کو اور اصناف پر کس طرح مہارت حاصل ہے یہ اس کتاب کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے۔

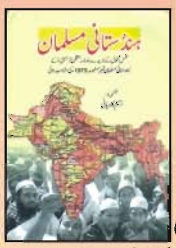

ہندستانی مسلمان

تشکیلِ نو: اسیم کاویانی

صفحات: 407، قیمت: 500 روپے

ناشر: کاویانی پبلشرز، بیلویڈر روڈ، مجگاؤں، ممبئی

مبصر: محمد مقیم، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

شمس کنول ایک صاحب طرز ادیب اور صحافی تھے۔ ان کی مضمون نگاری کا اپنا منفرد انداز تھا۔ شمس کنول صاحب نے فروری 1963 میں بمبئی کے نواح میں واقع الہاس نگر سے 'گگن' نامی جریدہ جاری کیا۔ یہ جس زمانے کی بات ہے الہاس نگر ایک ویرانہ رہا ہوگا، آج تو خاصی چہل پہل ہے۔ اس جریدے کا تقریباً نصف حصہ شمس کنول صاحب خود ہی لکھا کرتے تھے۔ وہ حصہ جو شمس کنول صاحب کے رخشِ قلم کا مرہونِ منت تھا، اس سے اڈیٹر کی ذہانت اور طباعی کا پتہ ملتا ہے۔ شمس کنول صاحب نے گگن کے کئی خاص نمبر بھی نکالے۔ زیر تبصرہ کتاب 'ہندستانی مسلمان' گگن کا پہلا خاص شمارہ ہے۔ اس شمارے کی اشاعت 1975 میں ہوئی اور گگن کا آخری خاص نمبر 'مذاہب عالم' 1984 میں قارئین نے ملاحظہ کیا۔ گگن کے یہ خاص نمبر تقریباً نایاب ہوچکے ہیں۔ اسیم کاویانی نے ان نمبروں کی تشکیل جدید کا عزم کیا اور 'ہندستانی مسلمان' اسی عزم کا مظہر ہے۔ انھوں نے اس نمبر کی اشاعت نو پر کڑی محنت کی اور اس میں پائے جانے والے سنین کی غلطیوں کو درست کرنے کے علاوہ کلاسیکی متون میں پائی جانے والی غلطیوں کو بھی اصل متن سے رجوع کر کے اصل کلاسیکی متن سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ جریدے نے املا کے معاملے میں جو جدت اختیار کی تھی اسے بھی آج کے مزاج سے ہم آہنگ کر دیا جاتا۔ اسیم کاویانی اس نمبر کی تشکیل نو سے قبل 2009 میں گگن کے کل عام شماروں کی منتخب نگارشات کو دو جلدوں میں پیش کر چکے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں 'ہندستانی مسلمان' نمبر کی اشاعت 1975 میں بھی جوکھم بھرا کام تھا اور اب بھی اتنا ہی جوکھم بھرا ہے یا شاید زیادہ۔ یہ نمبر اپنی نگارشات کی روشنی میں مدیر کی فکر اور مزاج کا ترجمان ہے۔ شمس کنول اپنے جریدے 'گگن' کے مختلف شذرات میں مسلمانان ہند کی سیاسی، سماجی اور معاشی زبوں حالی کے اسباب وعلل کا تجزیہ کیا کرتے تھے۔ شمس کنول کی اس روش کے جو نتائج مرتب ہوئے اس پر اسیم کاویانی تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

گگن کے ان حقیقت پسندانہ افکار ونظریات کے باعث اس کے ہم نواؤں کی تعداد کم رہی جب کہ مخالفین بے شمار ہوئے، اس کے باوجود اڈیٹر 'گگن' نے نہ تو کبھی مصلحت پسندی اختیار کی نہ ہی اپنے نظریات سے دست برداری قبول کی۔

زیر تبصرہ نمبر کو پڑھنے کے بعد میں اس کشمکش میں مبتلا ہوں کہ ان نگارشات میں موجود افکار ونظریات اور رجحان کو اڈیٹر 'گگن' کی حقیقت پسندی سے تعبیر کروں یا تغافل عارفانہ سے موسوم کروں!! یہ باور کرنا مشکل ہے کہ شمس کنول ایسا وسیع المطالعہ، ذہین اور طباع شخص تاریخ کی ہفوات کو تاریخی حقیقت مان لے گا اور بعض تاریخی حقائق کے پیچھے کارفرما اسباب وعلل کا تجزیہ کرنے میں ناکام ہوگا۔ یہی وجہ ہے میرے تغافل عارفانہ کی ترکیب استعمال کرنے کی۔ شمس کنول صاحب بے باک اور جری ضرور تھے لیکن تحریروں میں وفور جوش اور جذباتی یلغار کے باعث حقیقت پسند ماننے میں تامل ہے۔ یہی بات

اقتباسات اور تراشے کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے۔

میں نے کہا ہے کہ شمس کنول بعض تاریخی حقائق کے پیچھے کارفرما اسباب وعلل کا تجزیہ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اس میں سماجی اور سیاسی عناصر کو بھی شامل کرلیا جائے۔ شمس کنول صاحب نے جن بنیادوں پر اپنے تجزیے پیش کیے ہیں انھی بنیادوں پر ایک متوازی مگر مخالف تجزیہ پیش کیا جاسکتا ہے اور کسی بھی تجزیے کو قوی تر نہیں کہا جاسکتا سوائے اپنی نظریاتی شدت پسندی پر اصرار کرنے کے۔ ان کے بہت سے تجزیوں اور سوالوں پر سوال قائم کیے جاسکتے ہیں حتیٰ کہ کئی مقامات ایسے ہیں جہاں ان کے تیقن پر آج کے تناظر میں صرف ہنسی ہی آسکتی ہے۔ لہٰذا یہ نمبر 'دیکھے اسے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو' کا مصداق ہے۔ اس قسم کی جارحیت اور انتہا پسندی اپنے اندر خواہ کتنا ہی خلوص اور درد سمیٹے ہوئے ہو شکوک وشبہات سے بالاتر نہیں ہوتی۔

اس نمبر کے اقتباسات وتراشے لاجواب ہیں اور جریدے کے رجحان کی غمازی کرتے ہیں۔ بیشتر مقالات بہتر ہیں اور حصۂ نظم بھی عمدہ ہے۔ چند متنازعہ اسما کو نظر انداز کردیا جائے تو بزرگانِ قوم کا تذکرہ مختصر، جامع اور معلوماتی ہے۔ فلم 'گرم ہوا' پر تبصرہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ نشانِ راہ کے تحت استفسارات کے جوابات معلوماتی اور مفید ہیں حالاں کہ تنازعے سے خالی نہیں۔ اڈیٹر کی اپنی بات 'کوئی شے مستقل نہیں تبدیلی کے سوا' پڑھ کر محسوس ہوا کہ ہاتھ میں 'گگن' نہیں 'سامنا' ہے۔ جریدہ علمی، تحقیقی اور دانشورانہ سنجیدگی سے عاری ہے۔ دراصل گالیوں، کوسنوں اور دشنام طرازیوں سے مخاطب میں نہ تو خود احتسابی پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی فریقین میں محبت و یگانگت کو راہ ملتی ہے۔ نشتر جراح کے ہاتھ میں تعمیر کی علامت ہے اور دست قاتل میں خرابی کا اندیشہ۔

اسیم کاویانی صاحب گگن کے 'ہندستانی مسلمان نمبر' کی تشکیل نو کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں کیوں کہ اس کی تاریخی اہمیت اور موجودہ افادیت سے انکار مشکل ہے۔ آخر اس کی تعمیر میں بیداری کی لہر تو مضمر ہی ہے۔ اور یہی لہر مرقع عبرت ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب اردو حلقوں میں سنجیدگی سے پڑھی جائے گی۔

نازشِ جنوں (ناول)

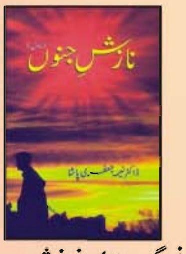

مصنفہ: ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا

صفحات: 182، قیمت 200 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: عذرا نقوی، فرحت کدہ، سرسید نگر، علی گڑھ 202002

ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا ایک معروف ادیبہ ہیں۔ افسانہ نگاری، فرہنگ سازی، خودنوشت، تحقیق، خاکہ نگاری میں انھوں نے ادب میں اپنی شناخت قائم کرلی ہے۔ 'نازش جنوں' ان کا پہلا ناول ہے اور بہت دلچسپ اور readable ہے۔ اس ناول میں ایک اچھے اسکرین پلے کی بھی ساری خصوصیات موجود ہیں۔

مصنفہ نے ناول کے پیش لفظ میں لکھا ہے:

''یہ محض ایک رومانی ناول نہیں ہے۔ اس کی کچھ نیم تاریخی حیثیت بھی ہے۔ نام اور مقام ضرور بدل گئے ہیں، لیکن واقعات حقیقت پر مبنی ہیں... حقیقت سے فسانے تک، فسانے سے حقیقت تک۔ میرے پاس آتے آتے اس نے کتنے پیرہن بدلے۔''

اس ناول میں حقیقت اور فسانے کے سفر میں جزئیات نگاری اور منظر کشی، زبان و بیان کی روانی اور سلاست کچھ اس طرح قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے کہ ایک ہی نشست میں پڑھ کر ختم کرنا چاہتا ہے۔ تجسس کے ساتھ ساتھ قاری زبان و بیان سے بھی لطف اندوز ہوتا جاتا ہے۔ ناول کا پلاٹ بہت مربوط ہے۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ دو دوست ہمایوں اور ایڈورڈ ولیم (اینگلو انڈین) راجستھان میں رہتے تھے انجینئرنگ کا امتحان دینے کے بعد راجستھان گھومنے نکلے تھے۔ بیچ ریگستان میں ان کی جیپ خراب ہوجاتی ہے۔ ادھر سے گذرنے والا ایک اونٹ گاڑی والا بتاتا ہے کہ تھوڑی دور پر پیر بابا کی باڑی ہے، وہاں چلے چلو، وہیں مدد مل سکتی ہے اور گاڑی بان ان کو باڑی کے پاس چھوڑ جاتا ہے۔

اس کے بعد یہ ناول فلیش بیک میں اس باڑی اور اس میں رہنے والوں کی داستان بیان کرتا ہے۔ ہمایوں اور ایڈورڈ پیر بابا سے سوال کرتے ہیں کہ وہ کون ہیں اور اس ویرانے میں کیوں رہتے ہیں۔ اس سوال کا جواب بابا کئی راتوں میں داستان کے طرز پر دیتے ہی اور اس محفل میں اپنی بیٹی گلِ لالہ کو بھی شامل کرلیتے ہیں کیونکہ وہ بھی اس راز کو پوری طرح نہیں جانتی۔

اس فلیش بیک کہانی میں مصنفہ نے پیر بابا کی زبانی یہ انکشاف کرایا ہے کہ ناول کے اہم کرداروں ظفریاب ہمایوں، ایبک خان، خود پیر بابا اور کلکٹر ولیم، ایڈورڈ کا آپس میں کیا رشتہ ہے۔ اس کے بعد اس ناول میں شروع ہوتی ہے عشق کی ایک داستان جو کبھی کبھی ناقابلِ یقین لگتی ہے لیکن مصنفہ نے کہانی کچھ اس طرح تمام ضروری تفصیلات کے ساتھ بُنی ہے کہ قاری کو یقین سا آنے لگتا ہے۔

ناول میں مصنفہ نے راجستھان کے ریگستان، تاریخ، موسم، لباس، بولی، رسم ورواج، رہن سہن سب کو بہت خوبصورتی سے سمویا ہے۔ جزئیات نگاری اپنے کمال پر ہے۔ یہاں تک کہ باڑی کے گیراج کی چھت کی تفصیلات اور لائبریری کی پیمائش وغیرہ بہت تکنیکی انداز میں پروئی گئی ہیں۔ ناول میں جہاں جہاں ضروری تھا، اس زمانے کے سیاسی حالات کی تفصیلات بھی ہیں جو ناول کے کرداروں اور کہانی کو مزید مربوط اور مکمل کرتی ہیں۔ ہاں البتہ ناول میں پیر بابا کی بیٹی گلِ لالہ کو بار ایٹ لا کرنے لندن بھیجنا کچھ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ مصنفہ اگر ہندوستان میں ہی تعلیم مکمل کروادیتیں تو قرین از قیاس ہوتا۔

رحمتیں

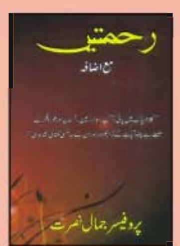

مصنف/ ناشر: پروفیسر جمال نصرت

صفحات: 200، قیمت: 140 روپے، دوسرا ایڈیشن: 2014

مبصر: محمد نوشاد عالم ندوی، اے 28، تیسری منزل، شاہین باغ، نئی دہلی

پروفیسر جمال نصرت نے اپنی تصنیف 'رحمتیں' میں متعدد مظاہر فطرت جیسے پانی، آگ، ہوا اور زمین وآسمان میں غور وفکر سے متعلق قرآنی آیات جمع کرکے ان کی سائنسی تعبیر وتشریح کی کامیاب کوشش کی ہے۔ حالانکہ اللہ کی رحمت انہی پانچ چیزوں تک محدود نہیں ہے۔ لیکن صاحب کتاب نے ان پانچ چیزوں کا انتخاب علامت، نمونے یا تمہید کے طور پر کیا ہے اور اس لیے بھی کہ قرآن پاک میں ان کا ذکر متعدد بار آیا ہے۔ اس کے علاوہ انسان کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں ان سے برابر سابقہ پڑتا ہے اور وہ ہمہ وقت ان میں غور وفکر کرکے اپنی عقل اور اپنے علم کو ان سے مستفید ہونے اور کائنات کی مزید کھوج کے لیے استعمال کرسکتا ہے۔ قرآن کریم کا بنیادی موضوع ہی انسان (یعنی اس کا عقلی و منطقی، علمی وفکری اور معنوی وجود) ہے جسے بار بار حکم دیا گیا ہے کہ وہ تدبر وتفکر اور اللہ کی عطا کردہ قوت مشاہدہ اور شعور کو بروئے کار لائے تاکہ کائنات کی مخفی چیزیں اس پر آشکار ہوسکیں۔ قرآن نے مومن کی بنیادی صفات وشرائط کے ضمن میں آسمان وزمین کی تخلیق میں غور وفکر کو خصوصی اہمیت دی ہے۔

انسان کو سائنس کے میدان میں جو ترقی حاصل ہوئی تھی وہ دراصل قرآن وحدیث کی تعلیمات اور احکام ہی کی بدولت تھی۔ قرآن کریم کا واضح اعلان ہے: سنریھم آیاتنا

فی الآفاق وفی انفسهم حتیٰ یتبین لهم انه الحق:(ترجمہ: ہم عنقریب انہیں کائنات میں ان کے اپنے وجود کے اندر اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ وہ جان لیں گے کہ وہی حق ہے)۔

اللہ تعالیٰ کی بہت سی نعمتیں دورخی ہیں۔ پانی کی مثال لے لیں، میرے خیال سے اللہ نے اس سے بڑی نعمت ہمیں کوئی نہیں دی۔ پانی زندگی کی علامت اور اولین ضرورت ہے۔مگر یہ پانی تب تک نعمت ہے جب تک یہ اس برتن کے پیندے سے ابل کر باہر نہیں آنے لگتا جو برتن اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے تخلیق کیا ہے۔اسی طرح کا پانی تباہی لاتا ہے۔سیلاب اور سونامی اس عظیم نعمت کے تباہ کن اثرات ہیں۔ پانی جسم میں انتہائی اہم کردار ادا کرتا ہے، انسانی جسم میں پانی تقریباً دوتہائی موجود ہوتا ہے، پانی کا ایک قطرہ ہماری ابتدا ہے، پانی ہم پیتے ہیں اور جسم سے کئی طریقوں سے خارج کرتے ہیں، پانی کی کمی اور زیادتی دونوں جسم کو مختلف طریقوں سے بیمار کردیتی ہیں۔ پانی کا جسمانی کیمیا جذبات ہے، کبھی کبھی غصے سے ابلتے ہیں تو کبھی بے حسی سے ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں، کبھی اپنی حد میں رہتے ہیں تو کبھی حدیں توڑ کر باہر نکلنے لگتے ہیں، کبھی آنسو بن کر بہنے لگتے ہیں تو کبھی کسی کی سفاکی پر ہاتھوں سے ٹھنڈے پسینے بن کر پھوٹنے لگتے ہیں۔ پانی کے بارے میں قرآن پاک کے تقریباً ہر پارے میں کہیں نہ کہیں ذکر ضرور ملتا ہے۔(ترجمہ: اے نبیؐ! ان لوگوں کو جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں بشارت دو کہ ان کے لیے ایسے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔) اس سے بالکل واضح ہے کہ پانی اللہ کی طرف سے عطا کردہ بہت بڑا انعام ہے۔(ترجمہ: اور اس وقت کو بھی یاد کرو جب ہم نے تمہارے لیے دریا کو پھاڑ دیا۔ بس تم کو بچالیا اور آل فرعون کو تمہارے دیکھتے ہی دیکھتے غرق کردیا۔)

آگ: قرآن پاک کے سب ہی پاروں میں آگ کا ذکر ہے۔آگ اللہ کی ایک ایسی نعمت ہے جس کا نام لیتے ہی خوف آتا ہے، نہ صرف اس دنیا میں بلکہ آخرت میں بھڑکائی ہوئی اس آگ کا تصور سوہان روح ہے جہاں کوئی جانا نہیں چاہتا۔ثواب اور عذاب کے سارے طریقے ان کی سزائیں اور جزائیں ہمیں اللہ نے کتاب حکمت میں کھول کھول کر بیان کی ہیں۔ جنت اور جہنم کے مابین حد فاصل کیا ہے اور ان تک جانے کے راستوں کے نقشے بھی سمجھا دیے ہیں۔اسی آگ کو جس سے ہم بظاہر خوف کھاتے ہیں ہمارے ماتحت کردیا، ہم اسے احتیاط کے تقاضے مدنظر رکھ کر استعمال کریں تو یہ ہمارے کئی دنیاوی نظام چلاتی ہے جن میں مشینیں، فیکٹریاں، جہاز اور ریل گاڑیاں شامل ہیں۔جسمانی کیمسٹری کے حساب سے آگ سب سے خطرناک عنصر ہے۔آگ تباہی ہے، غصہ ہے، برہمی ہے، سفاکی ہے اور حسد ہے۔

قدرت کی عطا کردہ نعمتوں میں اہم نعمت ہوا ہے۔ اہمیت کے اعتبار سے ہوا اور پانی میں سے کسی ایک کا تعین کرنا مشکل ہے۔ ہوا ہماری اہم ضرورت ہے، سانس لینے سے لے کر جسمانی سکون کی خاطر۔اسی کے زور پر زمانہ قدیم میں بادبانی کشتیاں چلتیں اور اسی کے وجود نے انسان کو اڑنے کا وہ تصور دیا جو بالآخر ہوائی جہاز کی ایجاد پر منتج ہوا۔ ہوائیں قدرت کے اصولوں کے مطابق پولن کی ترسیل کا کام کرتی ہیں جو پودوں کی افزائش کے لیے اہم ہے۔ ہوا جب تک نرم ہے وجود کو سکون اور فرحت کا احساس دیتی ہے، یہی ہوا جہاں خوشبو کو پھیلا کر ہمیں فرحت کا سامان کرتی ہے تو ناگوار بدبو کو پھیلا کر ہمیں بیزار کرتی ہے۔موسموں کے حساب سے ہی ہوا اچھی لگتی ہے۔ ہوا گرمیوں میں ہو تو باعث سکون اور سردیوں میں ہو تو باعث زحمت ہے۔کلام پاک میں پانی اور آگ کے بعد جس عنصر کا ذکر سب سے زیادہ تفصیل سے کیا گیا ہے وہ ہوا ہے۔اس کے علاوہ زمین وآسمان کا بھی ذکر بار بار کیا گیا اور اللہ نے ایک اور شے جو عنصر کے زمرے میں تو نہیں آتی مگر اسے بہت اہمیت دی ہے وہ ہے 'سمجھداری اور عقل''۔

صاحب کتاب نے 'رحمتیں' میں قدرت کے ان تمام اصولوں کو سائنس اور قرآن کی روشنی میں مدلل بیان کرکے قاری کو ان نعمتوں کی اہمیت وافادیت سمجھانے کی پوری کوشش کی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب قارئین کے لیے کافی مفید ثابت ہوگی۔ کتاب کی ترتیب وپیشکش اور ڈیزائن جاذب نظر ہے۔توقع ہے کہ دیگر کتابوں کی طرح اس کتاب کو بھی مقبولیت حاصل ہوگی۔

ایک بوند زندگی

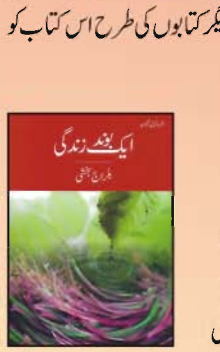

مصنف: بلراج بخشی

صفحات: 160، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: اوشین پبلشنگ ہاؤس، ادھم پور، (جموں اینڈ کشمیر)

مبصر: عبدالرب، G-50، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

بلراج بخشی کا نام علمی وادبی حلقوں میں خاصا معروف ہے۔آپ کے افسانے اردو کے مقتدر ادبی رسائل وجرائد میں شائع ہوکر داد وتحسین حاصل کرچکے ہیں، نئے تیور اور اپنے منفرد اسلوب وانداز کے ذریعے معاصر افسانہ نگاروں میں بلراج بخشی نے اپنی پہچان قائم کرلی ہے۔

'ایک بوند زندگی' بلراج بخشی کا بارہ افسانوں پر مشتمل پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ان افسانوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار کسی خاص ازم اور تحریک سے بندھا ہوا نہیں ہے بلکہ اس کا سروکار انسان اور معاشرے سے ہے۔اس لیے موضوعات میں خاصی وسعت ہے۔ بلراج بخشی نے اپنے مشاہدات کو یک رخا نہیں رکھا ہے۔ چنانچہ ان کے افسانوں میں ہر سطح پر تنوع کا احساس ہوتا ہے۔جدید انداز اپناتے ہوئے ایک طرف جہاں براہ راست سیاسی وسماجی صورت حال کی عکاسی کی گئی ہے۔ وہیں داستانی اور اساطیری انداز کی کہانیاں بھی اس مجموعے میں موجود ہیں۔

مجموعے کی پہلی کہانی 'فیصلہ' ہے جس کا مرکزی کردار ایک جج ہے اور مقدمہ ایک مرغ کا ہے، کہانی بہت دلچسپ پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔جج صاحب کو کافی دنوں سے گوشت نصیب نہیں ہوا ہے۔اتفاق سے یہ مرغ ہاتھ لگتا ہے جو عدالت کے کمرہ میں ایک کھڑکی کے راستے گھس آیا تھا، جج کے ایما پر مرغ پکڑ لیا جاتا ہے لیکن پھر جج پر عدالت کا احترام غالب آجاتا ہے اور بالآخر وہ اسے آزاد کردیتا ہے۔اب اگر مرغ کو ایک عام، کمزور اور بے سب انسان کی علامت کے طور پر دیکھا جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ آج کے کرپٹ ماحول اور اہل اقتدار کے مظالم بلکہ صاف لفظوں میں کہیں تو طاقت ودولت کی سفاکی اور بے رحمی کا شکار عام آدمی کا سہارا بس عدالتیں ہی رہ گئی ہیں جہاں سے وہ کسی حد تک انصاف کی امید کرسکتا ہے۔

افسانہ 'ڈیتھ سرٹیفکٹ' میں ایک عام آدمی کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ جسے شناختی کارڈ بنوانا ہے۔ بدقسمتی سے اس شخص کی نہ تو سیاست سے کوئی گہری دلچسپی ہے اور نہ ہی وہ سیاسی نظام کی حقیقت سے آگاہ ہے۔ نتیجے کے طور پر وہ خود کو ایک معزز شہری ہونے کے زعم میں مبتلا کرلیتا ہے لیکن حقیقت کا سامنا ہونے پر اسے تصویر برعکس نظر آتی ہے۔یہ کہانی نظام سیاست اور ہمارے معاشرے میں اہل اقتدار کے قانون کی پاسداری کا بڑا عمدہ تجزیہ پیش کرتی ہے۔

اسی طرح ملک کے سیاسی نظام کے کھوکھلے پن کو اجاگر کرتا ہوا ایک اور افسانہ بہ عنوان 'کیا نہیں ہوسکتا' ہے۔افسانہ 'مشترکہ اعلامیہ' میں حقوق انسانی کی آواز بلند کرنے والی تنظیموں اور سیاسی نظام کی فریب کاریوں پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ کہانی، کہانی کار کی چابکدستی اور فنکارانہ ہنرمندی کی مثال پیش کرتی ہے جسے پڑھ کر قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

'مکتی' اور 'مکلاوہ' بھی دلچسپی کہانیاں ہیں۔ ہندوستانی اساطیر کا رنگ ان پر غالب ہے اور یہ افسانہ نگار کے تنوع پسند ذہن نیز ہندوستانی تہذیب اور رسوم وروایات سے

افسانہ نگار کی گہری وابستگی کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ افسانہ 'کھانسی ایک شام کی' میں ایک عام سی کہانی بیان کی گئی ہے۔ لیکن اس میں دراصل بدلتی قدروں کی تصویر کشی ایسے انداز میں کی گئی ہے کہ اس نے افسانے میں عجب لطف پیدا کر دیا ہے اور افسانہ سادگی و پرکاری کا نمونہ بن گیا ہے۔ افسانہ 'زچ' عصری حسیت کی ترجمانی کرتا ہوا ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ آج ہم مشینی دور میں جی رہے ہیں۔ سائنسی ایجادات نے ہماری زندگی کے ہر شعبے میں اس حد تک مداخلت کی ہے جس کا تصور کچھ سالوں پہلے ممکن نہ تھا۔ اس افسانے میں ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے موضوع کو سامنے رکھ کر انسانی فطرت، سماج، معاشرہ وغیرہ کو زیر بحث لایا گیا ہے نیز یہ بھی کہ انسان خواہ کتنا ہی ترقی کر لے فطرت اسے اس کی مجبوری اور عجز کا احساس ضرور دلا دیتی ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے متعلقہ موضوع کی مناسبت سے ایسی معلومات فراہم کی ہیں کہ افسانہ نگار کی وسیع معلومات کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اسی طرح افسانہ 'ہارا ہوا محاذ' میں بھی شیروں سے متعلق نادر معلومات پیش کی ہیں جس سے بلراج بخشی کے علم الحیوانات سے دلچسپی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو بلراج بخشی کے افسانے ان کی کہنہ مشقی اور پختہ کاری کے غماز ہیں۔ سیدھے سادھے انداز میں لکھے گئے یہ افسانے اپنے اختتام پر قاری کی فکر کو مہمیز کرتے ہیں۔ دراصل بلراج بخشی کے افسانوں کی بنیاد محض تخیلات نہیں ہیں بلکہ سماج اور معاشرے میں پیش آنے والے واقعات و حادثات کو ہی لفظوں کا جامہ پہنا کر وہ قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ البتہ ان واقعات میں افسانہ نگار کے تجربات اور مشاہدات شامل ہوتے ہیں جو افسانے کو ایک نئی جہت عطا کر دیتے ہیں اور یہی ان کا اختصاص ہے امید ہے قارئین اس افسانوی مجموعے کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

انیسویں صدی میں ادب، تاریخ اور تہذیب

(صدیق الرحمٰن قدوائی کے اعزاز میں مضامین)

مرتبین: اطہر فاروقی، رضا حیدر، سرورالہدیٰ

صفحات: 377، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر محمد سہیل انور، اسسٹنٹ لائبریرین،

ریسرچ ایسوسی ایٹ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی 2

اکیس مضامین پر مشتمل یہ کتاب بشمول ڈاکٹر اطہر فاروقی کا پیش لفظ اور ڈاکٹر سرورالہدیٰ کا مضمون مع ضمیمہ صدیق الرحمٰن قدوائی صاحب کے اعزاز میں نذرانۂ تہنیت ہے اور مطالعے سے تعلق رکھتا ہے۔ جیسا کہ عنوان سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ 'انیسویں صدی میں ادب، تاریخ اور تہذیب' کے عنوان پر زیرِ نظر کتاب کافی اہمیت کی حامل ہے۔

سرورالہدیٰ کا مضمون بعنوان 'صدیق الرحمٰن قدوائی: استاد اور ناقد' نظر سے گزرا۔ یقیناً ان کا مضمون قابلِ تعریف ہے۔

چودھری نعیم صاحب کا مضمون غالب کی دلّی [دو مقبول عام استعاروں پر گستاخانہ نظر ثانی] بھی لمحہ دعوت فکر دیتا ہے بالخصوص جب وہ تیموریہ سلطنت کی بجھتی شمع اور ورنا کولر ٹرانسلیشن کے حوالے سے توضیحی معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ انھوں نے مزید اکبر اور جہانگیر کے زمانے کے یوروپی پریس اور کندہ کاری کے ذریعہ تیار کی گئی تصویروں سے اِن بادشاہ و امرا کی عدم دلچسپی کا ذکر بھی کیا ہے جسے انھوں نے 'پروٹسٹ روح' کا فقدان سے موسوم کیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں خود قدوائی صاحب کا ایک مضمون 'اردو نثر کی تاریخ میں غالب کا عہد' بھی شامل ہے جو معنویت کا حامل ہے۔ خاص طور پر جب انھوں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اردو نثر کی تاریخ میں عہد غالب کے مطالعے کا مقصد دراصل اُن اسباب و علل کی پہچان کرانی مقصود ہے، جنھوں نے اس عہد کی نثر کی زبان اور اسالیب اور ان کے ارتقا کے رُخ متعین کرنے میں حصہ لیا۔

شمیم حنفی صاحب کا مضمون انیسویں صدی نشاۃ ثانیہ اور محمد حسین آزاد بھی مطالعے سے تعلق رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے اپنے مضمون میں انیسویں صدی کو نشاۃ ثانیہ کیوں کہتے ہیں؟ اس صدی کو حلقہ اربابِ ذوق، سرسید، آزاد، حالی و شبلی، نذیر احمد، ذکاء اللہ، غالب، صہبائی سے منسوب کیوں کیا جاتا ہے؟ ان امور پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

پروفیسر محمد حسن صاحب کا مضمون 'انیسویں صدی کے ابتدائی دور کے اردو ادب کا فکری پس منظر' کا مطالعہ بھی فائدے سے خالی نہیں۔ چونکہ بقول محمد حسن صاحب 'شمالی ہند میں اردو ادب کو اعتبار بخشنے میں انیسویں صدی کا بہت اہم رول ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون میں صراحت کی ہے کہ اس صدی سے پہلے بھی شمالی ہند میں سنگیت سے محظوظ و مسرور ہونے کا رواج عام تھا لیکن اس سنگیت اور نغمہ سرائی میں جادوئی آوازوں کی آمیزش انیسویں صدی کی ہی مرہون منّت ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں دو مضامین ایسے بھی شامل ہیں جو نو آبادیاتی فکر (Colonial Thought) اور نو آبادیاتی نظام (Colonial System) پر مبنی ہیں اور یہ دونوں مضامین، عنوان کی افادیت کے لحاظ سے کافی اہم بھی ہیں جو یقیناً مطالعے سے تعلق رکھتے ہیں اول الذکر مضمون پروفیسر ابوالکلام قاسمی کا 'نو آبادیاتی فکر اور اردو کی ادبی و شعری نظریہ سازی' پر مشتمل ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے حالی کے نظریہ مشرق کے حوالے سے چند نکات کی توضیح پیش کی ہے کہ ''کس طرح مشرقی تصورِ کائنات کے پروردہ اور گہری واقفیت و انسیت رکھنے کے باوجود مغربی مغلوبیت اور نو آبادیاتی سوچ، انسان کو فاتح قوم کے منشا کے زیرِ نگیں بنا دیتی ہیں جس کے باعث مفتوح قوم بھی سماجی جکڑ بندی اور نقائص سے باہر نہیں نکل پاتی ہے۔

بعد الذکر مضمون مشہور و معروف ادیب و ناقد شمس الرحمٰن فاروقی کا ہے جن کا عنوان 'اکبر الہ آبادی: نو آبادیاتی نظام اور عہدِ حاضر' کا احاطہ کرتا ہے۔ مطالعے کے دوران زیرِ نظر مضمون کی افادیت و معنویت کھُل کر سامنے آتی ہے۔ اکبر الہ آبادی کے اشعار کو جب یہ سامراجی نظام اور نو آبادیاتی نظام کے مشاہدے و تجربے کی روشنی میں پرکھتے ہیں تو عجیب و غریب نکات اُبھر کر سامنے آتے ہیں جو اکبر کو محض قدامت پسند یا صرف طنز و مزاح کا شاعر کہنے پر مجبور نہیں کرتا ہے بلکہ یہ غور و فکر کرنے پر آمادہ کرتا ہے کہ کس طرح اکبر کو اقبال اور گاندھی کی طرح مغربی ممالک کا دورہ کرنے اور نہ ہی مغربی تہذیب کو قریب سے دیکھنے سمجھنے کا موقع ملا، پھر بھی مغرب کی نو آبادیاتی اور سامراجی نظام کی علامتوں اور مضمرات کو بخوبی سمجھ لیا تھا جو ہندوستانیوں اور مشرقی نظام کے لیے نامناسب اور غیر صحت مند تھا۔

صد سالہ صحافت ضلع بجنور (1890-1990)

مصنف: شکیل احمد خان شکیل بجنوری

صفحات: 320، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: اوتچل پرکاشن، بجنور، یوپی

مبصر: ڈاکٹر فرزانہ خلیل، F-148/1، شاہین باغ، نئی دہلی

مذکورہ کتاب سرزمین بجنور کے کہنہ مشق شاعر اور ادیب جناب شکیل بجنوری کی تحقیقی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ موصوف کا تعلق ایک ایسے ادبی گھرانے سے ہے جہاں گذشتہ ایک صدی سے شعر و ادب کا چراغ روشن ہے اور یامین بجنوری کی شعری روایت کو شکیل بجنوری

نے بجنور میں قائم و دائم رکھا ہے۔ مذکورہ کتاب سے قبل موصوف کا شعری مجموعہ دشت جنوں منظر عام پر آچکا ہے۔ ماضی قریب میں انھوں نے تاریخ ادب بجنور جیسی کتاب لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ انھیں شعر گیسو سنوارنے کے ساتھ ہی تحقیق و تنقید سے بھی خاصا لگاؤ ہے۔ پیش نظر کتاب ان کی ایسی ہی کاوشوں کی توثیق ہے لیکن ادبی منظرنامے سے الگ ہٹ کر صحافت کے منظرنامے پر نئے نقوش ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

یوں تو سرزمین بجنور کا ادبی اور صحافتی ماضی بہت روشن رہا ہے۔ ان دونوں شعبوں میں اس ضلع کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ صحافت کے زمرے میں اس کی کمی شدت سے محسوس کی جارہی تھی کہ کوئی ایسی کتاب منظر عام پر آئے جو اس سرزمین کے اخبارات اور صحافیوں کا بھرپور احاطہ کرتی ہو۔ صد سالہ صحافت ضلع بجنور نے اس کمی کو بڑی حد تک پورا کر دیا ہے۔ تین سو بیس صفحات پر مشتمل یہ کتاب ہندوستان میں اردو صحافت کی تاریخ میں ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ حالانکہ اس سے قبل اردو صحافت پر کئی اہم کتابیں آچکی ہیں۔ لیکن اس کتاب کا اختصاص اور کتابوں سے الگ ہے۔ عموماً کتابوں میں اخبارات سے متعلق تفصیل ہوتی ہے۔ اس کے برعکس شکیل بجنوری کی اس تصنیف میں نہ صرف بجنور سے شائع ہونے والے اخبارات کی عددی اور لفظی تفصیلات ہیں بلکہ ان اخبارات کی تصاویر اور مالک و مدیران کی تفصیلات بھی شامل ہیں جس کی وجہ سے اس کتاب کی اہمیت دوبالا ہوجاتی ہے۔

اس کتاب میں تحقیقی الجھنوں اور پریشانیوں سے بچنے کے لیے مصنف نے ضلع بجنور کی صحافتی تاریخ لکھتے وقت تحصیل وار اس کا جائزہ لیا ہے۔ اس ضلع میں کل پانچ تحصیل ہیں اور ہر تحصیل سے کتنے اخبارات نکلتے ہیں۔ ان کے مالک اور مدیر کون تھے۔ ان کی علمی اور صحافتی استعداد کیا تھی۔ ان سب موضوعات پر شکیل بجنوری نے نہایت محققانہ نظر ڈالی ہے۔ وہ یہیں پر اکتفا نہیں کرتے۔ اخبارات کا جائزہ لیتے ہوئے ضلع بجنور کی پانچ تحصیلوں سے شائع شدہ رسائل کا ذکر بھی بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ بعض اخبارات اور رسائل کے بارے میں اردو دنیا جانتی ہی نہیں ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تحصیل بجنور یعنی شہر بجنور سے 21 ہفت روزہ، ایک ماہنامہ، ایک پندرہ روزہ، 2 روز نامہ اور ایک سہ روزہ اخبار شائع ہوتا تھا۔ ان میں سے 16 اخبارات کی تصویریں دی گئی ہیں جب کہ رسائل کے حوالے سے فخرالحسن (ہفت روزہ) غنچہ (ہفت روزہ) فاران ماہنامہ، گلدستہ صوفیہ، گلزار درخشاں ماہنامہ، گگن اور افق تا افق ماہنامہ جیسے رسائل کی تفصیل اور تصویر دی گئی ہے۔ جبکہ رسالے کے زمرے میں رسالہ کا زنظیر کو رکھا گیا ہے مگر اس کی تفصیلات سے یہ پورا کا پورا ہفت روزہ اخبار معلوم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس تحصیل نجیب آباد سے ایک اخبار خضر حیات اور ایک ادبی ماہنامہ عبرت کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ ہم نشین اخبار کو قصبہ کرت پور کے تحت شامل کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ قصبہ تحصیل نجیب آباد کا ہی حصہ ہے۔ اس کے علاوہ نگینہ اور دھامپور جیسے قصبات سے بھی شائع ہونے والے اخبارات اور رسائل کا ذکر کیا گیا ہے لیکن ان کی تعداد بہت ہی کم ہے۔

جناب شکیل بجنوری کی اس کتاب میں اخبارات کے علاوہ بجنور میں بولی جانے والی زبان کا لسانی جائزہ بھی لیا گیا ہے اور ہر ایک تحصیل کی تاریخ بیان کی گئی ہے تاکہ قاری کو اس خطے سے متعلق بھی آگاہی حاصل ہوسکے۔ جتنے اخبارات کا ذکر اس اخبار میں آیا ہے۔ تقریباً تمام کے مدیران اور مالک کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

سرزمین بجنور سے تعلق رکھنے والے ان صحافیوں کا تذکرہ اور ان کی وابستگی کو بھی موضوع تحریر بنایا گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اندرونِ بجنور سے بیرون بجنور تک اہلِ بجنور نے کس طرح اردو صحافت کی خدمت کی ہے۔

لیکن موجودہ دور میں بجنور کی اردو صحافت ایک تاریک دور سے گزر رہی ہے۔ اس کا صحافتی ماضی جتنا روشن تھا حال اتنا ہی اندوہ ناک ہے۔ پورے ضلع میں گھوم جائیں کہیں اردو کا اخبار عمومی طور پر نظر نہیں آتا اور تادمِ تحریر اس ضلع سے کوئی اردو کا اخبار شائع نہیں ہو رہا ہے جس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس ضلع میں اردو صحافت کا حال کیا ہے۔

بہر حال یہ کتاب ہندوستان میں اردو صحافت کی ایک اہم کڑی ہے اور اس سے مزید صحافت کے تحقیقی راستے وا ہوں گے۔ یہ کتاب ہمیں بجنور کے حوالے سے بالخصوص اور ہندوستان کے حوالے سے بالعموم اردو صحافت کی صورت حال پر غور و فکر کی دعوت دے رہی ہے۔ حالانکہ یہ کتاب کسی ادارے کے ذریعے منظر عام پر آنی چاہیے تھی لیکن شکیل بجنوری نے تن تنہا یہ کام کیا ہے جس کے لیے اہل اردو صحافت ہمیشہ ان کے متشکر رہیں گے۔

اردو کی مجلاتی صحافت اور غیر ملکی ادارے

مصنفہ: ڈاکٹر شگفتہ یاسمین

صفحات: 238، قیمت 300 روپے، سنہ اشاعت 2014

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: ماہِ نور، ایف 39/13، تھرڈ فلور، شاہین باغ جامعہ نگر، نئی دہلی

محترمہ ڈاکٹر شگفتہ یاسمین اکیسویں صدی کے چکا چوند برقی انفارمیشن ٹکنالوجی کے عہد میں بالکل بھی محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ محترمہ حالانکہ بہ یک وقت زندگی کے مختلف شعبہ ہائے جات میں سرگرم عمل ہیں لیکن آل انڈیا ریڈیو، دوردرشن اور اردو ادب سے گہری دلچسپی نے محترمہ کو ایک الگ پہچان دی۔ محترمہ کو صحافت سے اس قدر پیار ہے کہ وہ اپنی اس اہم تصنیف کو میدانِ صحافت کے ان مجاہدین کے نام منسوب کرتی ہیں جنھوں نے اپنے خونِ جگر سے صحافتی شمع کو فروزاں رکھا ہے۔ صحافت پر اس سے قبل بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بڑے بڑے ماہرین اساتذہ کی درجنوں کتابیں فن صحافت کے موضوع سے پوری طرح انصاف کرتی نظر آتی ہیں۔

محترمہ کی کتاب کے ٹائٹل سے صاف ظاہر ہے کہ وہ صرف غیر ملکی اداروں کی مجلّاتی صحافت کو موضوعِ بحث بنانا چاہتی ہیں لیکن اس ٹائٹل میں موجود لفظ صحافت نے محترمہ کو مجبور کر دیا کہ وہ ابتداء صحافت کا مفہوم اور اس کی ارتقا پر بحث کریں۔ محترمہ نے اس نزاکت کا صحیح معنوں میں حق ادا کیا ہے۔ صحافت کی لغوی اور اصطلاحی تعریف کے ساتھ ساتھ اس کے انگریزی متبادل لفظ Journalism کی بھی لغوی پیوند کاری قابل تعریف ہے۔

اخبارات کے تذکرے کے بعد ہندوستان میں اردو کی مجلّاتی صحافت کے ارتقا کا پورا باب اس تصنیف کا حصہ ہے۔ اس باب کے ضمن میں رسائل و جرائد کی نوعیت اور اہمیت کا تذکرہ ہے، فرد کی ذہن سازی اور شخصیت کی تعمیر میں رسائل و جرائد کا بڑا ہاتھ رہا ہے اور چونکہ بالعموم جرائد ہر ماہ منظر عام پر آتے ہیں اس لیے قاری کو جس شدت سے اس کا انتظار ہوتا ہے اور اس کے مشمولات بھی بہ مقابلہ اخبارات مختلف ہوتے ہیں جریدے کا سب سے اہم ترین جزو اداریہ ہوتا ہے جس میں ماہر مدیر ملکی، ملی، سماجی، سیاسی، معاشرتی، بین الاقوامی اور دیگر پالیسیز اور پروگرامس پر پورا تجزیہ کرتا ہے۔ محترمہ نے جامعیت کے ساتھ مجلّاتی صحافت کے ارتقا کے پورے باب کو جنوبی ہندوستان سے شمالی ہندوستان تک محیط کرتے ہوئے صحافت اور ادب کے رشتے کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ پھر شروع ہوتا ہے اصل باب 'مجلّاتی صحافت کے فروغ میں غیر ملکی اداروں کا حصہ' اس باب کے مشمولات تھوڑا سا حیران کرتے ہیں، محترمہ کی پیدائش چونکہ کویت کی ہے اور ثانوی درجات انھوں نے وہیں رہ کر تعلیم حاصل کی اس لیے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اور زیادہ بہتر ہوتا کہ اگر ضمناً ہی سہی وہ سعودی عرب، قطر، یو اے ای اور بحرین

سے شائع ہونے والے اردو مجلّات اور اخبارات کا بھی ذکر کردیتیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے بعد تیسری بڑی اردو دنیا گلف ممالک کی ہے۔ برٹین کا نمبر میرے علم کے حد تک اس کے بعد آتا ہے۔ غالباً محترمہ نے اپنی تصنیف کو ہندوستان تک محدود رکھنے کا فیصلہ کرلیا ہے اس لیے جملہ راہِ اسلام، مجلّہ برٹش جائزہ اور بعد اسپین کو خاص طور سے موضوع تحریر بنایا ہے۔ میرے حساب سے یہ تصنیف اردو کی مجلّاتی صحافت اور غیرملکی ادارے کے بجائے ہندوستان کے شائع ہونے والے اردو صحافتی مجلّات اور غیرملکی ادارے کے نام سے موسوم ہوتی تو موضوع کا 100 فیصد حق ادا ہوتا۔ بہرحال ایک تشنگی کا احساس باقی ہے۔

آگے کے ابواب میں مجلّاتی صحافت کے فروغ میں مجلّہ راہ اسلام کی حصہ داری کا تذکرہ ہے محترمہ نے ایران اور ہندوستان کے رشتے سے لے کر، ثقافتی روابط اور ایرانی مہاجرین کی ہندوستان آمد اور سکونت کے سبب ہندوستانی تہذیب وتمدن، ادب اور ثقافت پر جو گہرے اور قابل ذکر اثرات مرتب ہوئے سب کا تذکرہ کیا ہے۔

مصنفہ نے مجلّاتی صحافت کے فروغ میں میگزین اسپین کا کردار نامی مرکزی باب کا باقاعدہ آغاز کیا ہے۔ اس کو میں نے مرکزی باب اس کی ضخامت کے سبب کہا ہے۔ محترمہ نے کل 73 صفحات میگزین اسپین کے تعارف وتبصرے میں رقم کیے ہیں۔ محترمہ نے ہندوستان اور امریکہ کی تہذیب وتمدن اور ثقافت وروایات کی مشترکہ قدروں پر گفتگو سے بحث کا آغاز کیا ہے پھر مجلّے کی پوری تاریخ اور اشاعت کے سفر پر طویل بحث کی ہے کہ 1960 سے انگریزی پھر ہندی اور پھر اردو تک سفر کس کس طرح طے کیا۔

تصنیف کے آخری چند صفحات مجلّاتی صحافت کے فروغ میں میگزین برٹش جائزہ کی حصہ داری کے نام ہیں۔ برٹش جائزہ برٹش ہائی کمیشن کے پریس اینڈ پبلک افیئرس ڈپارٹمنٹ سے شائع ہوتا ہے۔ اس باب کے تحت محترمہ نے ہندوستان میں برطانوی سفارت خانے کے ذریعے اس اردو جریدے کے اجرا کے اغراض ومقاصد کو بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ دونوں ممالک کے تعلقات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے اور ساتھ ہی میگزین برٹش جائزہ کے مدیر سے کی گئی گفتگو کو بھی محترمہ نے نقل کیا ہے۔ تصنیف اپنی طباعت، ٹائٹل، سرورق اور گیٹ اَپ کے اعتبار سے دیدہ زیب ہے۔ آخر میں اردو کے اہم ادبی رسائل وجرائد کی ایک alphabetic فہرست نقل کی ہے جس میں جاری اور موقوف دونوں قسم کے جریدوں کا ذکر ہے یہ فہرست طلبہ اور اسکالرز کے لیے کافی مفید ہوسکتی ہے۔

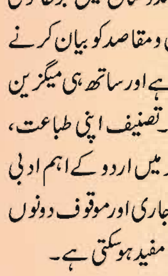

امداد امام اثر: شخصیت اور تنقیدی تصورات

مرتب: امتیاز عالم

صفحات: 291، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: تفسیر حسین، ریسرچ اسکالر، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

امتیاز عالم جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی کے شعبۂ اردو کے ریسرچ اسکالر ہیں۔ وہ نئی سوچ اور نئی فکر کے مالک ہیں۔ وہ امداد امام اثر اور ان کے علمی، ادبی وتنقیدی خدمات کے تعلق سے بہت سنجیدہ ہیں اور ان کی نئی جہتوں کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں کتابی شکل میں 'امداد امام اثر: شخصیت اور تنقیدی تصورات' امتیاز عالم کی ایک منظّم کوشش ہے۔ اس سے پہلے ان کے مرتب کردہ تین شعری مجموعے: نازش نسبت (2010)، کاوش نسبت (2011) اور متاع زندگی (2011) شائع ہوچکے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ جدید اردو تنقید کے بنیاد گزاروں میں امداد امام اثر کی شخصیت ایک دھندلی سی تصویر کی مانند رہی ہے جن کے خدوخال اب اردو کی ادبی دنیا میں آہستہ آہستہ واضح ہورہے ہیں۔ وہ علوم وفنون کے کئی علاقوں سے شناسائی رکھتے تھے۔ وہ اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اردو اور فارسی کے علاوہ انگریزی میں بھی شاعری کی۔ جدید تنقید کے موضوع پر مغربی تنقیدی تصورات سے براہ راست استفادہ کرتے ہوئے باضابطہ مستقل تنقیدی شعور کے تحت لکھی جانے والی کتابوں میں کاشف الحقائق کو اولیت حاصل ہے۔ وہ اردو کے پہلے نقاد ہیں جنھوں نے اردو شاعری کو عالمی شاعری کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش بھی کی اور اس کے تئیں ایک پرمغز و دوررس فکر بھی دی۔ اس کے علاوہ انھیں اردو اور فارسی کے ساتھ انگریزی میں بھی شاعری کرنے کا شرف حاصل ہے۔

زیرتبصرہ کتاب میں تاثر، تقریظ وتقدیم کے طور پر چار تحریریں شامل ہیں۔ اس کے بعد مرتب موصوف کا ایک مبسوط، مفصل اور معلومات افزا تحقیقی مقدمہ ہے۔ بعدہ مرتب کا ایک مضمون بعنوان 'امداد امام اثر اور امام فیملی کی سمت ورفتار' بھی شامل ہے جس میں امام فیملی کے علمی، سماجی وسیاسی ارتقا پیش کیا گیا ہے۔ اثر کے شخصی حالات، ذاتی کوائف، ادبی معمولات و مشغولیات سے متعلق نو مضامین 'شخصیت' کے عنوان کے تحت دیے گئے ہیں جن کے مطالعہ سے نہ صرف اثر کے شخصی حالات سے واقفیت حاصل ہوتی ہے بلکہ ان کے عادات، مزاج، تبحر علمی، نشست وبرخاست، دلچسپی اور علمی وادبی سرگرمی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

'تنقیدی تصورات' کے عنوان کے تحت دیے گئے مضامین کی تعداد بھی نو ہے جو ان کے تنقیدی نہج اور طریقۂ کار سے بحث کرتے ہیں اور انھیں ادب کے آفاقی نقطۂ نظر کے حامل وسیع المطالعہ شخصیت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان مضامین کے مطالعے سے اثر کے ادبی حدود سے شناسائی ہوتی ہے کہ وہ اپنے ہمعصروں میں ادبیات عالم کا زیادہ گہرا اور براہ راست علم رکھتے تھے اور مغربی ادب کے حوالہ سے ان کا رویہ آزادانہ اور گہری فکر کا حامل ہے۔ اس باب کے تحت بھی پہلا مقالہ مرتب موصوف کا ہے جو 'کاشف الحقائق' کی تحقیق پر مبنی ہے۔ تنقید تحقیق کے بغیر نامکمل ہے اس لیے بعد کے مضامین ومقالات کے مطالعہ سے قبل اس کا مطالعہ اہمیت سے خالی نہیں۔ اس میں مرتب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ 'کاشف الحقائق' تنقیدی شعور کے تحت لکھی گئی پہلی باضابطہ مستقل کتاب ہے۔ جو مضامین بطور خاص قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہیں وہ اس طرح ہیں: 'کاشف الحقائق کا عالمی منظر نامہ' پروفیسر وہاب اشرفی، مرحوم 'امداد امام اثر بحیثیت نقاد' ڈاکٹر عبدالخالق، 'امداد امام اثر کی تنقید' ناصر عباس نیر، 'امداد امام اثر اور غزل کی تنقید' ڈاکٹر سرورالہدیٰ۔ تنقیدی تصورات کے ضمن میں دیے گئے مضامین میں پروف کی غلطیاں بقیہ حصے کے مقابلہ میں زیادہ ہیں۔ اخیر میں ضمیمے کے طور پر اثر کی اہم ونایاب تحریریں ونگارشات بھی شامل کی گئی ہیں جن سے بھی اس کتاب کی اہمیت میں اضافہ ہوتا ہے مثلاً خطوط، آپ بیتی (اثر کی ایک نہایت مختصر سوانحی تحریر)، انگریزی نظم، کتاب الاثمار اور مرآۃ الحکما کے انگریزی میں لکھے گئے دو مقدمے اور ایک انگریزی مقالہ۔ مرتب نے امداد امام اثر کی شکل وشباہت سے قاری کو روبرو کرنے کی خاطر ان کی پانچ تصویریں بھی کتاب میں شامل کی گئی ہیں۔

مجموعی طور پر اثر شناسی میں یہ کتاب اہم حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ نہ صرف اثر فہمی کی راہیں ہموار کرتی ہے بلکہ ابتدائی دور کی جدید اردو تنقید کے تعلق سے قائم تصورات پر از سرِ نو غور وخوض کی دعوت بھی دیتی ہے۔

ٹیگور اور اقبال

مرتب: ڈاکٹر ندیم احمد

صفحات: 256، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

مبصر: شاہ نواز فیاض، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

رابندر ناتھ ٹیگور اور علامہ اقبال دونوں انیسویں صدی کے نصف آخر میں پیدا ہوئے

اور بیسویں صدی کے نصف اول میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ دونوں نے آزاد ہندوستان کا خواب دیکھا، اور اس کے حصول کے لیے دونوں نے اپنے قلم سے جنگ آزادی کی تحریک کو مہمیز کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے سامنے آزادی کا سورج طلوع نہیں ہوسکا۔ اس دنیا سے رخصت ہوئے انھیں ستر سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے، لیکن ایک فنکار کی حیثیت سے دونوں زندہ ہیں۔ دنیائے ادب میں ان دونوں کو شاعری سے ہی شہرتِ دوام حاصل ہوئی۔ نثر میں بھی دونوں نے اپنے فن کا اظہار کیا ہے۔ لیکن اس اعتبار سے ٹیگور کی جہتیں زیادہ ہیں۔ ٹیگور کے فکر وفن پر دیگر زبانوں میں بھی کافی کام ہوا ہے۔ اردو میں بھی ان کے کچھ حصوں کا ترجمہ کیا گیا ہے، لیکن دونوں کے کارناموں پر ایسی کوئی مبسوط کتاب موجود نہیں تھی، جسے پڑھ کر تشفی ہوتی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں 'ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم' نے اس تشنگی کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اس پروجیکٹ کے تحت اب تک متعدد کتابیں گیتانجلی، ٹیگور شناسی، میری یادیں، ٹیگور کے ڈرامے، ٹیگور کے مضامین، باغبان، ٹیگور شاعر اور دانشور، ٹیگور فکر وفن کے ہزار رنگ منظر عام پر آچکی ہیں۔ 'ٹیگور اور اقبال' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

زیر نظر کتاب 'ٹیگور اور اقبال' دراصل ان منتخب مضامین کا مجموعہ ہے، جو ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم کے تحت انٹر یونیورسٹی تحریری مقابلہ میں جمع کیے گئے تھے۔ اس تحریری مقابلے میں تیس سے زائد یونیورسٹیوں اور کالجوں کے ریسرچ اسکالرز اور طلبہ وطالبات نے حصہ لیا تھا۔ اس کتاب میں دو مضامین کے علاوہ باقی مضامین ریسرچ اسکالرز کے تحریر کردہ ہیں۔ اس کتاب میں 'عرض مرتب' کے علاوہ کل اٹھارہ مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون معروف صحافی اور ادیب جناب شمیم طارق کا '' ٹیگور اور اقبال'' کے عنوان سے ہے۔ دوسرا مضمون شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد ڈاکٹر کوثر مظہری کا 'ٹیگور اور اقبال' کے عنوان سے ہی شامل کتاب ہے۔ اس کے علاوہ سولہ ایسے مضامین اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں، جو ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے ریسرچ اسکالرز کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان مضامین کو پڑھ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ٹیگور اور اقبال دونوں ہندوستانی ادبیات کے ستون ہیں، اور ہندوستانی ادب کی عمارت انہیں پر تعمیر کی گئی ہے۔ اکیسویں صدی کے نئے لکھنے والوں نے جس طرح سے ان دونوں ادیبوں کو کہیں موازنہ کی صورت میں تو کہیں یکساں خیال کے طور پر ایک دوسرے کا مطالعہ کیا ہے، وہ یقیناً خوش آئند علامت ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'ٹیگور اور اقبال' اس اعتبار سے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ اس کے مطالعہ سے ان دونوں تخلیقی فنکاروں کے بہت سے ایسے گوشے ہماری نظروں کے سامنے آجاتے ہیں، جو ٹیگور اور اقبال میں مشترک ہیں۔ اگر اس کتاب کے موضوعات پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ مرتب کتاب ڈاکٹر ندیم احمد نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ مضامین کی تکرار نہ ہونے پائے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ان ریسرچ اسکالرز کے پختہ ذہن کا بھی اندازہ ہوتا ہے، جن کے مضامین شامل کتاب ہیں۔

زیر نظر کتاب 'ٹیگور اور اقبال' کے مرتب ڈاکٹر ندیم احمد جامعہ ملیہ اسلامیہ، شعبۂ اردو میں درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اس سے پہلے آپ کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، جن میں تعبیر وتفہیم اور ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت، خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ اقبال اور ٹیگور دونوں کے فکر وفن پر ان کی زندگی اور بعد کے دنوں میں مسلسل لکھا جاتا رہا ہے اور ان کے فکر وفن کے بے شمار گوشوں کی داد دی جاتی رہی ہے البتہ غالبًا یہ پہلا موقع ہوگا جبکہ اردو کی تازہ کار نسل نے ایک ساتھ اقبال اور ٹیگور پر اتنی بڑی تعداد میں لکھا ہے، اور نئے نئے گوشوں کو پیش کیا ہے۔ یہ کتاب ٹیگور اور اقبال کے شیدائیوں کے لیے کسی بڑے تحفے سے کم نہیں۔

کتاب صوری اور معنوی دونوں خوبیوں سے آراستہ ہے۔ ڈاکٹر ندیم احمد نے اس کتاب کا انتساب 'ٹیگور اور اقبال کے شیدائیوں کے' نام کیا ہے۔ یہ کتاب شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے دفتر 'ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم' سے مفت حاصل کی جاسکتی ہے۔ امید ہے کہ قارئین اس کتاب کو پسند کریں گے اور قبولیت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

نثریات وشعریات

مصنف: ڈاکٹر افضال عاقل

صفحات: 164، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: شعبۂ اردو، بھیرب گنگولی کالج، فیڈر روڈ، بیل گھریا، کولکاتا 56

مبصر: ظعینہ پروین، مکان نمبر 31

کیمپس نواداعربک کالج، ٹیگور مارگ، لکھنؤ

نثریات وشعریات ڈاکٹر افضال عاقل کے ان تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول نثریات۔ باب دوم شعریات اور سوم نثریات وشعریات کے نام سے ہے۔ نظم ونثر کے مختلف عناوین پر مشتمل کل بیس مضامین شامل کتاب ہیں۔ یہ مضامین اگرچہ تنقیدی ہیں لیکن بعض مضامین اردو دنیا کے لیے تعارف کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ اردو کا عام ادبی حلقہ ان ادیبوں اور فنکاروں سے مکمل طور پر واقف نہیں ہے۔

ابتدا میں ہمایوں جاوید کی تحریر شامل کتاب ہے جو کتاب اور صاحب کتاب کے تعارف کا بہتر وسیلہ ہے۔ کتاب کے مطالعہ کے بعد ہمایوں جاوید کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑے گا کہ افضال عاقل کی تحریروں میں پیچیدگی، کرتب بازی اور قلابازی نہیں ہے۔ ان کا تنقیدی رویہ گرچہ تاثراتی ہے مگر ان کے بعض مباحث لائق توجہ اور فکر انگیز ہیں۔

کتاب میں شامل ایک مضمون 'میزان قدر: ادب کا آگہی نامہ' پروفیسر نصر غزالی کی تنقیدی وتحریری بصیرتوں کا آئینہ دار ہے۔ افضال عاقل نے پروفیسر نصر غزالی کے تخلیقی شعور کو نئے ادبی رویوں کے ساتھ ہم آہنگ کرکے دیکھا ہے۔ وہ تنقید کو کسی چوکھٹے کے اندر قید کرنے کے روادار نہیں۔ ناز قادری کی نعت گوئی پر تعارفی مضمون بھی کتاب کی زینت ہے۔ صاحب کتاب نے ناز قادری کی نعتیہ شاعری پر گفتگو کے دوران ان کے اشعار بھی درج کیے ہیں جن سے قاری براہ راست ان کی نعت گوئی کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

کناڈا میں مقیم اردو کے معروف ادیب اور ڈرامہ نگار جاوید دانش کے مشہور ڈرامے 'ہجرت کے تماشے' کو بھی افضال عاقل نے تنقید کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔ زماں قاسمی کے تحقیقی وتاثراتی مضامین 'عکس در عکس' کا مختصر مگر جامع تعارف پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے صاحب کتاب کی سادہ اور سلیس نثر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کتاب کے مطالعہ کے دوران جگہ جگہ افضال عاقل کے خلوص اور ادب وشعر کے لیے ان کے بے لوث جذبے کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کتاب کا ایک اہم مضمون احمد فراز کی شاعری سے متعلق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ احمد فراز کی شہرت اور مقبولیت غیر معمولی تھی۔ کتاب میں شامل مضمون سے افضال عاقل کی شعری وابستگی کا خاطر خواہ اندازہ لگا تا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ فاخر جلال پوری، عاصم شہنواز شبلی، علقمہ شبلی، صابرہ خاتون اور حامدی کاشمیری جیسے شاعروں اور نقادوں کی تحریروں کا مطالعہ بھی نثریات وشعریات میں کیا گیا ہے۔

18 ویں عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ کی تقسیم

نئی دھلی: عالمی شہرت یافتہ تنظیم 'مجلس فروغ اردو ادب دوحہ قطر' کے زیر اہتمام دوحہ ریڈیسن بلو ہوٹل کے جیوانا ہال میں 18 ویں عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ کی تقسیم اور عالمی مشاعرہ 2014 کا انعقاد کیا گیا۔ یہ ایوارڈ وزارت الثقافت والفنون والتراث، دولت قطر کے مشیر جناب موسیٰ زین الموسیٰ کے ہاتھوں تاحیات اردو زبان وادب کی گراں قدر اور اعلیٰ خدمات کے اعتراف میں ہندوستان سے ممتاز اردو فارسی کے دانشور محقق اور ادیب پروفیسر شریف حسین قاسمی اور پاکستان کے نامور نقاد و فکشن نگار ڈاکٹر سلیم اختر کو پیش کیا گیا۔ جناب موسیٰ زین الموسیٰ نے اس موقعے پر اپنی تقریر میں کہا کہ مجلس گزشتہ کئی برسوں سے اردو زبان وادب کی بے لوث خدمت انجام دے رہی ہے جو ناقابل فراموش ہے۔ اس موقعے پر قطر کے وزیر برائے الثقافت والفنون والتراث، دولت قطر عالی جناب ڈاکٹر حماد عبدالعزیز الکواری کا پیغام بھی پڑھ کر سنایا گیا اور ان کی طرف سے تمام اراکین مجلس کو تقریب کی مبارکباد پیش کی گئی اور مجلس فروغ اردو ادب کے چیئرمین محمد عتیق نے ایوارڈ یافتگان کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے ہندوستان میں ایوارڈ جیوری کے چیئرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ اور

پاکستان میں ایوارڈ جیوری کے چیئرمین انتظار حسین کا بطور خاص شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے اس فنکشن کے انعقاد میں خصوصی تعاون کے لیے وزارت ثقافت والفنون کا شکریہ ادا کیا۔ جناب محمد عتیق نے بانی مجلس ملک مصیب الرحمٰن (مرحوم) کی ہر دلعزیز شخصیت، ان کے عزم و استقلال اور ان کی لازوال اردو خدمات کو بھی خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اس موقعے پر ایم صبیح بخاری نے کہا کہ مجلس کی یہ خوش نصیبی ہے کہ اس نے اس برس دو بڑی ادبی شخصیتوں کو اپنے ادبی ایوارڈ سے نوازا اور انھوں نے اسے قبول فرمایا۔ ہندوستانی سفارت خانے کی چانسری کے سربراہ سنیل تھاپلیال نے کہا کہ بیرون ممالک میں اس طرح کے پروگرام کے انعقاد سے اردو کی مقبولیت اور اس کی طاقت کا اندازہ ہوتا ہے اور اسی نوع کے پروگراموں سے اردو زبان وادب کو فروغ حاصل ہوگا۔ نظامت کے فرائض شوکت علی ناز اور سید فہیم الدین نے بحسن وخوبی ادا کیے۔ اس تقریب میں ایوارڈ یافتگان کی خدمات پر لکھے گئے مضامین پر مشتمل ایک یادگار مجلّہ کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ 18 ویں عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ کی تقریب پذیرائی پروفیسر انور مسعود کی صدارت میں منعقد ہوئی۔

روزنامہ 'عزیز الہند'، دہلی، 18 نومبر 2014

ٹورنٹو میں یومِ اقبال کا انعقاد

عالمی مجلس اقبال کے زیر اہتمام نومبر 2014 کو ٹورنٹو میں یومِ اقبال کے حوالے سے تقریب منعقد کی گئی، تقریب میں نظامت کے فرائض، صدر عالمی مجلس اقبال، نعمان وحید بخاری نے انجام دیے۔

اپنی گفتگو کے آغاز میں عالمی مجلسِ اقبال کے جامع تعارف اور سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا ''عالمی مجلسِ اقبال کے قیام کی ایک واضح وجہ علامہ اقبال کے پڑھنے والوں اور علامہ اقبال کے پڑھانے اور سمجھانے والوں کے درمیان ایک ایسے پل کی صورت کھڑا ہونا تھا جس سے ایک طرف فکرِ اقبال اپنی صحیح شکل میں پہنچ جائے اور دوسری طرف مفکرینِ اقبال کو وہ طبقہ میسر آجائے جس تک وہ فکرِ اقبال کو منتقل کر سکیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنا مقالہ 'اقبال کو کیوں پڑھا جائے؟' کے عنوان سے پیش کیا۔ اپنے موضوع پر بات کرتے ہوئے انھوں نے اقبال کے پیغام کی ان جہتوں کی طرف اشارہ کیا جو 21 ویں صدی کے تناظر میں مزید اہمیت اختیار کر گئی ہیں۔

یومِ اقبال کی مناسبت سے منعقدہ پروگرام میں کینیڈا میں مقیم اقبال اسکالر افتخار حیدر صاحب کی کتاب درویش بے گلیم کی رونمائی بھی کی گئی۔

افتخار حیدر نے اپنے مقالے میں فکرِ اقبال کے مرکزی محرکات کے حوالے سے بات کرتے ہوئے بتایا کہ کلامِ اقبال کا ماخذ کلامِ خدا یعنی قرآن پاک ہے۔ تقریب میں شامل تمام شرکا نے عالمی مجلسِ اقبال (انٹرنیشنل اقبال سوسائٹی) کی کاوشوں کو بھرپور سراہا اور اس امر کی یقین دہانی کروائی کہ ٹورنٹو کے مریدینِ اقبال، فکرِ اقبال کے فروغ کے لیے عالمی مجلس اقبال کے ساتھ ہیں اور فکرِ اقبال کی اشاعت میں کوشاں رہیں گے۔

پریس ریلیز، نعمان بخاری، صدر عالمی مجلس اقبال، 20 نومبر 2014

نیپال ہند دوست ادبی اعزاز کا منظر

افضل منگلوری کو نیپال میں اعزاز

دهره دون: اتراکھنڈ کے عالمی شہرت یافتہ شاعر افضل منگلوری کو نیپال اردو اکیڈمی کاٹھمانڈو کی جانب سے 'نیپال ہند دوست' ادبی اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ کاٹھمانڈو کے ایک ہوٹل میں منعقد مشاعرہ میں نیپال اردو اکیڈمی کے صدر جناب عبدالمبین خان اور اکیڈمی کے سکریٹری جناب امتیاز وفا نے یہ اعزاز افضل منگلوری کو پیش کیا، اس موقعے پر نیپال کے سابق وزیر زراعت جناب اقبال شاہ اور ہند میں نیپال کے سابق سفیر جناب تلسی دیوسا اور ہند کے سفارتخانہ کے نائب سفیر جناب موہن چند بہوگنا نے کہا کہ اردو ہندی اور نیپالی زبانیں برصغیر کی تہذیبی و ادبی رشتوں کے لیے پُل کا کام کرتی ہیں۔ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جناب پروفیسر ابصار احمد کاظمی نے کہا کہ نیپال میں اردو کے فروغ کے لیے جو کام غیر مسلم حضرات کر رہے ہیں وہ قابل ستائش ہے۔ اس موقعے پر افضل منگلوری کو اعزازی طور پر نیپالی ٹوپی و سپاس نامہ اور مومنٹو پیش کیا گیا۔ اس تقریب میں نیپال کے شعرا میں سے محترمہ شیتل کادمبری، کرشن جنگ بہادر، کیلاش چندر، امتیاز وفا، ثاقب ہارونی اور انجم اشرف وغیرہ نے اپنے اپنے کلام سے نوازا۔ صاحب اعزاز شاعر افضل منگلوری نے اس موقعے پر کہا کہ جس طرح سے عرب ممالک اور یوروپ میں اردو کے سیمینار اور مشاعرہ منعقد کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح آئندہ سالوں میں نیپال میں اردو مرکز بنانے کے لیے کوششیں کی جائیں گی جس میں ہندوستانی اسکالرس و ادیبوں اور شاعروں کا تعاون بھی لیا جائے گا۔

پریس ریلیز، آفتاب اظہر، 9 نومبر 2014

ایک شام جلیل نظامی کے نام

دوحہ: بزم اردو قطر نے علامہ ابن حجر لائبریری میں ایک تقریب بعنوان 'ایک شام جلیل نظامی کے ساتھ' کا انعقاد کیا۔ بزم اردو قطر نے ماہانہ مشاعرہ کے ساتھ شاعروں اور قلم کاروں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ایک سہ ماہی تقریب کا بھی آغاز کردیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلی خصوصی تقریب شاعر خلیج اور جلیل دکن کے طور پر مشہور شاعر جلیل نظامی کی خدمات کے اعتراف میں منعقد کی گئی۔ جلیل نظامی گزشتہ تین دہائی سے قطر میں مقیم ہیں اور وہ اپنی شاعری میں انفرادیت، زبان و بیان کی شائستگی اور منفرد خیالات کے لیے جانے جاتے ہیں۔ گرچہ جلیل نظامی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں، تاہم انھوں نے نغمے بھی لکھے ہیں اور ہندوستان میں عام آدمی پارٹی کے لیے ترانہ بھی انھوں نے ہی قلمبند کیا ہے۔ نظامی مشہور اردو شاعر مجروح سلطانپوری اور شاعر والی آسی کے شاگرد ہیں۔ نظامی نے نہ صرف چھٹی صدی کے عرب شاعر امرؤالقیس کے کلام کا اردو میں نظمیہ ترجمہ کیا اور اس کی تشریح کی ہے بلکہ انھوں نے اسداللہ خان غالب کے کلام کی بھی تشریح کی ہے۔ وہ انڈین اردو سوسائٹی کے بانی صدر ہیں اور قطر میں عالمی اور مقامی سطح پر اردو سمپوزیم کے انعقاد کی طویل تاریخ رکھتے ہیں۔ نومنتخب چیئرمین ڈاکٹر حنیف فیصل خیال نے تقریب کی صدارت کی، جبکہ سکریٹری افتخار راغب نے مہمان خصوصی مرزا عمران بیگ اور مہمان اعزازی اعزاز شیخ کا سامعین سے تعارف کرایا۔ اس موقعے پر جلیل نظامی نے اپنے کلام سے سامعین کو خوب لطف اندوز کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 دسمبر 2014

NHK اردو نشریات جاپان کے پروڈیوسر جعفر بلوچ کو الوداعیہ

گزشتہ روز جاپان کے NHK ریڈیو کے بین الاقوامی نشریاتی شعبے میں اردو زبان کے پاکستانی پروڈیوسر جعفر بلوچ کے اعزاز میں جاپان انٹرنیشنل پریس کلب JIPC کی جانب سے ٹوکیو کے علاقے اِکے بُوکورو میں واقع معروف پاکستانی ریسٹوران مرحبا میں الوداعی عشائیہ کا اہتمام کیا گیا۔ جعفر بلوچ صاحب اپنی تعینات کے چار سال مکمل کر کے وطن واپس جا رہے ہیں۔ جاپان کے معروف صحافتی ادارے JIPC کی یہ روایت رہی ہے کہ اس نے ہمیشہ حکومت پاکستان کی طرف سے جاپان متعین ہونے والے سرکاری و نیم سرکاری افسران کی آمد و روانگی پر ان کی مہمان نوازی کا شرف حاصل کیا ہے۔ جعفر بلوچ کے اعزاز میں دی جانے والی الوداعی نشست میں بزنس مین چوہدری آصف تھے جو عموماً ایسی علمی و ادبی نشستوں کی وسیع القلبی سے میزبانی کرتے ہیں۔ اس الوداعی نشست میں NHK ریڈیو سے وابستہ جاپانی و پاکستانیوں میں جعفر بلوچ کے جانشین حامد ظہور، میمونہ شمیل کے علاوہ انور میمن، گل رحمان Ms. Tkahashi, Mr. Doumitsu محترمہ فوزیہ، سفارت خانۂ پاکستان ٹوکیو کے پریس اتاشی

ڈاکٹر محمد رفیق سومرو، انجمن فروغ ادب جاپان کے تاحیات صدر ڈاکٹر عبدالرحمٰن صدیقی ان کی اہلیہ، ٹوکیو یونیورسٹی کے مطالعات خارجی میں شعبۂ اردو کے پروفیسر ڈاکٹر سہیل عباس ان کی اہلیہ، اردو زبان کے جاپانی پروفیسر Mr. Tsuyoguchi وزارتِ خارجہ جاپان کے سینئر افسر Mr. Yasushi Nakagawa معروف کالم نگار اور روزنامہ جنگ، جیو نیوز اور جیو ٹی وی کے بیورو چیف عرفان صدیقی، شاعر جاپان اور معروف ادیب محمد مشتاق قریشی، نوجوان صحافی ثاقب الرحمٰن، مسلم لیگ ن کے رہنما، شیخ ذوالفقار علی، پی پی پی کے سینئر رہنما نعم الغنی آرائیں، نوائے ٹوکیو کے چیف ایڈیٹر عمیر صدیقی، شیر شاہ اور دیگر صحافی برادری نے شرکت کی۔ جاپان انٹرنیشنل پریس کلب کے صدر چوہدری شاہد نے اپنے منفرد انداز میں عشائیہ میں شریک شرکا کا مختصر تعارف کرایا اور جعفر بلوچ کو ان کی شاندار خدمات پر خراجِ تحسین بھی پیش کیا۔ مہمانِ خصوصی جعفر بلوچ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جاپان انٹرنیشنل پریس کلب اور اس کی صحافتی سرگرمیوں کو سراہا اور تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

رپورٹ: ناصر ناکاگاوا، اردو نیٹ جاپان، 12 دسمبر 2014

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں
خبرنامہ

قومی اردو کونسل کی تشکیلِ نو، پدم شری جناب مظفر حسین کونسل کے نئے وائس چیئرمین بنائے گئے

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند کا سب سے بڑا اردو ادارہ ہے اور یہ ادارہ اردو زبان کی ہمہ جہت ترقی اور اس کے فروغ کے لیے ملکی سطح پر کام کر رہا ہے۔ مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل محترمہ اسمرتی زوبین ایرانی نے کونسل کی تشکیل نو کر دی ہے اور پدم شری جناب مظفر حسین کو کونسل کے نئے وائس چیئرمین کی ذمے داری دی گئی ہے۔ وائس چیئرمین کی نامزدگی کے ساتھ کونسل کے دیگر اراکین کی فہرست بھی وزارت نے جاری کر دی ہے، جس میں دو لوک سبھا کے اراکین اور ایک راجیہ سبھا رکن شامل ہیں۔ نئی کونسل میں اردو زبان و ادب اور اردو اداروں سے جڑی سرگرم شخصیات کو شامل کیا گیا ہے اور ملک کی مختلف ریاستوں کی نمائندگی کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ دیگر اراکین کے نام اس طرح ہیں: محترمہ شمع خان، دہلی۔ جناب محمد شکیل، راجستھان۔ جناب پی اے انعامدار، پونے۔ جناب رفیق بھنڈاری، بیجاپور (کرناٹک)۔ پروفیسر خورشید انور، مظفرپور (بہار)۔ محترمہ ڈاکٹر نصرت مہدی، بھوپال۔ پروفیسر محمد اقبال، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی۔ مولانا صہیب قاسمی، دہلی۔ پروفیسر صغیر افراہیم، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ پروفیسر شہاب عنایت ملک، جموں یونیورسٹی۔ جناب سید محمد اشرف، چیف انکم ٹیکس کمشنر، کلکتہ، جناب احتشام آفریدی، ایڈوکیٹ (وارانسی)۔ محترمہ ایس منوری بیگم، کرشنا گری، پروفیسر اختر الواسع، کمشنر برائے لسانی اقلیات۔ جناب کلیم انصاری، اتراکھنڈ۔ پروفیسر شافع قدوائی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ محترمہ حافظہ مظفر، ڈپٹی رجسٹرار این آئی ٹی، حضرت بل سری نگر۔ محترمہ شائستہ یوسف، بنگلور۔ جناب حاجی محمد اقبال خان، دہلی اور جناب مظہر الدین ریٹائرڈ آئی پی ایس (حیدر آباد) کے نام شامل ہیں۔

ان کے علاوہ کمشنر برائے لسانی اقلیات، وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے دو نمائندے، چیئرمین کمیشن برائے سائنسی و تکنیکی اصطلاحات دہلی۔ ڈائرکٹر سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لنگویجز میسور، ڈائرکٹر سینٹرل ہندی ڈائرکٹوریٹ، ڈائرکٹر کیندریہ ہندی سنستھان، (آگرہ)، ڈائرکٹر این سی ای آر ٹی، یو جی سی نمائندہ، چیئرمین انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز، چیئرمین ساہتیہ اکادمی، چیئرمین این بی ٹی اور ڈائرکٹر جنرل دوردرشن کے علاوہ وزارت برائے قانون و انصاف کے نمائندگان بھی اس نئی کونسل کا حصہ ہوں گے۔

فروغ اردو بھون میں کونسل کے نئے وائس چیئرمین پدم شری جناب مظفر حسین کے اعزاز میں استقبالیہ تقریب منعقد کی گئی جس میں گرم جوشی کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس موقعے پر حکومتِ ہند بالخصوص مرکزی وزیر

برائے فروغ انسانی وسائل محترمہ اسمرتی زبین ایرانی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو کا فروغ رونے سے نہیں بلکہ جدید ہندوستان کی مسکراہٹوں کے ساتھ جوڑنے سے ہوگا۔ ہندوستان پوری دنیا میں اردو کا سب سے بڑا نمائندہ ہے اور اردو ہندوستان کی بیٹی ہے۔ اس لیے اردو ہندوستان کی دھڑکن کا بھی نام ہے۔

کونسل کی مجموعی خدمات اور موجودہ ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کارکردگی پر خوشی کا اظہار کیا۔ اردو رسم الخط کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو کی روح اس کے رسم الخط میں ہے اس لیے اردو کی ہمہ جہت ترقی اردو کے رسم الخط کے بغیر ممکن نہیں۔

اس موقع پر کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے انھیں پھولوں کا گلدستہ اور ایک شال پیش کی اور کونسل کی جانب سے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ انھوں نے کونسل کے اغراض و مقاصد اور اس کی کارکردگی سے وائس چیئرمین جناب مظفر حسین کو واقف کرایا۔ اس استقبالیہ تقریب میں بیگم مظفر حسین کے علاوہ پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر (انتظامیہ) جناب کمل سنگھ، اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) محترمہ شمع کوثر یزدانی اور کونسل کے دیگر اسٹاف نے شرکت کی۔

اس موقعے پر نومنتخب وائس چیئرمین مظفر حسین نے کونسل کے صدر دفتر فروغ اردو بھون، دہلی میں اردو اخبارات کے مدیران اور خبر نویسوں کے ساتھ اردو کے حوالے سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان جب ترقی کرے گی تو ہندوستانیت اور ہندوستانی تہذیب بھی ترقی کرے گی۔ آج اردو ہر جگہ بولی جاتی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اب اس کو عملی طور پر تعلیم کے ساتھ جوڑا جائے۔ قبل ازیں کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ فروغ اردو کے حوالے سے ہم ساتھ ساتھ کام کریں گے۔ کمشنر برائے لسانی اقلیات حکومت ہند پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ کونسل نے اپنی بساط بھر کوشش کر کے اردو کو ٹکنالوجی سے جوڑا ہے۔ انھوں نے دستوری حق کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ دستور کے مطابق بچوں کی ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دی جائے۔ انھوں نے وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کے سہ لسانی فارمولہ کا خیر مقدم کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اطہر فاروقی، پروفیسر نصیر احمد خاں، پروفیسر ارتضیٰ کریم اور ڈاکٹر عقیل احمد نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 24 نومبر، 3 دسمبر، و روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 دسمبر 2014

قومی اردو کونسل نے اپنے کمپیوٹر مراکز کی نگرانی کے لیے موبائل پر مبنی مانیٹرنگ سافٹ ویئر لانچ کیا

کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری جناب مظفر حسین کے ہاتھوں مانیٹرنگ سافٹ ویئر کا اجرا

نئی دھلی: 05 دسمبر 2014 قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند، اردو کو روزگار اور کمپیوٹر ٹکنالوجی سے جوڑنے کے مقصد سے ملک بھر میں 425 کمپیوٹر مراکز چلا رہی ہے۔ ان مراکز کی نگرانی اور نظم و نسق میں بہتری لانے کے مقصد سے کونسل نے نیشنل انفارمیٹکس سینٹر کی مدد سے اپنا موبائل پر مبنی مونیٹرنگ سسٹم لانچ کیا ہے۔ کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری جناب مظفر حسین نے اس سافٹ ویئر کا اجرا کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کی موجودگی میں فروغ اردو بھون میں منعقد ایک تقریب کے دوران اپنے ہاتھوں سے کیا۔ اس کارنامے کو خوش آئند قرار دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو زبان میں عہد حاضر کے جدید تقاضوں اور ٹکنالوجی سے جڑنے کی تمام تر صلاحیت موجود ہے، جسے کونسل نے اپنی کاوشوں سے ثابت کر دکھایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس سافٹ ویئر سے نہ صرف کونسل کے مراکز کی نگرانی ممکن ہو سکے گی بلکہ ان کے دیگر مسائل حل کرنے میں بھی مدد ملے گی۔

کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ کونسل گزشتہ ایک سال سے اس کام میں مصروف تھی اور این آئی سی کی مدد سے اس ہدف کو آج پورا کر لیا گیا ہے۔ این آئی سی کے ذمے داران کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ مانیٹرنگ سافٹ ویئر موبائل سہولیات پر مبنی ہے، جس کے توسط سے تمام مراکز بالخصوص کلاس، اساتذہ، طلبہ کی حاضری اور لیب وغیرہ کی کارکردگی ہر دن اپ ڈیٹ کریں گے اور کونسل کی ویب سائٹ پر اپنی تمام تر تفصیلات و اطلاعات فوٹو کے ذریعے بھیجیں گے۔ انھوں نے کہا کہ فی الحال اس سافٹ ویئر کا تجربہ دہلی کے 18 مراکز پر کیا جائے گا، جس کے بعد ملکی سطح پر اس کا نفاذ کیا جائے گا۔

اس موقع پر این آئی سی کی ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل محترمہ منجو جندل سینئر ٹکنیکل ڈائرکٹر جناب پرتک شری واستو، جناب محمد انوار خان، جناب وکاس کمار نے بھی شرکت اور اس سافٹ ویئر کی افادیت پر روشنی ڈالی۔ میٹنگ میں دہلی مراکز کے ذمے داران و عہدیداران کے علاوہ کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر (انتظامیہ) جناب کمل سنگھ، اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) محترمہ شمع کوثر یزدانی، ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ، جناب شاہنواز خرم، جناب انتخاب احمد، جناب محمد عصیم، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر جناب اجمل سعید، جناب فیروز عالم ریسرچ اسسٹنٹ ڈاکٹر قاسم انصاری اور لیب اسسٹنٹ جناب اطہر و دیگر عہدیداران نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 5 دسمبر 2014

کونسل کے مالی تعاون سے

'محمد مجیب کی خدمات کی بازیافت'

نئی دھلی: علمی، تاریخی، ثقافتی اور اقلیتی مطالعات کے دائرہ کو وسعت دینے والی قومی سطح کی تنظیم 'ایس ویژن' نے 22 نومبر 2014 کو نئی دہلی میں غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے اشتراک اور قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے تعاون سے 'محمد مجیب کی خدمات کی بازیافت' کے عنوان سے یک روزہ سیمینار کا انعقاد کیا، جس میں کثیر

تعداد میں قلمکاروں، نے شرکت کی۔ سیمینار کا آغاز غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سید رضا حیدر کے خیر مقدمی کلمات سے ہوا۔ انھوں نے پروفیسر محمد مجیب کی مجموعی خدمات پر مختصر گفتگو کی۔

ایس ویژن کی صدر اور شعبۂ دلت اور اقلیتی مرکز کی استاذ ڈاکٹر مہر فاطمہ حسین نے پروفیسر محمد مجیب کو سماج اور معاشرے کا رول ماڈل بتایا۔ پروفیسر صادق نے کلیدی خطبہ میں پروفیسر محمد مجیب کا موازنہ جے کرشنا مورتی اور رادھا کرشنن سے کیا اور ان کی جملہ خدمات پر روشنی ڈالی۔ مہمان ذی وقار پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے ڈاکٹر مہر فاطمہ کی باتوں کی تائید میں پروفیسر محمد مجیب کو معاشرتی ہیرو قرار دیا۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ وہ قومیں جو اپنے اکابرین کو بھلا دیتی ہیں، وہ ترقی نہیں کرسکتیں۔ انھوں نے سیمینار میں پڑھے گئے مقالوں کی اشاعت میں کونسل کے تعاون کی خواہش کا اظہار بھی کیا۔ مہمانِ خصوصی پروفیسر اختر الواسع نے پروفیسر محمد مجیب کو جامعہ کی تثلیث کی اہم ترین کڑی بتایا اور تنظیم 'ایس ویژن' کی کوششوں کو سراہتے ہوئے تنظیم کی جانب سے پروفیسر محمد مجیب پر سیمینار کے انعقاد کو جامعہ کے قرض کے پہلی قسط کی ادائیگی سے تعبیر کیا۔ ان کے کارناموں کو یاد کرتے ہوئے پروفیسر محمد مجیب ان لوگوں میں سے ہیں، جامعہ سے جن کی وفاداری ''بہ شرطِ استواری اصل ایماں ہے'' کی زندہ مثال ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے محمد مجیب کی شخصیت کے متعدد پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے تعلیم بالغان کے سلسلے میں محمد مجیب کو صف اول کا رہبر اور کارکن بتایا۔ افتتاحی سیشن کے بعد پروگرام کے پہلے سیشن کی صدارت پروفیسر اسحاق نے کی۔ اس سیشن میں پروفیسر ایس ایم عزیز الدین، ڈاکٹر مہر فاطمہ حسین، ڈاکٹر حسین حیدر اور ڈاکٹر سہیل احمد فارقی نے مقالے پیش کیے۔ مقالہ نگاروں نے بنیادی طور پر قیامِ جامعہ کے محرکات اور پروفیسر محمد مجیب کے علمی و فکری رویوں پر گفتگو کی۔

دوسرے سیشن میں ڈاکٹر واحد نظیر، ڈاکٹر احمد محفوظ، ڈاکٹر پرویز نذیر، ڈاکٹر محمد کاظم اور جناب ذاکر حسین نے مقالے پیش کیے۔ پڑھے گئے مقالوں پر صدور صاحبان پروفیسر رضوان قیصر اور پروفیسر جینا بڑے نے گفتگو کی اور ایس ویژن کو اس نوع کے عصری موضوعات پر سیمینار منعقد کرنے کے لیے قابل مبارک باد قرار دیا۔

سیمینار کے آخری سیشن کی صدارت پروفیسر غضنفر علی نے کی۔ ڈاکٹر حنا آفرین، ڈاکٹر نوشاد عالم، عبدالرحمٰن مصور نے مقالے پڑھے۔

'ایس ویژن' کے اس سیمینار کا مقصد سیکولرزم کے علمبردار پروفیسر محمد مجیب کے فکر و نظریات پر افہام و تفہیم کی راہ ہموار کرنا تھا، تاکہ ملک گیر سطح پر سیکولر نظریے کی اہمیت ہر خاص و عام کی نظر میں اجاگر ہو، اس آئینی نظریے پر براہ راست بحث ہو اور غیر سیکولر افکار و نظریات کی جو مذموم فضا بندی کی جارہی ہے اس کے تدارک کی عملی راہیں ہموار ہوسکیں۔ پروگرام میں ڈاکٹر اخلاق آہن نے اظہار تشکر پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 نومبر 2014

گزارش

ہمارے کالم کتابوں کی دنیا کا مقصد یہ ہے کہ نئی کتابوں پر تبصرے شائع کیے جائیں تاکہ قارئین کتابوں تک رسائی حاصل کریں۔ کتابوں کے مصنّفین، مرتبین اور شعرائے کرام سے درخواست ہے کہ وہ نئی کتابیں ہی بھیجا کریں اور تبصرے کی جلدی اشاعت کے لیے زور نہ ڈالیں۔ ہمارے یہاں درجنوں کتابیں ہر ہفتے موصول ہوتی ہیں۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ ہر کتاب پر تبصرہ شائع نہیں کیا جاسکتا۔ پھر بھی ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ تبصرے ہر ماہ شائع کریں۔ (ادارہ)

'خبرنامہ' اور 'عالمی اردو نامہ' کے تحت ملک کے مختلف اردو اخبارات میں اردو کے تعلق سے شائع ہونے والی خبروں کا ڈائجسٹ ہر ماہ اس لیے پیش کیا جاتا ہے تاکہ پورے ملک میں اردو سرگرمیوں کی مجموعی صورتِ حال سامنے آسکے۔ خبروں میں دیے گئے تمام حقائق اور تبصروں کے لیے متعلقہ اخبارات ذمے دار ہیں۔ (ادارہ)

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

علاقہ میوات کی تہذیب پوری دنیا کے لیے مثال: اسمرتی ایرانی

نوح، میوات: میں سب سے پہلے علاقہ میوات کے ان سینکڑوں شہیدوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتی ہوں جنھوں نے ملک کی خاطر اپنی جان کی قربانی پیش کی تھی۔ علاقہ میوات کی گنگا جمنا تہذیب پوری دنیا کے لیے مثال ہے۔ میوات کا ہر شخص محبّ وطن ہے۔ یہاں کے شہیدوں کی قربانیاں تاریخ میں سنہرے الفاظ میں درج ہیں۔ ان خیالات کا اظہار انسانی وسائل ترقی مرکزی وزیر اسمرتی ایرانی نے کیا۔ وہ آج ضلع ہیڈ آفس نوح واقع میوات ماڈل اسکول میں نیشنل اطفال صفائی ابھیان کے اختتامی پروگرام میں بطور مہمان خصوصی خطاب کر رہی تھیں۔ غور طلب ہے کہ گزشتہ 14 نومبر جواہر لعل نہرو کی یوم پیدائش پر شروع ہوئے اس نیشنل لیول کے پروگرام کا اختتامی پروگرام ضلع ہیڈ کوارٹر نوح کے میوات ماڈل اسکول میں اختتام پذیر ہوا۔ مرکزی وزیر اسمرتی ایرانی نے کہا کہ میوات میں تعلیم کے فروغ کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ میوات میں چلائے جارہے کستوربا گاندھی بالیکا ودھیالہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ میوات میں ان اسکولوں کو بلاک سطح کے ساتھ ساتھ اب قصبہ لیول پر کھولا جائے گا۔ قبل ازیں آج پروگرام کا آغاز اڈبرا اسکول کی طلبہ کے ذریعے مہمان خصوصی کے استقبال میں پڑھی گئی لب پہ آتی ہے دعا سے ہوا۔ مہمان ذی وقار کے طور پر تشریف لائے ہریانہ کے وزیر تعلیم رام ولاس شرما نے کہا کہ میوات کے جن اسکولوں میں ٹیچرس نہیں ہیں ایسے سبھی اسکولوں میں بہت جلد اساتذہ کی بھرتی کی جائے گی۔ اس موقعے پر میوات کے دانشوران قوم وسماجی کارکنان نے میوات میں اردو ٹیچرس کی بھرتی ونلہڑ واقع شہید حسن خان میواتی

میڈیکل کالج میں میواتی بچوں کو نوکریوں و داخلوں میں ریزرویشن دینے کے مطالبہ کو پورا کرنے کا بھی مرکزی وزیر نے میواتی لوگوں کو یقین دہانی کرائی۔ پروگرام کے آخر میں ہریانہ سیکنڈری ایجوکیشن کے ڈائریکٹر وویک آترے نے آئے ہوئے سبھی مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 20 نومبر 2014

ہندی اردو کا آپسی رشتہ

علی گڑھ: ہندی اور اردو کو کسی بھی حالت میں الگ کر کے ملک ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہوسکتا کیونکہ ہندی اور اردو اس ملک کی سب سے اہم زبانیں ہیں اور ان زبانوں میں سے کوئی بھی زبان ایک دوسرے سے چھوٹی یا بڑی نہیں ہے۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز تخلیق کار و نقاد اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں سینئر استاد پروفیسر عبدل بسم اللہ نے کیا۔ وہ جامعہ اردو علی گڑھ کے زیر اہتمام 'ہندی اردو کا آپسی رشتہ: کتنے دور کتنے پاس' موضوع پر منعقدہ قومی سیمینار سے بحیثیت مہمانِ خصوصی سے خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہندی اور اردو میں فارسی اور عربی کے بیشتر الفاظ مستعمل ہیں جن کو الگ کر کے ہم ان زبانوں کو کسی حال میں مکمل نہیں کر سکتے۔ انھوں نے حوالہ کے طور پر کہا کہ کرسی، صراحی، صابن، نظر الفاظ کا استعمال ان دونوں زبانوں میں کیا جاتا ہے جبکہ یہ الفاظ نہ تو اردو کے ہیں اور نہ ہندی کے۔ سیمینار کے صدر پروفیسر رضاء اللہ خاں نے کہا کہ اردو اور ہندی دونوں زبانیں ہندوستان میں پیدا ہوئی ہیں اور دونوں ہی ہندوستان کی عوامی زبانیں ہیں۔ پروفیسر ہمایوں مراد نے کہا کہ ہندی اور اردو آپس میں کافی قریب ہیں۔ نظامت مصائد قدوائی نے کی اور جامعہ اردو کے ڈائرکٹر جسیم محمد نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 20 نومبر 2014

نیٹ پر اردو اصطلاحات دستیاب

نئی دھلی: اردو والوں کو اب اردو اصطلاحات کے لیے در در کی ٹھوکریں نہیں کھانی پڑیں گی۔ ایک سابق بیورو کریٹ ایم آر حق نے جو ڈاکٹر قیصر شمیم کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں۔ اردو اصطلاحات کو پہلی بار نیٹ پر ایک 'کلک' کے ذریعے فراہم کرانے کا جوکھم بھرا کام ہاتھ میں لیا ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ اب تک نیٹ پر اردو اصطلاحات کے لیے بھارت اور پاکستان تک میں کوئی مستقل کام نہیں ہوا ہے۔ ان کی ویب سائٹ کا نام ہے 'www.istelahat.com' جس کا مقصد ہے کہ مختلف مضامین سے تعلق رکھنے والی انگریزی اصطلاحات کو اردو والے اردو میں بھی ایک کلک کے ساتھ فی الفور نیٹ پر دیکھ سکیں۔

واضح رہے کہ مسٹر قیصر شمیم نے 70 کی دہائی میں اردو اصطلاحات کو یکجا اور وضع کرنے کے لیے بنائے گئے ادارہ 'ترقی اردو بورڈ' (جو فی الحال این سی پی یو ایل کی شکل میں ہے) میں ایک طویل مدت تک کام کیا۔ شہباز حسین کی رہنمائی میں دہلی، پٹنہ اور حیدرآباد سے تقریباً پونے دو لاکھ اصلاحات جمع کرانے میں انھوں نے مجموعی 21 کمیٹیوں کے ساتھ کام کیا۔ بعدازاں وہ این سی ای آر ٹی میں رہے اور وہاں اردو کی درسی کتابوں کے لیے اصلاحات جمع کرنے کا کام کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی 15 نومبر 2014

'شاہ ولی اللہ کے افکار کی عصری معنویت' پر منعقدہ سمینار کا منظر

شاہ ولی اللہ کے افکار کی عصری معنویت

نئی دھلی: شاہ ولی اللہ دہلویؒ برصغیر کے ممتاز محقق اور مایہ ناز عالم دین تھے۔ ان کے علمی وفکری کاموں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ شاہ ولی اللہ کے افکار و خیالات اور ان کی کتابوں کو اردو کے علاوہ انگریزی اور دیگر بین الاقوامی زبانوں میں شائع کیا جائے۔ ان خیالات کا اظہار دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر نجیب جنگ نے شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے زیراہتمام جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایف ٹی کے آڈیٹوریم میں 'شاہ ولی اللہ کے افکار کی عصری معنویت' کے عنوان سے منعقدہ سیمینار میں کیا۔ پروگرام کے مہمان ذی وقار ضمیرالدین شاہ وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے کہا کہ شاہ ولی اللہ اور سرسید کی تحریک میں بڑی مماثلت تھی۔ اس موقعے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے تمام مہمانوں اور علماء و دانشوروں کا استقبال کرتے ہوئے سیمنار میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے علوم وافکار پر پیش کیے جانے والے مقالات کو شائع کرانے کی تجویز پیش کی۔ راجیہ سبھا کے ممبر محمد ادیب علیگ نے بھی اظہار خیال کیا۔ جنوبی افریقہ کی ڈربن یونیورسٹی کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے سابق صدر مولانا سلمان ندوی، عالم دین وفقیہ مولانا بدرالحسن قاسمی، مولانا محمد سالم قاسمی، مہتمم دارالعلوم دیوبند وقف، مولانا اصغرامام مہدی سلفی، پروفیسر ذاکرالرحمٰن اور مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی چیئرمین شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ اور اجلاس کے کنوینر نے شاہ ولی اللہ کے کارناموں پر روشنی ڈالی۔

جلاس کی نظامت ڈاکٹر اخلاق آہن نے کی۔ شاہ اختتامی اجلاس مولانا ڈاکٹر بدرالحسن قاسمی کویت کی صدارت میں منعقد ہو۔ اجلاس میں سب سے پہلے مقالہ ڈاکٹر نعیم الحسن اثری استاد شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی نے پیش کیا۔ سابق وزیراعلیٰ شیلا دکشت نے کہا کہ ہم نے سے سنا تھا کہ اگر تہذیب سیکھنی ہے اور اخلاقیات کا درس لینا ہے تو ہمیں اردو زبان کو سیکھنے اور بولنے کی ضرورت ہے چونکہ اردو ایک شیریں زبان ہے۔ ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں نے صدارتی خطبہ میں کہا کہ اچھی کتابوں کا مطالعہ اپنی وراثت کی بازیافت، زندہ قوموں کی علامت ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22، 23، 24 نومبر 2014

مہاراشٹر میں اردو کی ترقی کے لیے

اقدامات کی ہدایت

ممبئی: مہاراشٹر کی نئی حکومت وجود میں آنے کے بعد اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے تعلق سے کئی اہم فیصلے کیے ہیں۔ حکومت کے اقلیتی ترقیاتی محکمہ نے مہاراشٹر کے ہر ضلع میں اقلیتی طلبہ کے لیے پالی ٹیکنک کالج اور ہر تحصیل میں اردو میڈیم کے دسویں سے بارہویں تک اسکول کھولنے کا فیصلہ کیا ہے نیز اونے پونے داموں وقف کی زمینوں کو لیز پر دینے کا سختی سے نوٹس لیتے ہوئے اب یہ طے کیا ہے کہ وقف املاک کو نیلامی کے ذریعہ لیز پر دیا جائے گا تاکہ خاطرخواہ رقم حاصل کی جاسکے۔ جمعہ کو اقلیتی امور اور اوقات کے وزیر ایکناتھ کھڑسے نے اقلیتی محکمہ کے افسران کے ساتھ ایک میٹنگ کی جس میں انھوں نے کئی اہم احکامات جاری کیے۔ اطلاعات کے مطابق مہاراشٹر میں وقف بورڈ کی ایک لاکھ ایکڑ زمین ہے۔ میٹنگ میں کھڑسے نے یہ بھی ہدایت دی کہ اردو زبان کے فروغ کے لیے جو بھی ضروری قدم اٹھائے جاسکتے ہیں انھیں پہلی فرصت میں اٹھایا جائے۔ انھوں نے افسران کو متنبہ کیا کہ اس میں تاخیر برداشت نہیں کی جائے گی۔ اقلیتی امور اور اوقات کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد ایکناتھ کھڑسے نے پہلی مرتبہ اقلیتی ترقیاتی محکمہ کا جائزہ لیا۔ انھوں نے بتایا کہ اسکولوں اور کالجوں میں اردو متبادل زبان کے طور پر تسلیم کی جائے گی اور اس کے لیے اقدامات شروع کردیے گئے ہیں۔ انھوں نے کہ کہ ضلعی سطح کے کالجوں میں مسلم طلبہ اور طالبات کے لیے ہاسٹل بھی کھولے جائیں گے۔ اردو کو فروغ دینے کے لیے ہندی اور مراٹھی میں اردو ادب کا ترجمہ کرواکر ہر طبقے کے لیے دستیاب کرایا جائے گا۔ اقلیتی امور کے وزیر کے مطابق کڑیا، پلمبر اور میکانک جیسے دیگر کام کرنے والوں کی بڑی تعداد مسلم نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ انھیں منظم روزگار کے شعبے میں لانے کے لیے اقدامات کیے جائیں گے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 نومبر 2014

علامہ شبلی اور مولانا آزاد کی ملاقات پر نئی بحث

بریلی: مرزا غالب کے ادب پر اہم کام کرنے والے مصنف شمس بدایونی کا قلم اس بار علامہ شبلی نعمانی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی ملاقات کے متنازع مسئلے پر اٹھا ہے۔ انھوں نے ہند و پاک مصنفین کے دونوں پرانے دعووں کو مسترد کردیتے ہوئے نئی تحقیق پیش کی ہے اور بتایا ہے کہ ملاقات 1904 میں ہوئی تھی، جس سے ادبی حلقوں میں نئی بحث چھڑتی نظر آرہی ہے۔ ادبا کے درمیان اس تنازع کو تقریباً 95 برس ہونے جارہے ہیں۔ مسئلہ طے نہیں ہوپارہا ہے۔ شبلی نعمانی اور مولانا آزاد کی پہلی ملاقات کب ہوئی اور دونوں ایک دوسرے سے کس طرح متاثر ہوئے۔ پاکستانی مصنف ابوسلمان شاہجہاں پوری کا دعویٰ یہ تھا کہ ملاقات 1899 میں ہوئی۔ کولکاتا میں محمڈن اینگلو ایجوکیشن کانفرنس کے دوران دونوں پہلی بار ایک دوسرے کے رابطے میں آئے۔ اسی طرح سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں ممبئی میں ملاقات 1905 میں ہونا بتائی ہے۔ دونوں دعوے مضبوط مانے جاتے ہیں۔ دراصل ملاقات کے پیچھے بحث کی وجہ یہ ہے کہ کچھ ادیبوں کا کہنا ہے۔ مولانا آزاد کی کامیابی کے پیچھے علامہ شبلی نعمانی ہیں۔ شمس بدایونی نے اس سے الگ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مولانا آزاد میں خداداد صلاحیت تھی۔ کم عمری میں الہلال میگزین نکالی۔ اس وقت علامہ شبلی نعمانی مقبولیت کے فلک پر براجمان تھے۔ مولانا نے ان سے ممبئی کے ایک ہوٹل میں ملاقات کی جو 1904 میں ہوئی۔ مہینہ اکتوبر، نومبر، دسمبر میں سے کوئی ایک رہا۔ شمس بدایونی نے اپنے اس دعوے کو عبدالرزاق ملیح آبادی کی لکھی سوانح اور دوسری تمام کتابوں کے حوالے سے ثابت کیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 نومبر 2014

کل ہند انجمن ترقی پسند مصنّفین کی جانب سے منعقدہ 'کرشن چندر صدی تقریب' کا منظر

کرشن چندر صدی تقریب

علی گڑھ: کل ہند انجمن ترقی پسند مصنّفین کی جانب سے بیادکرشن چندر دوروزہ تقریبات علی گڑھ میں منعقد کی گئی جس میں 8 نومبر 2014 کو کرشن چندر کا صد سالہ جشن منایا گیا اور 9 نومبر کو مجلس انتظامیہ کی میٹنگ ہوئی۔ اسی شام بیادکرشن چندر محفل افسانہ کا اہتمام ہوا۔ پہلا اجلاس افتتاحی اجلاس تھا جس کی صدارت گیا (بہار) سے تشریف لائے بزرگ ترقی پسند ادیب و ناقد پروفیسر افصح ظفر نے کی۔ استقبالیہ کلمات پروفیسر تصدق حسین نے اور افتتاحی خطبہ معروف ترقی پسند افسانہ نگار قاضی عبدالستار نے پیش کیا۔ پروفیسر تصدق حسین (علی گڑھ) نے اپنے استقبالیہ کلمات میں باہر سے تشریف لانے والے سبھی مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس طرح کی کوشش جاری رہنا چاہیے تاکہ ہم اس موقع پر اپنے بزرگوں کو یاد کرسکیں اور ان کے کام سے نئی نسل کو واقف کرانے کے ساتھ ساتھ ہم ان کی تربیت کرسکیں۔ اس کے بعد افتتاحی خطبہ قاضی عبدالستار نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ کرشن چندر اپنے زمانے کے سب سے مشہور افسانہ نگار ہے اور رومان نگار تھے۔ ان کی بعض کہانیاں ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ان کے فکر و فن کا جس طرح تجزیہ ہونا چاہیے وہ نہیں ہوا۔ ترقی پسند افسانہ نگار اقبال مجید کا ارسال کردہ کلیدی خطبہ پروفیسر علی احمد فاطمی (الٰہ آباد) نے پیش کیا۔ آخر میں پروفیسر افصح ظفر نے اپنا صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ کرشن چندر کشمیر کی وادیوں سے زندگی تلاش کرتے ہیں۔ وہ جب کہانی کا پلاٹ تیار کرتے ہیں تو اس میں ایسے جملے پیش کرتے ہیں جس میں شاعری کی خوشبو ہوتی ہے۔ دوسرے اجلاس کی مجلس صدارت میں ڈاکٹر شکیل صدیقی (لکھنؤ) اور ڈاکٹر اشفاق حسین (الٰہ آباد) تھے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر فخرالکریم، ڈاکٹر خدیجہ آئین، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شعبۂ انگریزی کی استاد پروفیسر سمیہ رفیق نے کرشن چندر کے افسانہ 'مردہ سمندر' کا انگریزی ترجمہ The Dead Ocean کے نام سے پیش کیا۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر سیما صغیر (علی گڑھ) نے انجام دی۔ تیسرے اجلاس کی صدارت میں افسانہ نگار شوکت حیات (پٹنہ)، مسعود منظر (گیا) اور ڈاکٹر عاصم شاہنواز شبلی (کلکتہ) تھے۔ اس اجلاس میں پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر علی احمد فاطمی، زویا زیدی، نفیس عبدالحکیم، حمیرا آفریدی، حامد رضا صدیقی نے مقالے پیش کیے۔ نظامت ڈاکٹر خان فاروق نے کی۔ 9 نومبر کو محفل افسانہ اور شاعری ہوئی جس کی صدارت پروفیسر قاضی عبدالستار نے کی۔

پریس ریلیز، نفیس عبدالحکیم، الہ آباد یونیورسٹی الہ آباد، 11 نومبر 2014

امریکی سفارت خانے کی اردو ویب سائٹ کا آغاز

نئی دھلی: نئی دہلی میں واقع امریکی سفارت خانے نے اردو داں طبقے کو سہولت فراہم کرنے کے لیے اردو زبان میں ویب سائٹ شروع کی ہے جس کا افتتاح امریکہ کی ناظم الامور سفارت کار کیتھلن اسٹیفن کے ہاتھوں عمل میں آیا جب کہ اس موقعے پر قومی کمیشن برائے اقلیتی لسانیات کے کمشنر پروفیسر اختر الواسع اور معروف محبّ اردو کامنا پرساد نے اس ویب سائٹ کی اہمیت و افادیت اور اس کی ضرورت پر گفتگو کرتے ہوئے اردو زبان کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ علاوہ ازیں امریکی سفارت خانے کی جانب سے جاری کی گئی اردو کی ویب سائٹ پر اب امریکہ سے متعلق تمام معلومات حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس ویب سائٹ پر امریکہ کا ویزا حاصل کرنے سے لے کر تجارتی، تعلیمی اور سیاسی سرگرمیوں سے متعلق تمام معلومات حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس ویب سائٹ کو تیار کرنے میں امریکی سفارت خانہ کے اردو ایڈیٹر ظفر حسن، شاہ محمد تحسین عثمانی اور چیتنا کھیرا نے اہم رول ادا کیا۔ علاوہ ازیں اس ویب سائٹ پر امریکہ سے متعلق خبریں بھی حاصل کی جاسکتی ہیں اور ان خبروں کو شائع کرنے کے لیے ازسرنو خبروں کی کمپوزنگ ضروری نہیں ہوگی بلکہ ویب سائٹ سے ڈائریکٹ لی جاسکتی ہیں۔ ویب سائٹ کی لانچنگ کے موقعے پر منعقدہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ناظم لامور سفارت کار کیتھلن اسٹیفن نے کہا کہ یقیناً ہم اردو نہیں جانتے لیکن اس ویب سائٹ کے جاری ہونے سے ہمیں کافی خوشی ہے اور آج کا دن ہمارے لیے بہت اہم ہے کیونکہ اس کے ذریعہ ہم اپنی بات اردو داں طبقہ تک بھی پہنچاسکیں گے۔ آخر میں انھوں نے اردو زبان میں کہا ''ہم ساتھ ساتھ چلیں گے۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ اس ویب سائٹ کے ذریعہ اب اردو داں طبقے کے ساتھ امریکہ کا مکالمہ قائم ہوسکے گا۔ کامنا پرساد نے کہا کہ اردو مشترکہ تہذیب کی علامت ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج دنیا کی 100 سے زائد یونیورسٹیوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے اور امریکی یونیورسٹی میں بھی اردو کی تعلیم دی جارہی ہے۔ کامنا پرساد نے کہا کہ اس میں نہ صرف ہندوستان کی بلکہ دوسرے ملکوں کی کئی زبانیں شامل ہیں اور اس کی تعمیر میں بادشاہوں اور صوفیائے کرام کا اہم کردار رہا ہے۔ تقریب میں اردو اسپین کے ایڈیٹر سید سلیمان اختر سمیت اردو کے ایڈیٹر اور صحافیوں کے علاوہ کئی معروف شخصیات نے بھی شرکت کی۔ اس موقعے پر اسپین کی اردو ویب سائٹ کی نمائش بھی کی گئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 نومبر 2014

شاہ ولی اللہ لائبریری میں نایاب کتابوں کا خزانہ

نئی دھلی: پرانی دلی کی ایک تنگ گلی میں ایک ایسی لائبریری ہے جہاں صدیوں پرانی کتابیں موجود ہیں۔ ان کتابوں میں 150 سال سے زیادہ پرانا آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا دیوان اور 90 سال پہلے کی سنسکرت

اور اردو میں لکھی گئی شریمد بھگوت گیتا شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اردو، فارسی، عربی اور ہندی زبان میں لکھی برسوں پرانی کتابیں بھی ہیں۔ جامع مسجد سے کچھ ہی

مراحل پر واقع چوڑی والان میں پہاڑی املی نام کی پتلی سی گلی ہے اور اس گلی میں واقع ہے شاہ ولی اللہ کے نام پر ایک لائبریری۔ اس کا قیام 1890 میں پرانی دہلی کے کچھ نوجوانوں نے کیا تھا۔ چھوٹے سے کمرے میں چلنے والی اس لائبریری میں تقریباً 15000 کتابیں ہیں جن میں سے 75 فیصد نایاب کتابیں ہیں۔ لائبریری کے بانی اور پیشے سے سکندر چنگیزی نے بتایا کہ اس لائبریری کا انتظام 'دہلی یوتھ ویلفیئر ایسوسی ایشن' کرتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ لائبریری میں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا دیوان ہے۔ اس کی اشاعت 1855 میں لال قلعہ کے اندر بنی رائل پریس میں ہوئی تھی۔ اس دیوان کے آخری چند صفحات پر پنجابی میں لکھی کچھ نظمیں بھی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہاں رکھی ایک اور اہم کتاب شریمد بھگوت گیتا ہے جو سنسکرت کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں لکھی گئی ہے اور یہ 90 سال پرانی ہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ ان کے پاس برسوں پرانی یہ کتابیں کیسے آئیں؟ تو چنگیزی نے بتایا کہ میرا تعلق مغل خاندان سے ہے اور میرے پاس جتنی کتابوں کا مجموعہ ہے وہ سب میرے بزرگوں کا ہے۔ جب شاہ ولی اللہ لائبریری وجود میں آئی تو میں نے 2000 کتابیں اسے ہدیہ کردیں۔ انھوں نے بتایا کہ جب ہندوستان بھر کے دوسرے لوگوں کو معلوم ہوا کہ دہلی میں اس طرح کی کوئی لائبریری ہے تو انھوں نے بھی یہاں کتابیں عطیہ میں دیں۔ اب اس لائبریری میں 15000 کتابیں ہیں جن میں سے 75 فیصد نایاب ہیں۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 10 نومبر 2014

جوش ملیح آبادی کی کرسی آج بھی خالی

نئی دهلی: ماہنامہ 'آج کل' کے سابق ایڈیٹر اور شاعر انقلاب شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی کی وہ کرسی آج بھی احتراماً خالی رکھی جاتی ہے جس پر 1950 کی دہائی میں

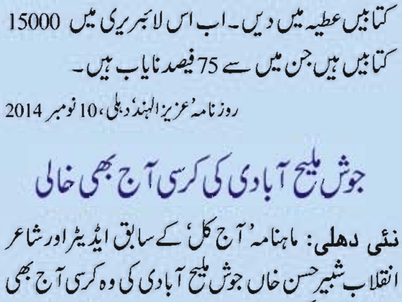

ماہنامہ 'آجکل' کی ذمے داری سنبھالنے کے بعد جوش ملیح آبادی اس ماہنامے کے سرکاری دفتر میں بیٹھتے تھے اس کرسی پر ان کے بعد سے آج تک کوئی ایڈیٹر نہیں بیٹھا اور یہ عمل کسی منفی فکر کے تحت نہیں بلکہ اس فکر کے ساتھ انجام دیا گیا کہ جس کرسی پر شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی جیسی ہستی بیٹھتی ہو اس پر کوئی دوسرا کیسے بیٹھ سکتا ہے۔ ماہنامہ آجکل کے موجودہ مدیر حسن ضیا کے مطابق اولڈ سکریٹریٹ (موجودہ وقت میں دہلی اسمبلی) سے لے کر موجودہ سوچنا بھون تک جہاں جہاں یہ دفتر گیا وہاں وہاں اس کرسی کو بھی بہت ہی احترام کے ساتھ لے جایا گیا اور جو بھی کمرہ ایڈیٹر کے لیے منتخب کیا جاتا یہ کرسی بھی ایڈیٹر کی کرسی کے برابر میں رکھی جاتی رہی اور ہر آنے والے نے کرسی کا ایسے ہی احترام کیا۔ حسن ضیا نے کہا کہ یہ کرسی ماہنامہ آج کل کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ ماہنامہ آجکل کی قدیم کاپیاں بھی اپنے آپ میں ایک نادر نسخے ہیں جن کو ہم سنبھالے ہوئے ہیں اور رسالے سے منسلک شخص ان کی قدر کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہماری کوشش ہے کہ جلد ہی ان سبھی نسخوں کا اسکیننگ کراکے انھیں محفوظ کردیا جائے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 27 نومبر 2014

جاں نثار اختر فکر و فن

ممبئی: جاں نثار اختر کو روایت اور بغاوت کے امتزاج نے بڑا شاعر بنایا۔ ان کی شاعری طاقتور امیجری اور منفرد

تشبیہات کی شاعری ہے۔ ان کی شاعرانہ آواز بہت واضح اور سہل ہے۔ ان خیالات کا اظہار مشہور نغمہ نگار اور اسکرپٹ رائٹر جاوید اختر نے ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام احمد زکریا ہال، انجمن اسلام، ممبئی کے کانفرنس ہال میں منعقدہ یک روزہ سمپوزیم 'جاں نثار اختر: فکر و فن' کے موقعے پر اپنے افتتاحی تقریر میں کیا۔ انھوں نے اپنے والد جاں نثار اختر کی شخصیت اور کلام پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری میں تضاد ہے۔ جاں نثار اختر کی زندگی بھی کچھ اسی طرح کی تھی اور یہ کوئی عیب نہیں۔ اس موقعے پر مشہور فلم اداکارہ شبانہ اعظمی بھی موجود تھیں۔ کلیدی خطبہ معروف نقاد، شاعر اور کالم نگار شمیم طارق نے دیا اور کہا کہ موضوعات کے تنوع، فکر کے توازن اور لہجے کی معصومیت کے سبب جاں نثار اختر کی شاعری انفرادیت کی حامل ہے۔ مہمانِ خصوصیت اور انجمن اسلام کے صدر ڈاکٹر ظہیر قاضی نے اپنی تقریر میں جاں نثار کی اہلیہ صفیہ اختر کے خطوط کی بے حد تعریف کی اور خطوط نگاری میں ان خطوط کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ سمپوزیم کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے اردو مشاورتی بورڈ ساہتیہ اکادمی کے کنوینر چندر بھان خیال نے کہا کہ جاں نثار اختر کو ہم نے فراموش کردیا ہے جبکہ ان کا شمار اردو کے ممتاز ترقی پسند شاعروں میں ہوتا ہے۔ سمپوزیم کے پہلے اجلاس کی صدارت جاوید اختر نے کی۔ ساہتیہ اکادمی کے پروگرام آفیسر ڈاکٹر مشتاق صدف نے خیر مقدمی کلمات ادا کیے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 25 نومبر 2014

شہید ٹیپو سلطان کا یومِ پیدائش

لکھنؤ: ریاستی حکومت میں درجہ حاصل وزیر مملکت اور آلودگی کنٹرول بورڈ کے چیئرمین جاوید عابدی نے کہا ہے کہ شہید ٹیپو سلطان ایک ایسی شخصیت اور کردار ہے جس نے ہندوستان میں ہر شخص کو سینے سے لگانے کا کام کیا ہے۔ ٹیپو سلطان صرف مسلمانوں کے ہی سلطان نہیں تھے بلکہ وہ ہندوستان کے سلطان تھے۔ ان کی قومی یکجہتی، ہمت اور جذبہ سے سیکھ لینے کی ضرورت ہے۔ سیمینار کی صدارت کرتے ہوئے سابق وائس چانسلر آئی اے ایس انیس انصاری نے کہا کہ جس وقت حکومت ٹیپو سلطان کے ہاتھ آئی، اس نے دو اہم کام کیے۔ ایک جانب اپنی پوری توجہ اتحاد بین المسلمین اور اتحاد بین الاقوام ہند پر مرکوز کی۔ دوسری جانب ملک کی صنعت و حرفت پر پوری توجہ دی۔ مگر باوجود اس کے سلطنت خداداد میسور نے صنعت و حرفت اور دیگر فنون میں جو ترقی کی وہ میسور کو کبھی دوبارہ حاصل نہ ہوسکی۔ تقریب میں مہمان اعزازی ایس سی ایچ ٹی وزیر لالہ رائے راج بھر اور ایڈووکیٹ طارق صدیقی رہے۔ پروگرام کے کنوینر عبدالنصیر ناصر اور ناظم عبدالعلیم رشید تھے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 22 نومبر 2014

عبدالرحمٰن جامی کا 600 سالہ جشن

نئی دهلی: عالم اسلام کی عظیم ادبی اور عرفانی شخصیت عبدالرحمٰن جامی کی یاد میں ایک روزہ سیمینار 27 نومبر 2014 بروز جمعرات دہلی کے مشہور ثقافتی مرکز انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں منعقد ہوا۔ افتتاحی اجلاس میں تاجکستان

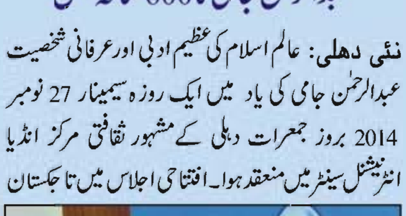

کے سفیر میرزا شریف جلالوف، آئی سی سی آر کے صدر پروفیسر لوکیش چندر، انسٹی ٹیوٹ آف انڈو پرشین اسٹڈیز کے صدر ڈاکٹر سید اختر حسین، ماہر اسلامیات پروفیسر

اختر الواسع اور انسٹی ٹیوٹ کے نائب صدر ڈاکٹر علیم اشرف خاں نے عبدالرحمٰن جامی کے احوال وافکار پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تاجکستان کے سفیر میرزا شریف جلالوف نے مہمانوں اور سامعین کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ جامی تہذیبوں کے درمیان تصادم کے نہیں تھے بلکہ توافق اور تفاہم کے علمبردار تھے۔ پروفیسر اختر الواسع نے سامعین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ عبدالرحمٰن جامی کا ہندوستان کے ساتھ ناگزیر تعلق ہے۔ انھوں نے طوطی ہند امیر خسرو سے والہانہ عقیدت کا اظہار کیا ہے اور امیر خسرو کے ذریعے فارسی ادب کا چرچا دور دور تک پہنچا ہے۔

روزنامہ 'جدید خبر'، دہلی، 29 نومبر 2014

دہلی میں یادگار ظفر کا اہتمام

نئی دھلی: ہندوستان کے آخری تاجدار اور انقلاب 1857 کے سپہ سالار بہادر شاہ ظفر کے 150 ویں یوم شہادت کے موقعے پر سماجی تنظیموں نے 'یادگار ظفر: آزادی بچاؤ مارچ' کے عنوان سے دہلی کے خونی دروازے پر ان کی

یادوں کو تازہ کیا، بہادر شاہ ظفر کی غزلیں گائیں، ان کے لیے ایصال ثواب کیا گیا اور ان کی یاد میں چراغاں کیا گیا۔ اس موقعے پر بہادر شاہ ظفر کی غزلوں نے تمام لوگوں پر رقت طاری کردیا۔ واضح رہے کہ انگریزوں نے لال قلعہ پر تسلط کے بعد خونی دروازے پر مغل شاہزادوں کو پھانسی پر لٹکا دیا تھا۔ اس موقعے پر خدائی خدمت گار نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ کسی مرکزی یونیورسٹی کا نام بہادر شاہ ظفر سے موسوم کیا جائے، ان کی یوم پیدائش حکومتی سطح پر منایا جائے اور بہادر شاہ ظفر کا مجسمہ پارلیمنٹ کے اندر لگایا جائے۔ اس موقعے پر خدائی خدمت گار کے سرپرست فیصل خان نے اپنی تقریر میں کہا کہ انگریزوں کے خلاف ملک کی قیادت کرنے والے بہادر شاہ ظفر نے ملک کی حفاظت کے لیے اپنا سب کچھ قربان کردیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 نومبر 2014

دھلی:

ترقی پسند تحریک کے بانی ممبرِ عارف نقوی کو استقبالیہ

نئی دھلی: غالب اکادمی دہلی کے زیراہتمام ترقی پسند

ترقی پسند تحریک کے بانی عارف نقوی کے اعزاز میں ادبی نشست کا منظر

تحریک کے بانی ممبر بزرگ افسانہ نگار، شاعر، ناول نگار، صحافی عارف نقوی کی کتاب 'نصف صدی' کے تعلق سے گفتگو پر ایک ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ نشست کی صدارت انجم عثمانی نے کی جبکہ نظامت ڈاکٹر عقیل احمد نے کی۔ تقریب کا آغاز متین امروہوی کے شعری کلام سے ہوا۔ ذاکر حسین دہلی کالج کے سینئر استاد ڈاکٹر خالد علوی نے اس موقعے پر کہا کہ عارف نقوی مشہور افسانہ نگار، شاعر، ڈرامہ نگار ہیں۔ انھوں نے کہا کہ عارف نقوی کی کتاب میں جرمنی کی نصف صدی کے تعلق سے وہاں کے حالات ومسائل اور ان کی ادبی، سیاسی اور ترقی پسند تحریک کے بارے میں اس کتاب میں بہت سی معلومات موجود ہیں، جو عام لوگوں کے سامنے اب تک نہیں آئی ہوں گی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 16 نومبر 2014

اردو بولنے کے لہجے نے دلائی 'بے بی' فلم: تاپسی

نئی دھلی: بالی ووڈ کی نئی اداکارہ تاپسی پنوں کو اردو بولنے کے لہجے کی وجہ سے فلم 'بے بی' میں کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ تاپسی پنوں نے 2013 میں فلم 'چشم بددور' سے بالی ووڈ میں اپنے کریئر کی شروعات کی تھی۔ وہ ان دنوں اکشے کمار کے بالمقابل فلم 'بے بی' میں کام کررہی ہیں۔ مذکورہ فلم کے ڈائریکٹر نیرج پانڈے کو 'بے بی' کے لیے ایک ایسی اداکارہ کی تلاش تھی جو اردو بولنے میں ماہر ہو۔ ان کی تلاش تاپسی کے روپ میں پوری ہوگئی۔ تاپسی نے بتایا کہ نیرج نے انھیں چند سطریں پڑھنے کے لیے کہا تھا جن میں کچھ اردو الفاظ اور جملے تھے۔ 'بے بی' اگلے سال 23 جنوری کو ریلیز ہوگی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5 دسمبر 2014

اتر پر دیش:

اردو رائٹرس فورم کی جانب سے سیمینار کا انعقاد

لکھنؤ: واقعہ کربلا پر ہزاروں مرثیے لکھے گئے ہیں لیکن کربلا ہر عہد میں عام اردو شاعری کا حوالہ رہی ہے۔ جدید شاعری کے معتبر اور مقبول شاعر عرفان صدیقی کے کلام میں بھی کربلا ایک پراثر استعارے کی شکل میں ہر جگہ موجود ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر شارب ردولوی نے کیا۔ وہ امن واتحاد کی علمبردار تنظیم 'اردو رائٹرس فورم' کے زیراہتمام چھوٹا امام باڑا حسین آباد کے سبزہ زار پر 'کربلا عرفان صدیقی کی شاعری میں' موضوع پر ہونے والے ایک اہم مذاکرہ میں خطاب کررہے تھے۔ مذاکرہ کی صدارت مولانا حسن عباس فطرت نے اور نظامت مرزا شفیق حسین نے کی۔ مرزا محمد مہدی نے اپنے مختصر مقالہ میں کہا کہ عرفان صدیقی کربلا حاصل کرنے والے شعراء میں ایک اہم نام ہے۔ سیمینار کے کنوینر سید وقار رضوی نے اور ڈاکٹر انیس انصاری نے عرفان صدیقی کی شاعری کا محاکمہ کرتے ہوئے کہا کہ عرفان صدیقی کی مخصوص لفظیات اور تراکیب پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 11 نومبر 2014

رضا لائبریری میں تیسرا اردو کتاب میلہ

رام پور: رضا لائبریری میں تیسرے اردو کتاب میلے کا افتتاح کرتے ہوئے دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ زبانیں حکومتوں کے بل پر زندہ

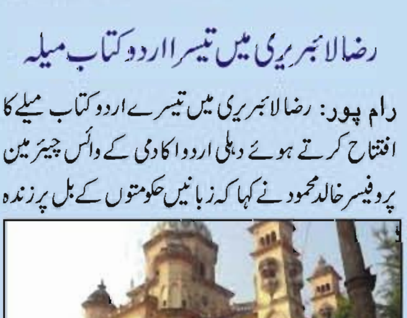

نہیں رہتیں، ہمیں اپنی زبان کو خود ہی زندہ رکھنا ہوگا۔ پرائمری اور جونیئر ہائی اسکولوں میں لازمی طور پر اپنے بچوں کو اردو میں تعلیم دلانا ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ دہلی میں اردو کی حالت غنیمت ہے لیکن اتر پردیش میں اردو کا برا حال ہے۔ جامعہ ملیہ شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر شہزاد انجم

نے کہا کہ کتابیں عظمت بڑھاتی ہیں۔ اردو ہمیں تہذیب و تمدن سکھاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ رامپور اردو ادب کا تیسرا اسکول کہلاتا ہے لیکن اب میں جب رام پور آتا ہوں اور ہندی میں لگے ہورڈنگ اور دکانوں کے نام دیکھتا ہوں تو بہت افسوس ہوتا ہے، کیونکہ رام پور میں جب اردو کو اس کا مقام نہیں ملے گا تو پھر کہاں ملے گا۔ ڈائریکٹر رضا لائبریری پروفیسر سید محمد عزیزالدین حسین نے کہا کہ کتابیں دل و دماغ کو روشن کرتی ہیں اور تاریکی کو مٹاتی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ رضا لائبریری کے خزانہ میں 17 ہزار مخطوطات و نوادرات ہیں۔ رضا لائبریری کے لائبریرین ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی نے اسی موقعے پر اپنے خیالات پیش کیے۔ پروگرام کی نظامت فیصل خاں نے اور شکریہ محمد ظفر خاں نے ادا کیا۔ سید نوید قیصر نے نعت سنائی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 نومبر 2014

مئو میں اردو مذاکرہ

گھوسی، مئو: زبان کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، ہندی کو ہندوؤں اور اردو کو مسلمانوں کی زبان تسلیم کرنا بدقسمتی ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار حاجی حکیم اللہ خان میموریل ورکشاپ کے زیراہتمام عالم پبلک اسکول بیسواڑہ گھوسی میں منعقد ایک ادبی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر شعبہ ہندی ڈاکٹر عبدل بسم اللہ نے کیا۔ 'کویتا بھاشا میں آدمی ہونے کی تمیز اور کویتا کا ساماجک سروکار' کے عنوان پر منعقد اس ادبی تقریب کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر بسم اللہ نے کہا کہ جب تک زبانوں کو کسی مذہب سے جوڑ کر دیکھا جائے گا تب تک تمیز نہیں آسکتی۔ ہندی کو ہندوؤں اور اردو کو مسلمانوں کو کی زبان تسلیم کرلیا جانا ہمارے ملک کے لیے ایک بہت بڑی بدقسمتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ تلسی داس نے چار ہزار سے زیادہ عربی فارسی کے الفاظ کو رام چرت مانس میں استعمال کیا ہے۔ مہمان اعزازی کی حیثیت سے شریک ڈاکٹر جے پرکاش دھوم کیتو نے کہا کہ سماج میں آدمیت اور انسانیت کا ماحول پیدا کرنا ادیبوں کی ذمے داری ہے۔ صدارت ماسٹر ریحان اللہ خان اور نظامت منوج کمار سنگھ نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 نومبر 2014

پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار

لکھنؤ: اردو رائٹرس فورم کے زیراہتمام جے شنکر پرساد آڈیٹوریم میں پروفیسر شمیم نکہت کی کتاب 'پریم چند کے ناولوں میں

نسوانی کردار' پر ایک مذاکرے کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر خان مسعود احمد نے کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ہارون رشید نے انجام دیے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر صبیحہ انور نے اپنی گفتگو سے پروگرام کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر شمیم نکہت نے سماج کو انسانوں کا اجتماعی عمل قرار دیا۔ پریم چند دبے کچلے عوام کے وکیل ہونے کے ناطے عورت کی ناقدری اور دکھ پر بے چین ہوتے ہیں۔ اس دکھ کو اس ہمدردی کی زبان کو ایک عورت ہی بخوبی سمجھ سکتی ہے۔ یہ کام پروفیسر شمیم نکہت نے اپنی کتاب میں بخوبی انجام دیا ہے۔ جرمنی میں مقیم عارف نقوی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر شمیم نکہت کے بارے میں کہا کہ وہ خود بھی ایک افسانہ نگار ہیں اس لیے وہ ناول اور افسانوں کی فنی اور تکنیکی خوبیوں اور خامیوں کو خوب سمجھتی ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 22 نومبر 23014

پروفیسر احتشام حسین کے 37ویں یوم وفات پر سیمینار

لکھنؤ: احتشام حسین ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جس کے اندر تضاد نہیں تھا۔ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ فکر کی جس بلندی پر احتشام حسین متمکن تھے ان کے معاصرین میں وہاں تک کوئی نہیں پہنچا۔ وہ ایک کامیاب استاد کے ساتھ ہی نظریہ ساز ناقد بھی تھے۔ ان خیالات کا اظہار لکھنؤ یونیورسٹی میں پروفیسر سید احتشام حسین کی 37ویں یوم وفات پر منعقد ایک سیمینار میں پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کیا۔ انھوں نے سید احتشام حسین کی علمی فتوحات، تخلیقی اور تنقیدی بصیرت کے ساتھ ہی ان کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر صدر شعبہ ڈاکٹر عباس رضا نیر نے صدر جلسہ کا تعارف کراتے ہوئے سید احتشام حسین کے حیات و کارناموں پر اجمالی روشنی ڈالی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ڈاکٹر جعفر عسکری نے اپنے والد سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ وہ اوریجنل نقاد اور تخلیق کار تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 2 دسمبر 2014

آگرہ میں اردو بیداری ہفتہ کا آغاز

آگرہ: اردو کے فروغ کے لیے حکومت پر بھروسہ کرنا سراسر نادانی ہے۔ حکومت کسی بھی زبان کی ترقی نہیں کرتی۔ لہٰذا اردو کی ترقی کے لیے ہمیں خود ہی کوشش کرنا ہوگا۔ اس عزم کے ساتھ آگرہ میں اردو بیداری ہفتہ کا آغاز ہوا۔ یہ اردو بیداری ہفتہ انجمن ترقی اردو کی آگرہ شاخ اور عائشہ ایجوکیشنل گروپ کے جانب سے انعقاد کیا گیا۔ اس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے پروگرام کے روح رواں حاجی نیاز محمد خاں چودھری نے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے بڑی اکادمیوں کی اتنی ضرورت نہیں جتنی چھوٹے اردو تعلیمی مراکز کی ہے جہاں چھوٹے بچے بنیادی اردو سیکھ سکیں۔ انجمن ترقی اردو آگرہ کے صدر حاجی فراست حسین شمسی نے کہا کہ ذاتی استعمال میں اردو کو بڑھاوا دینا ہی مسئلے کا حل ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 نومبر 2014

مہرشی شیوبرت لال کی غیر معمولی خدمات

علی گڑھ: پروفیسر انصاراللہ کا امتیاز ہے کہ انھوں نے علم و ادب کے بیشتر ایسے گوشوں کو نمایاں کیا ہے جو زمانہ کی نظروں سے پوشیدہ تھے، مہرشی شیوبرت لال ورمن کی غیر معمولی اور تاریخ ساز شخصیت کو دنیائے علم و دانش سے روشناس کرانا بھی انھیں کا کارنامہ ہے ان خیالات کا اظہار مہرشی شیوبرت لال ریسرچ اکادمی علی گڑھ کے زیراہتمام منعقد استقبالیہ جلسے کو خطاب کرتے ہوئے مہمانِ خصوصی پروفیسر افضال احمد نے کیا۔ جلسے میں پروفیسر انصاراللہ کی جن تازہ تصانیف کا اجرا کیا گیا ان میں تاریخ زبان و ادب اردو، اردو میں تدوین، اور چندائن جیسی اہم کتابیں شامل ہیں۔ مہمانِ ذی وقار ایم ایل سی وویک بنسل نے کہا کہ اردو ہندو مسلم تہذیب کا مشترکہ سرمایہ ہے اور ڈاکٹر محمد انصاراللہ اس کے امین ہیں۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 19 نومبر 2014

بیگم حضرت محل کے نام پر کتاب میلہ

لکھنؤ: لکھنؤ میں اودھ کی بیگم حضرت محل کے نام سے منسوب 7 روزہ کتاب میلہ سلیم پور ہاؤس لان میں شروع ہوگیا ہے۔ اس میلے کا انعقاد چاند تعلیمی سوسائٹی کے زیراہتمام کیا جارہا ہے۔ اس کتاب میلے میں خان محمد عاطف، محترمہ جان جوزف، صمیمہ خان، عائشہ اور رحمان نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی۔ میلے کے انعقاد

پٹنہ میں اردو کی نئی شاخ کے افتتاح کا منظر

کے لیے ان سبھی لوگوں نے پروگرام کے آرگنائزر کو مبارکباد پیش کی۔ مقررین نے کہا کہ اس طرح کے میلے کے انعقاد سے جہاں لوگوں کو ایک مقام پر تمام طرح کی کتابیں دستیاب ہوتی ہیں وہیں اس سے مختلف شعبوں کے لوگوں کو یکجا ہونے میں بھی سہولت ہوتی ہے۔ اس موقعے پر پروگرام کی کنوینز قمر جہاں نے تمام حاضرین اور مہمانان خصوصی کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'خبریں'، دہلی، 16 نومبر 2014

بہار:

متھلا یونیورسٹی میں دو روزہ سیمینار

دربھنگہ: للت نارائن متھلا یونیورسٹی کے دو روزہ سیمینار میں پرو وائس چانسلر پروفیسر سید ممتاز الدین نے اپنے صدارتی خطاب میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ 'غیر تخلیقی نثر پچھلے 25 سال میں' جو سیمینار منعقد کیا گیا ہے، وہ کامیاب رہا اس طرح کے سیمینار سے علم و ادبی ماحول بنتا ہے۔ بچوں میں بیداری آتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ گوپی چند نارنگ، کلیم الدین احمد، قمر اعظم ہاشمی، علیم اللہ حالی، سید عقیل احمد، نورالحق تقوی وغیرہ نے اردو ادب میں غیر تخلیقی نثر پر خوب کام کیا ہے۔ ان کی تخلیقات اردو ادب کے لیے انمول سرمایہ ہیں۔ اس موقعے پر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ڈاکٹر راشد انور راشد نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ اس موقعے پر سیمینار کے 3 سیشن منعقد کیے گئے جس کی صدارت پروفیسر حسین الحق، پروفیسر شاکر خلیق، ڈاکٹر جاوید حیات، پروفیسر عبدالمنان طرزی، ڈاکٹر رضی الرحمٰن، پروفیسر شاداب رضی، پروفیسر ظفر حبیب اور ڈاکٹر منظر اعجاز کے علاوہ پروفیسر ایم کمال الدین نے کی۔ 3 سیشن میں پروفیسر شہاب ظفر، ڈاکٹر حسین احمد، ڈاکٹر عبدالمنان طرزی، ڈاکٹر احتشام الدین، ڈاکٹر منظر اعجاز، ڈاکٹر سید شاہ حسین احمد، ڈاکٹر اسلام عشرت، ڈاکٹر جمال اویسی، ڈاکٹر سجاد احمد خاں، ڈاکٹر شاداب رضی، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر محمد بدرالدین، ڈاکٹر شہاب اختر، ڈاکٹر زین رامش، ڈاکٹر آفتاب اشرف، پروفیسر

احمد حسن دانش کے علاوہ درجنوں ریسرچ اسکالر نے اپنے مقالے پیش کیے۔ نظامت کے فرائض پروفیسر رئیس انور کے علاوہ ڈاکٹر فاران شکوہ یزدانی، ڈاکٹر ارشد جمیل، ڈاکٹر سید رضوان اللہ نے انجام دی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 دسمبر 2014

تحریک اردو کی نئی شاخ کا افتتاح

پٹنہ: اردو زبان شیریں ہونے کے علاوہ تہذیب و محبت کی زبان ہے۔ اس کی شیرینی سے خود بھی مستفیض ہوں اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچائیں۔ مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب آپ منظّم و متحد ہوں گے اور اس کی ترویج و اشاعت کے لیے اپنے اندر دیوانگی پیدا کریں گے۔ اپنے حقوق کے تحفظ و بازیابی کے لیے اسی طرح کا جذبہ پیدا کرنے کی غرض سے اردو آبادی کے درمیان تحریک اردو (رجسٹرڈ) سرگرم عمل ہے۔ یہ باتیں تحریک اردو کے صدر محمد کمال الظفر نے ہفتہ کے روز تکیہ جمال شاہ دانا پور، پٹنہ میں مقامی شاخ کے افتتاح کے موقعے پر کہہ رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر تحریک قربانی چاہتی ہے لہٰذا محبان اردو اس کے لیے تیار رہیں۔ تحریک کے سکریٹری سید رضا حسین نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو کا المیہ ہے کہ اردو کی روٹی کھانے والے ہی اس کا بھلا نہیں چاہتے، جس سے حکومت اور اس کے فرقہ پرست افسران کو بھی ناانصافیوں سے کام لینے کا موقع مل جاتا ہے لہٰذا اردو والے اپنی ذمے داری ادا کریں۔ اس سے قبل تحریک اردو کے ترجمان محمد عارف انصاری نے کہا کہ اگرچہ اردو بہار کی ثانوی سرکاری زبان ہے لیکن زمینی حقیقت یہ ہے کہ متعصب سرکاری افسران اسے مٹانے کی ہر ممکن کوششیں کر رہے ہیں۔ اس کے لیے عملی جدو جہد کی ضرورت ہے، تاکہ حکومت اردو کو اس کا حق دینے پر مجبور ہو جائے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 نومبر 2014

عربی دنیا کے 36 ممالک کی سرکاری زبان

پٹنہ: پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں 'شاہ امین احمد کاظمی میموریل لیکچر کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر پروفیسر عبدالباری سابق صدر شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اپنا اہم خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ عربی زبان کی پوری دنیا میں ضرورت ہے۔ انھوں نے بتایا کہ عربی زبان یو این او کی زبان ہے اور آج کل تعلیم کو معاش سے جوڑ دیا گیا ہے۔ لہٰذا انگلش کے بعد عربی زبان میں سب سے زیادہ تجارت ہوتے ہیں۔ وہیں مہمان خوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے شاہ تقی الدین احمد فردوسی ندوی (سبکدوش وزارت تعلیم سعودی عربیہ) نے اپنے خطبے میں بتایا کہ عربی زبان دنیا کی تقریباً 36 ممالک کی سرکاری زبان ہے۔ اس پروگرام کی نظامت شعبہ عربی کے لکچرر ڈاکٹر سرور عالم ندوی نے کی جبکہ صدارت پروفیسر فضل کبریا صدیقی سابق صدر شعبہ عربی پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ نے کی۔ وہیں اس پروگرام کو ترتیب دینے میں شعبہ کے عماد الدین، عنبر حسین، ہاجرہ، مرین خاتون، رفیقہ خاتون اور سخاوت وغیرہ نے تعاون پیش کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 28 نومبر 2014

پنجاب

حکومت پنجاب کے دفاتر میں اردو ماہرین کی کمی

بھٹنڈا: پنجاب کے سرکاری دفاتر میں اردو زبان میں تحریر قدیم سرکاری ریکارڈ پڑھنے کے لیے ریاستی حکومت کو اردو جاننے والے ماہرین کی قلت پریشان کر رہی ہے۔ ریاست میں پرانا سرکاری ریکارڈ اردو میں تحریر ہونے کی وجہ سے ریکارڈ تلاش کرنے اور اسے پڑھنے کے لیے اردو زبان کے ماہرین نہیں مل رہے ہیں، جس کی وجہ سے سرکاری ملازموں اور عام لوگوں کو بھی کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ریاست کے سرکاری دفاتر میں سال 1887 تک کا ریکارڈ موجود ہے، لیکن اردو زبان میں تحریر اس ریکارڈ کو سمجھانے والے نہیں رہے۔ اردو زبان کا علم رکھنے والے زیادہ تر تحصیل دار اور نائب تحصیل دار اب تقریباً ریٹائرڈ ہو چکے ہیں۔ سرکاری دفاتر میں زیادہ تر پرانا ریکارڈ اردو میں تحریر ہونے کے سبب لوگوں کو اپنے بزرگوں کی پیدائش اور ڈیتھ سرٹیفکیٹ نکلوانے میں دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ محکمہ صحت اور کارپوریشن کے دفاتر میں بھی اردو کا علم رکھنے والے ملازمین برائے نام ہی ہیں۔ تاہم محکمہ صحت نے اپنے ملازموں کو ہدایت دی ہے کہ اردو میں لکھے پیدائش سرٹیفکیٹ کو پڑھنے کے لیے اردو ماہرین کا انتظام کرکے انھیں تیار کیا جائے۔ ذرائع کے مطابق پہلے ریاستی حکومت

پریم چند پر توسیعی خطبہ میں صغیر افراہیم خطاب کرتے ہوئے، جبکہ اسٹیج پر موجود دیگر شرکا

کی جانب سے پٹواری بھرتی کے لیے امیدواروں کے ساتھ اردو کی معلومات ہونے کی شرط رکھی جاتی تھی لیکن اب شاید یہ شرط ہٹالی گئی ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 10 نومبر 2014

بزم اردو کے زیر اہتمام خصوصی تقریب

مالیرکوٹلہ: گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن مالیرکوٹلہ (پنجاب) کی بزم اردو کی جانب سے ایک خصوصی ادبی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ اس میں مشہور افسانہ نگار جناب کرشن بیتاب، بیسویں صدی میگزین کی ایڈیٹر ڈاکٹر شمع افروز زیدی، عالمی سطح کے سنسکرت دانشور پروفیسر ڈی ڈی بھٹی بطور مہمان شریک ہوئے۔ بزم اردو کے اراکین نے کالج تشریف لانے پر معزز مہمانوں کو خوش آمدید کیا۔ تقریب میں بیسویں صدی میگزین کی جانب سے مالیرکوٹلہ کے شاعر جناب ناز بھارتی کا اعزاز واکرام بھی کیا گیا۔ مقررین نے بزمِ اردو کے سرپرست اور کالج کے پرنسپل ڈاکٹر محمد اقبال کی اس علاقے میں فروغ اردو کی کوششوں کی تعریف کی اس تقریب میں ڈاکٹر اسلم حبیب کے شعری مجموعہ 'مجھے اک گیت ایسا دے' کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی۔ شرکا میں کلدیپ سنگھ سیکھوں، جناب رمضان سعید، سکریٹری ڈاکٹر منظور حسن، جناب ایم انوار انجم، وغیرہ موجود تھے۔ کالج کے وائس پرنسپل پروفیسر ہربنس لال متل نے تمام مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض محترمہ شلپا اگروال نے بحسن وخوبی انجام دیے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 27 نومبر 2014

تلنگانہ

حیدرآباد میں جشن خسرو

حیدرآباد: تلنگانہ کے نائب وزیر اعلیٰ محمد محمود علی اور دیگر اہم شخصیتوں نے مشہور صوفی شاعر امیر خسرو کو بھرپور خراجِ عقیدت پیش کیا اور کہا کہ امیر خسرو نے صوفیانہ شاعری کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا تھا جن کی شخصیت اور ان کے کارناموں کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔ نائب وزیر اعلیٰ نے حضرت امیر خسرو کی یاد میں شہر حیدرآباد میں منعقدہ جشن خسرو کے حصہ کے طور پر ایک سیمینار کا افتتاح کیا۔ اس موقعے پر انھوں نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ امیر خسرو کو کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ دنیا کے ہر گوشے میں ان کی تعلیمات پر عمل ہو رہا ہے اور خاص طور پر ان کی پہیلیاں کافی مشہور ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نئی نسل کو ان کی شخصیت سے روشناس کروانے کی ضرورت ہے تاکہ نئی نسل امیر خسرو کی ہمہ جہتی شخصیت کے بارے میں معلومات حاصل کر سکے۔ انھوں نے بتایا کہ تلنگانہ حکومت نے اجمیر شریف میں 5 کروڑ کی لاگت سے حیدرآباد بھون تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ تلنگانہ کے زائرین کو اجمیر میں قیام کی سہولت فراہم کی جاسکے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 24 نومبر 2014

راجستھان:

پریم چند پر توسیعی خطبہ

اودے پور: پریم چند کا افسانوی ادب آج بھی اتنا ہی بامعنی ہے جتنا کل تھا۔ اس لیے عصر حاضر میں پریم چند کی معنویت برقرار ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر صغیر افراہیم نے موہن لال سکھاڈیا یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی جانب سے منعقدہ ایک توسیعی خطبے کے دوران کیا۔ انھوں نے کہا کہ آج ہر سیاسی جماعت دیہات کی بدحالی کا رونا روتے نہیں تھکتی، آج سب کو گاؤں کے مجبوروں ومحکوموں کی یاد ستاتی ہے۔ پریم چند نے اپنی کہانیوں میں ایک صدی قبل ان تمام مسائل کو پیش کر دیا تھا جو آج ہمارے سماج کو درپیش ہیں۔ پریم چند نے اپنے افسانوں میں ان آہٹوں کو پہلے سے محسوس کر لیا تھا۔ صدر شعبہ اردو پروفیسر فاروق بخشی نے معزز مہمان کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر قمر رئیس کے بعد پریم چند شناسی کی روایت کو جس شخص نے برقرار رکھا ہے اس میں پروفیسر صغیر افراہیم کا نام نامی پیش پیش ہے۔ آخر میں ڈاکٹر حدیث انصاری نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت ڈاکٹر رئیس احمد نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 نومبر 2014

مہاراشٹر:

بھیونڈی میں 'آبِ گم'' پر مذاکرہ

بھیونڈی: بھیونڈی میں 16 نومبر کی صبح درخشاں اردو کے درخشندہ ادیب جناب مشتاق احمد یوسفی کے نام معنون رہی۔ کے.ایم.ای.سوسائٹی کے تحت جاری 'ای. لائبریری' کے زیر اہتمام 'آیئے مسکرائیں' عنوان کے تحت، رئیس ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج بھیونڈی کے 'اردو بسیرا آڈیٹوریم' میں 'آبِ گم' پر گفتگو اور کتاب مذکور کے اقتباسات منتخب اساتذہ کرام نے پیش کیے۔ مشہور اسلامی اسکالر اور اردو ادبِ لطیف کے پارکھ اور پرستار ڈاکٹر عرفان فقیہ نے سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے مشتاق احمد یوسفی کے فن کو زبردست خراج پیش کیا۔ آپ نے اربابِ فن کے تذکرے میں نامور ادبا اور شعرا کے متعلق بات چیت کی اور مزاح نگاروں کے باب میں شفیق الرحمٰن، کرنل محمد خان اور مشتاق احمد یوسفی کے رشحاتِ قلم کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ آپ نے یوسفی سے ان کے قارئین کی محبت وعقیدت کا والہانہ ذکر بھی کیا۔ پروفیسر عرفان فقیہ نے یوسفی کے بہترین اسلوب کا حوالہ دیتے ہوئے انھیں 'اقلیمِ مزاح' کا بادشاہ قرار دیا۔ محمد رفیع انصاری نے مشتاق احمد یوسفی کی چوتھی کتاب 'آبِ گم' کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ حاملِ کتاب کے پاس سے 'گم' ہو جاتی ہے۔ انھوں نے مثالیں دیتے ہوئے کہا کہ شاید ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ اس میں گم ہو جانے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔ جو لوگ اس کے شائق ہیں وہ گمشدگی کی صورت میں بار بار خرید کر پڑھتے ہیں۔ کتاب کی یہ گمشدگی درحقیقت یوسفی کی مقبولیت اور محبوبیت کی دلیل ہے۔ کتاب اور قاری کی موجودہ صورتِ حال کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے پطرس بخاری کے مندرجہ ذیل جملے دہرائے: اگر یہ کتاب آپ نے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے، آپ کو کسی نے بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے اور اگر آپ نے چرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں۔'' اس موقعے پر 'آبِ گم' کے منتخب اقتباسات بالترتیب عامر صدیقی، مخلص مدعو، رفیع انصاری، علیم شیخ، اقبال عثمان مومن، عامر قریشی، شیم اقبال اور

مقصود انصاری نے پیش کیے۔ شہر و بیرونِ شہر کے اہلِ ذوق کثیر تعداد میں سامعینِ باتمکین نے ایک ایک جملے اور حملے کا لطف اٹھایا اور جھیلا۔ رہ رہ کر یہ ادبی محفل زعفران زار بنی رہی۔ اس پروگرام کے روحِ رواں ای. لائبریری کے انچارج جناب صادق انصاری تھے۔ پروگرام کا آغاز سیکنڈری اسکول کے طالب علم محمد حامد رضا کی خوش کن آواز میں پڑھی گئی حمد سے ہوا جب کہ نظامت کا فریضہ جویریہ قاضی نے انجام دیا۔ جناب عبدالعزیز انصاری نے رسم شکریہ ادا کرتے ہوئے ای. لائبریری سے استفادے کی ضرورت پر زور دیا۔

پریس ریلیز، سردار حاجی امیر صاحب، بھیونڈی، 18 نومبر 2014

اعزاز و اکرام:

غالب ایوارڈ 2014 کا اعلان

نئی دهلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کی ایوارڈ کمیٹی کی ایک اہم میٹنگ میں غالب ایوارڈ 2014 کے لیے پروفیسر قاضی افضال حسین، پروفیسر نبی ہادی، عبدالصمد، مضطر مجاز، ٹام آلٹر اور پروفیسر شمس الحق عثمانی کا نام منتخب کیا گیا۔

پروفیسر افضال حسین — ٹام آلٹر — مضطر مجاز

13 نومبر کو ایوانِ غالب میں جسٹس آفتاب عالم کی صدارت میں ہوئی میٹنگ میں یہ فیصلہ لیا گیا جس میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر شمیم حنفی اور انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر سید رضا حیدر بھی موجود تھے۔ یہ ایوارڈ بین الاقوامی غالب تقریبات کے افتتاحی اجلاس میں 19 دسمبر کو سرٹیفکیٹ، مومنٹو اور 75 ہزار روپے نقد کے ساتھ دیے جائیں گے۔ خیال رہے کہ ایوارڈ کمیٹی نے ادبی شخصیات کے لیے ایوارڈ کے نام کا بھی تعین کردیا ہے۔ چنانچہ اردو کے ممتاز ناقد و دانشور اور کئی اہم کتابوں کے مصنف پروفیسر قاضی افضال حسین کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے اردو تحقیق و تنقید، فارسی کے نامور اسکالر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی شعبہ فارسی کے سابق صدر پروفیسر نبی ہادی کو فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے فارسی تحقیق و تنقید، معروف افسانہ نگار اور کئی بڑے ناولوں کے مصنف عبدالصمد کا نام غالب ایوارڈ برائے اردو نثر، عہد حاضر کے نامور شاعر مضطر مجاز کا نام غالب انعام برائے اردو شاعری اور ہم سب غالب انعام برائے اردو ڈرامہ کے لیے مشہور ڈرامہ نگار ٹام آلٹر کے نام کا تعین ہوا ہے اور مجموعی ادبی خدمات کے لیے نقاد کئی کتابوں کے مصنف اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اردو کے سابق صدر پروفیسر شمس الحق عثمانی کے نام پر تمام دانشوران کا اتفاق ہوا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 نومبر 2014

گیارہواں انٹر اسکول اور مباحثہ برائے کریسینٹ غالب رننگ ٹرافی

نئی دهلی: جدید ذرائع ابلاغ کے چیلنجز کا سچائی اور حوصلہ کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیے اور مثبت نظریہ فکر کے ساتھ اس کا استعمال کرنا چاہیے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار کمشنر برائے لسانی اقلیات حکومت ہند پروفیسر اختر الواسع نے ایوان غالب میں کریسنٹ اسکول کے زیراہتمام منعقدہ گیارہویں انٹر اسکول اردو مباحثہ برائے کریسنٹ غالب رننگ ٹرافی میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ واضح رہے کہ مباحثہ دو زمروں پر مشتمل تھا۔ ان دونوں موضوعات پر مباحثہ میں تقریباً 12 اسکولوں کے سینئر اور جونیئر طلبہ و طالبات نے حصہ لیا۔ مباحثہ کے بعد ڈاکٹر شمیم احمد نے نتائج کا اعلان کیا جس میں جونیئر زمرے میں پہلا انعام زید احمد کریسنٹ اسکول دریا گنج، دوسرا اطہورا کریسنٹ اسکول دریا گنج اور تیسرا انعام رمشہ ناز کریسنٹ اسکول مومپور نے حاصل کیا۔ سینئر زمرے میں پہلا انعام اینگلو عربک اسکول کے طالب محمد صائم، دوسرا کریسنٹ اسکول دریا گنج کی طالبہ زینب فاطمہ اور تیسرا انعام جامعہ ملیہ اسلامیہ اسکول کی طالبہ زینب ناہید نے حاصل کیا۔

کریسنٹ ایجوکیشن سوسائٹی کے صدر محمد ذکی نے کہا کہ ایسے مقابلے کا انعقاد مستقل ہونا چاہیے کیونکہ اس سے قائدانہ صلاحیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اخیر میں صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے صدر پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ جس زبان کو سیکھنے والے اتنی بڑی تعداد میں موجود ہوں، اس کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ زبان ختم ہورہی ہے، کسی طرح صحیح نہیں، اردو دل کے جذبات کو ادا کرتی ہے اس لیے وہ کبھی ختم نہیں ہوسکتی ہے۔ آخر میں پرنسپل سنبلہ نقوی نے تمام حاضرین اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 نومبر 2014

پروفیسر طارق چھتاری کو لمہی سمان

علی گڑھ: پریم چند کی حیثیت ہندوستان میں ویسی ہی ہے جیسی روس میں گورکی کی تھی۔ پریم چند اڑن کھٹولے سے ادب کو زمین پر لے آئے اور انھوں نے گاؤں کے کرداروں کو تختِ طاؤس پر لا بٹھایا۔ ان خیالات کا اظہار

معروف فکشن نگار پدم شری قاضی عبدالستار نے این آر ایس سی کلب ہال میں 'لمہی میگزین' کے زیراہتمام منعقدہ انھوں نے طارق چھتاری کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ طارق چھتاری کو اردو کشی کے دور میں وہ منصب ملا ہے جس کے وہ حقدار تھے۔ لمہی میگزین کی جانب سے سال 2013 کا 'لمہی سمان' اسی پروقار تقریب میں پروفیسر طارق چھتاری کو پدم شری قاضی عبدالستار اور پروفیسر افتخار عالم خاں (ماہر سرسید) کے دست مبارک سے عطا کیا گیا۔ اس موقعے پر معروف افسانہ نگار شوکت حیات، غزال ضیغم اور اسرار گاندھی و نقاد علی احمد فاطمی وغیرہ خصوصی طور پر موجود تھے۔ پروفیسر طارق چھتاری ایوارڈ کی قبولیت کے بعد اپنے خطاب میں کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ اس تقریب میں ہندی اور اردو کے بڑے عالم و دانشور موجود ہیں جنھوں نے میری رہنمائی کی۔ 'لمہی میگزین' کے چیف ایڈیٹر اور 'لمہی سمان' کے کنوینر وجے رائے نے پروفیسر طارق چھتاری کو سپاس نامہ پیش کرنے کے بعد کہا کہ آزادی کے بعد مسلسل قومی دھارا سے الگ تھلگ

اردو ہندی اور پنجابی کی مشترکہ ادبی تنظیم محفل گنگ وجمن کے منعقدہ پروگرام میں ایوارڈ یافتگان کے لیفٹیننٹ گورنر نجیب جنگ اور ڈاکٹر ظفر مرادآبادی

ہو رہے گاؤں کو مرکز میں لانے کی کوشش 'لمہی میگزین' کے ذریعے کی جارہی ہے۔ پروفیسر طارق چھتاری کو 15 ہزار روپے کا چیک، سپاس نامہ، مومنٹو اور شال پیش کی گئی جبکہ ان کی ادبی خدمات پر 'لمہی' کا خصوصی شمارہ کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس موقعے پر پروفیسر صغیر افراہیم، ڈاکٹر نمیتا سنگھ، ڈاکٹر زویا زیدی، ڈاکٹر افشاں ملک، ڈاکٹر ثمینہ خان، سیما یاسمین، پروفیسر خورشید احمد، معروف افسانہ نگار شوکت حیات، سید محمد ہاشم، حکیم ظل الرحمٰن، علی احمد فاطمی، پریم کمار، خان فاروق، ڈاکٹر عاصم علی صدیقی، محمد شاہد، عامر رشید، محمد فرقان سنبھلی، ضمیر اللہ، غالب احمد، عبدالرزاق وغیرہ موجود رہے۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 10 نومبر 2014

محفل گنگ وجمن

نئی دہلی: ملکی سطح پر معروف اردو ہندی اور پنجابی کی مشترکہ ادبی تنظیم محفل گنگ وجمن کی طرف سے ایوان غالب میں ایئرٹیل کے اشتراک سے منعقدہ ایک تقریب میں ادب سے وابستہ سرگرم لوگوں کو دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر نجیب جنگ کے ہاتھوں انعامات سے نوازا گیا۔ انعام یافتگان میں اردو کے لیے اردو صحافت سے وابستہ مصنف حبیب سیفی، ہندی زبان کے لیے نوجوان شاعر وشال باغ اور پنجابی شاعرہ تروبندر کو پچاس پچاس ہزار روپے شال اور مومنٹو پیش کیا گیا۔ محفل کے ایگزیکیوٹو سکریٹری ڈاکٹر ظفر مرادآبادی نے تقریب کی نظامت کے دوران محفل گنگ وجمن کے اغراض ومقاصد پر جامع انداز میں روشنی التے ہوئے کہا کہ محفل گنگ وجمن کا اصل مقصد نظرانداز کیے جانے والے فنکاروں اور اچھا لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہے۔ نجیب جنگ نے تولین سنگھ کی ادبی خدمات کی ستائش کی اور اس کام میں ریاستی سرکار کے تعاون کی ہر طرح سے یقین دہانی کرائی۔ اس موقعے پر ریختہ کے نمائندے دھرمیندر ساہا، ڈاکٹر جی آر کنول، میزبان محترمہ تولین سنگھ و اہل خانہ، علاوہ مہاراج ہٹ یوگی ساحل، ڈاکٹر رضا حیدر، ڈاکٹر ادریس، متین امروہوی، سردار ہربھجن سنگھ رتن، ایڈووکیٹ کھربندا، زیب حسنی، ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی، ذہینہ صدیقی اور دیگر عمائدین شہر موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 نومبر 2014

شمس رمزی کو ایوارڈ

نئی دہلی: اردو کلچرل سوسائٹی کے صدر امیر امروہوی و دیگر اراکین نے اظہار مسرت کرتے ہوئے کہا کہ جناب شمس رمزی نئی نسل کے نمائندہ شاعر، ادیب، نقاد اور صحافی ہیں۔ انھیں فروغ اردو ادب کمیٹی گنور کی جانب سے جو ایوارڈ، شیلڈ، ردائے ادب، سپاس نامہ اور 25 ہزار روپے نقد دیے ہیں وہ اس کے مستحق تھے۔ بلکہ انھیں ریاستی حکومتیں اور مرکزی حکومت کو بھی اردو کی خدمات کے لیے ایوارڈ دینا چاہیے انھوں نے صرف شاعری ہی نہیں بلکہ نثر نگاری اور تنقید کے علاوہ صحافتی میدان میں بھی بہت کام کیا ہے ان کی کئی کتابوں کو اردو حلقوں نے شرف قبولیت کی سند دے دی ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 14 نومبر 2014

جلسہ تقسیم انعامات برائے اردوخواندگی

نئی دہلی: تالکٹورہ اسٹیڈیم میں منعقد سالانہ جلسہ تقسیم انعامات برائے اردوخواندگی مراکز کے موقعے پر دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر نجیب جنگ نے کہا کہ اس جلسے میں کثیر تعداد میں آئی بچیوں اور خواتین کو دیکھ کر مجھے انتہائی خوشی کا احساس ہورہا ہے۔ کیونکہ سماج میں عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا سماج کے ترقی یافتہ ہونے کی ایک مثال ہے۔ سکریٹری آرٹ کلچر ولینگویجز گیتانجلی گپتا نے اپنی مختصر مگر جامع تقریر میں کہا کہ اردو اکادمی، دہلی نے محض 20 برسوں میں 80 ہزار سے زیادہ لوگوں کو تعلیم کے جوہر سے روشناس کرایا ہے اور اسے ایک بڑا کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس سے قبل اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ اردو اکادمی اپنے قیام کے اول دن سے نہ صرف یہ کہ گھر گھر اردو زبان وتہذیب کو پہنچانے کے لیے کوشاں ہے بلکہ قومی تعلیمی مشن کے تحت ناخواندگی سے ملک کو پوری طرح آزاد کرنے میں بھی حکومت کا بھرپور تعاون کررہی ہے۔ اس مختصر تقریری پروگرام کے بعد لیفٹیننٹ گورنر اور سکریٹری آرٹ، کلچر ولینگویجز نے اردوخواندگی مراکز کے تقریباً 150 چنندہ انسٹرکٹرز اور طلبہ کو شیلڈ، ٹیفکیٹ اور نقد انعامات تقسیم کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 دسمبر 2014

مدثر احمد کو بابائے اردو مولوی عبدالحق کا ایوارڈ

شیموگہ: روزنامہ انقلاب کے ایڈیٹر مدثر احمد کی صحافتی خدمات کو دیکھتے ہوئے انجمن ترقی اردو ہند شاخ شیموگہ کی جانب سے یوم اردو کے موقعے پر 'بابائے اردو مولوی عبدالحق' کے نام سے موسوم ایوارڈ دیا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ اردو اکادمی کے سابق چیئرمین م ن سعید کے ہاتھوں سے دیا گیا ہے۔ اعزاز میں دیے گئے سپاس نامے میں بتایا گیا ہے کہ ''روزنامہ آج کا انقلاب بلاشبہ علاقے ملناڈ اور بھٹک کے لیے اکیسویں صدی کا حیرت انگیز انقلاب ہے جس کے ذریعے سے یہاں کے مسلمانوں میں ملی، سیاسی، سماجی شعور کو جلا ملی اس کے ذریعے یہاں کے

جلسہ تقسیم انعامات برائے اردوخواندگی پروگرام میں لیفٹیننٹ گورنر نجیب جنگ اردو انسٹرکٹر کو ایوارڈ سے نوازتے ہوئے

ادنیٰ و اعلیٰ میں شوق جاگا۔ اس تقریب کے موقعے پر بہت سے عمائدین شہر موجود تھے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 2 دسمبر 2014

رسم اجرا:

آثار الصنادید کی اشاعت نو کا اجرا

علی گڑھ: سرسید احمد خاں صرف اپنے دور کے ہی نہیں بلکہ ہر دور کے عظیم مصلح اور تعلیمی رہنما ہیں انھوں نے تعلیم و تربیت کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ ہمارے ملک کی تاریخ کا روشن باب ہیں۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز فلم ساز اور سماجی کارکن مہیش بھٹ نے کیا۔ سرسید کی تاریخی تصنیف 'آثار الصنادید' کی اشاعتِ نو کا اجرا کر رہے تھے۔ سرسید کی اس کتاب کی اشاعتِ نو علیشا پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ نے کی ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 18 نومبر 2014

شاہ ولی اللہ کی قرآنی خدمات

علی گڑھ: شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے زیر اہتمام مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی کی سربراہی میں 'شاہ ولی اللہ کے افکار اور موجودہ دور میں ان کی معنویت' پر منعقدہ بین الاقوامی سیمینار کے دوسرے اجلاس میں شعبۂ اسلامک اسٹڈیز (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) سے شائع شدہ کتاب 'شاہ ولی اللہ کی قرآنی خدمات' کا اجرا نامور محقق مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی (ڈائریکٹر مفتی الٰہی بخش اکادمی) اور ڈاکٹر اے ایم عبدالرحمٰن کو (کلچرل کونسلر سفارت خانہ مصر) کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ سیمینار میں پیش کیے مقالات کے اس مجموعے کو پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی (سابق صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز) اور پروفیسر ظفر الاسلام (شعبۂ اسلامک اسٹڈیز) نے مرتب کیا ہے۔ اس میں ملک کی مختلف یونیورسٹیز اور علمی اداروں کے اساتذہ و محققین کے مقالات شامل ہیں۔ ان مقالات میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فارسی ترجمہ قرآن اور اصول تفسیر پر ان کی مشہور کتاب (الفوز الکبیر) کے علاوہ ان کی مختلف تصانیف میں جو قرآنی مباحث ملتے ہیں ان پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کی کتابوں میں سماجی، معاشی و سیاسی مسائل پر قرآن کریم کے حوالے سے جو افکار ملتے ہیں بعض مقالہ نگاروں نے خاص طور سے ان کا جائزہ لیا ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 29 نومبر 2014

صدارت تمھاری مصیبت ہماری

مالیگاؤں: مورخہ 8 نومبر 2014 'اسکس ہال مالیگاؤں میں آصف سبحانی کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے مجموعے 'صدارت تمھاری مصیبت ہماری' کا اجرا شہر کی ادب نواز شخصیت الحاج محمد اسحٰق سیٹھ زری والا کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس تقریب کی صدارت الحاج ڈاکٹر منظور حسن ایوبی صاحب نے کی۔ ہندو پاک کے مشہور افسانہ نگار سلطان سبحانی، مشہور محقق و نقاد ڈاکٹر اشفاق انجم، معروف محقق و مبصر ڈاکٹر الیاس صدیقی اور محمد حسین عاجز نے مصنف اور اس کی کتاب پر اپنی اپنی رائے پیش کیے۔ ڈاکٹر منظور حسن ایوبی نے خطبۂ صدارت میں کتاب کی خوبیوں پر تبصرہ کیا۔ نظامت کے فرائض عثمان غنی اسکس اور سراج دلار نے انجام دیے۔

پریس ریلیز، عثمان غنی، مالیگاؤں، 24 نومبر 2014

راجندر یادو کی منتخب کہانیاں کی رسم اجرا کا منظر

عالمی اردو ادب کے خصوصی شمارے کا اجرا

نئی دھلی: اردو کے شہرہ آفاق فکشن نگار کرشن چندر کے صد سالہ یوم پیدائش کے موقعے پر ایک پروقار ادبی تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں نند کشور وکرم کی ادارت میں شائع ہونے والے 'عالمی اردو ادب' کے خصوصی شمارے کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر خالد اشرف نے کہا کہ کرشن چندر کی کہانیوں اور دیگر تحریروں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ وہ مختلف رسائل وغیرہ میں اس طرح منتشر ہیں کہ ان کا شمار محققین کے لیے بھی دشوار ہے۔ اس موقعے پر حسن ضیا، شہباز حسین، پروفیسر صادق، کے ایل نارنگ ساقی، ڈاکٹر خالد علوی نے بھی اظہارِ خیال کیا جبکہ اردو بک ریویو کے ایڈیٹر عارف اقبال، ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ، خورشید اکرم، انیس امروہوی، افسانہ نگار دیپک بدکی کے علاوہ بڑی تعداد میں علمی و ادبی شخصیات موجود تھیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 نومبر 2014

'راجندر یادو کی منتخب کہانیاں'

نئی دھلی: ترجمہ کے ذریعے ایک ملک اور قوم دوسرے ملک وقوم کے خیالات، تہذیب و ثقافت اور خطہ و جغرافیائی حالات سے باخبر ہوتا ہے۔ نیشنل بک ٹرسٹ کے زیر اہتمام معروف ادیب و نقاد راجندر یادو کی 'منتخب کہانیاں' (ہندی) کا اردو ترجمہ 'راجندر یادو کی منتخب کہانیاں' کی رسم اجرا اور مباحثے میں صدر پروفیسر ابن کنول نے مذکورہ خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر مینیجر پانڈے نے کی جبکہ نظامت کے فرائض این بی ٹی کے اردو سیکشن کے ایڈیٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے انجام دیے۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے نیشنل بک ٹرسٹ کے ڈائریکٹر مسٹر ایم اے سکندر نے اردو صرف ایک طبقے کی زبان نہیں ہے بلکہ ہر طبقے کے لوگ اردو پڑھتے ہیں جس کی واضح دلیل ہے کہ ہندی اور انگریزی کے بعد سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب اردو کی ہے۔ پروفیسر انور پاشا راجندر یادو کی علمی، سماجی اور فکری وژن پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ وہ شمع انجمن تھے۔ اس موقعے پر اوپی بھیسم ریٹائرڈ آئی اے ایس نے اپنی تقریر میں کہا کہ اردو زبان کی گنگا جمنی چاشنی کو نئی نسل کے اندر گھولنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنے اس زبان سے قریب ہو سکے۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر مینیجر پانڈے نے کہا کہ راجندر یادو ادب اور ادیبوں کی آزادی کے سلسلے میں بہت کوشاں تھے۔ اخیر میں ڈاکٹر شمس اقبال نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 نومبر 2014

کلٹی، مغربی بنگال میں کتابوں کا اجرا اور تقسیم انعامات

کلٹی: 18 نومبر نیچوگرام، کلٹی میں انجمن ترقی، اردو ہند اور بزمِ عنوان (کلٹی) کے اشتراک سے بہت سی تقریبات کا انعقاد ہوا جس میں سب سے پہلے معراج احمد معراج کی تصنیف 'صدائے روح' کی رسمِ رونمائی ڈاکٹر شاہد اختر (ہگلی محسن کالج) کے ذریعے انجام پائی اور مغربی بنگال کے مشہور شاعر شمیم انجم وارثی کی تین تصنیفات 'بھیگی بھیگی پلکیں، بھیگا بھیگا پیرہن اور مغربی میں رینگا نگاری' کا اجرا بالترتیب جناب حلیم صابر، جناب انجم عظیم آبادی اور وقار قادری کے دستِ مبارک سے انجام پایا۔ اس کے بعد مہمانِ اعجازی سید محمد افروز اور مہمانانِ خصوصی ڈاکٹر عشرت بیتاب، سید انجم رومان، شان بھارتی اور محترمہ طلعت انجم وغیرہ

نے دونوں صاحبانِ کتاب کے فن و شخصیت پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر شاہد اختر نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ ''معراج نہ صرف کلٹی بلکہ سرزمینِ بنگالہ کی نوجوان نسل کے وہ نمائندہ شاعر اور نثر نگار ہیں۔'' اس موقعے پر انجمن کے ریاستی سکریٹری جناب محمد اظہار عالم اور ماسٹر سراج الدین صاحب کے ہاتھوں ان طلبا اور طالبات کو انعامات سے نوازا گیا جنھوں نے سالِ رواں کے مدھیامک اور ہائر سکنڈری کے امتحانات میں کم ازکم 65 فیصد مارکس حاصل کیے تھے۔

پریس ریلیز، معراج احمد معراج سکریٹری، بزم عنوان، انزا گاندھی کا کولنی، کلٹی، 10 نومبر 2014

تمھارے لیے

پٹنہ: نئی نسل کی ابھرتی ہوئی شاعرہ تحسین روزی کا شعری مجموعہ 'تمھارے لیے' کا اجرا جناب شاہد علی خاں وزیر محکمہ قانون سائنس اینڈ تکنالوجی حکومت بہار نے مقامی اردو بھون میں کیا۔ تقریب کی صدارت معروف شاعر اور ناقد پروفیسر علیم اللہ حالی نے کی جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے نوشاد عالم وزیر محکمہ اقلیتی فلاح حکومت بہار نے شرکت کی۔ پروفیسر علیم اللہ حالی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ تحسین کے کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شعری اظہار تحسین روزی کی داخلی شخصیت کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔ نوجوان قلمکار نورالسلام ندوی نے تقریب کی نظامت کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 9 نومبر 2014

ٹریٹمنٹ آف لومیرج کا اجرا

امروھه: شہر نے نایاب عباسی گرلس ڈگری کالج میں استاد ڈاکٹر تشکیل حیدر کی دوسری کتاب ٹریٹمنٹ آف لومیرج انڈرلچن آن دا فکشن آف خوشونت سنگھ کی رونمائی ادارہ کے سکریٹری ڈاکٹر اسلم فاروقی کے بدست انجام دی گئی، اس موقعے پر معززین ادب، اساتذہ کرام و شہر کی معزز شخصیات نے کتاب کی اہمیت، افادیت اور ڈاکٹر تشکیل حیدر کی ادبی خدمات کے موضوع پر تبادلہ خیال پیش کیا۔ ڈاکٹر اسلم فاروقی نے اپنی افتتاحی تقریر میں کتاب کے سلسلے میں بتاتے ہوئے کہا کہ خوشونت سنگھ نے سماج کو کس طرح سے محبت کی تعریف بتائی ہے، ڈاکٹر تشکیل حیدر نے اس کتاب میں ان کے خطبات کو خوبصورتی کے ساتھ سماج کے سامنے پیش کیا ہے، ان کی خدمات قابل تحسین ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 20 نومبر 2014

آنسوؤں کی برات

احمد آباد: مچھلی شہر، جونپور، اُتر پردیش سے احمد آباد آئے کہنہ مشق شاعر جناب عبرت مچھلی شہری کے اعزاز میں احمد آباد کی ایک ادبی انجمن 'گلشنِ ادب' نے 'رسمِ اجرا اور

مشاعرہ' منعقد کیا۔ اس پروگرام میں عبرت مچھلی شہری کی خدمت میں نشانِ اعزاز، شال اور گلدستہ پیش کر کے اعزاز دیا گیا نیز ان کے شعری مجموعہ 'آنسوؤں کی برات' کا اجرا چیتن بھائی راول (شہر پرمکھ، احمد آباد) کے دستِ مبارک سے عمل میں آیا۔ ہمت سنگھ پٹیل (ایم ایل اے)، لیاقت حسین (نگر سیوک) قمر جہاں (میونسپل کاؤنسلر، راجہ پور وارڈ 49) اور اشتیاق سعید (ممبئی) مہمانانِ خصوصی تھے۔ پریس ریلیز، اشتیاق سعید، ممبئی، 19 نومبر 2014

پندرہ روزہ استقلال کی رسم اجرا

کلکته: معروف صحافی اور سابق ممبر پارلیمنٹ احمد سعید ملیح آبادی نے پندرہ روزہ استقلال کی رسم رونمائی کے موقعے پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اس استدلال کے ساتھ کہ کسی بھی قوم کو اس کی مادری زبان سے محروم کرنے سے بڑا ظلم کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ آزاد ہندوستان میں یہ ظلم اہل اردو کے ساتھ کیا گیا اس کی وجہ سے ہندی بولنے والی ریاستوں میں اردو ختم ہونے کے قریب ہو چکی ہے۔ انھوں نے کہا کہ کسی کو مادری زبان سے محروم کرنا ایسا ہے۔ جیسا کسی بچے کی ماں کے دودھ سے محروم کردیا جائے۔ پندرہ روزہ استقلال کے رسم اجرا کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ندوہ العلما لکھنؤ کے شیخ الحدیث مولانا خالد ندوی غازی پوری نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'جدید خبر'، دہلی، 17 نومبر 2014

ہتوپدیش

نئی دھلی: دہلی یونیورسٹی کے شعبہ ہائے اردو، سنسکرت، فارسی، پنجابی اور عربی کی طرف سے منعقد سنسکرت کی مشہور کتاب ہتوپدیش کے ترجمہ کی تقریب رونمائی میں خطاب کرتے ہوئے پروفیسر ابن کنول، صدر شعبۂ اردو نے کہا کہ اردو میں ترجمہ کی روایت اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ خود اردو ہے۔ انھوں نے اردو میں ترجمہ کی روایت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر ارشاد نیازی کے ذریعے کیے گئے اس ترجمہ پر انھیں مبارکباد پیش کی۔ شعبۂ سنسکرت کے صدر پروفیسر رمیش بھاردواج نے ہتوپدیش کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ دنیا کی قدیم کتابوں میں سے ایک 'پنچ تنتر' کا اہم حصہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان ہی وہ ملک ہے جس نے بچوں کی تربیت کے لیے ادب کی تخلیق میں پہل کی ہے۔ پروفیسر چندر شیکھر نے ہتوپدیش کے ترجمہ پر ڈاکٹر ارشاد نیازی کو مبارکباد پیش کی۔ آخر میں ارشاد نیازی نے اپنی ترجمہ کی ہوئی کتاب پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہتوپدیش کا بنیادی موضوع اخلاقیات ہے جس کی ضرورت آج کے زمانے میں پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 نومبر 2014

غزل کے رنگ، میں ہوں شاعر، ریزہ ریزہ زندگی

نئی دھلی: غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین اولیا میں منعقدہ ایک تقریب میں استاد الشعراء وقار مانوی، ڈاکٹر جی آر کنول اور ڈاکٹر ظفر مرادآبادی کے شعری مجموعوں کا اجرا دیوناگری میں عمل میں آیا۔ وقار مانوی کی کتاب 'غزل کے رنگ' ڈاکٹر ظفر مرادآبادی کی کتاب 'میں ہوں شاعر'، اور ڈاکٹر جی آر کنول کے مجموعہ کلام 'ریزہ ریزہ زندگی' پر اظہار خیال کرتے ہوئے معروف شاعر شمس رمزی نے کہا کہ ڈاکٹر جی آر کنول وقار مانوی اور ڈاکٹر ظفر مرادآبادی تینوں شعرا کے کلام میں اسلوب و ادا کا تنوع، ندرت خیال، رومانیت اور گہرائی و گیرائی پائی جاتی ہے۔ ان شعرا سے نئی نسل کو استفادہ کرنے کا موقع ملے گا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 نومبر 2014

وفیات

تمنا امروہوی کا انتقال

امروھه: سینئر شاعر اصغر حسین عرف تمنا امروہوی والد اختر حسین ساکن محلہ دانش منداں کا مختصر علالت کے بعد دیر رات انتقال ہو گیا ان کی عمر 82 سال تھی۔ واضح ہو کہ تمنا امروہوی عالمی شہرت یافتہ شاعر جون ایلیا کے شاگرد تھے۔ نیز اردو پریس کلب امروہہ کی جانب سے سینئر شاعر تمنا امروہوی کے سانحہ ارتحال پر ایک تعزیتی جلسہ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت روزنامہ صحافت کے بیورو چیف ندیم نقوی نے فرمائی۔ نظامت کے فرائض شیبان قادری نے انجام دیے۔ جلسے میں مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 28 نومبر 2014

سابق ایڈوکیٹ جنرل سید محمد علی کاظمی کا انتقال

الہ آباد، لکھنؤ: سابق ایڈوکیٹ جنرل و سابق چیئرمین اقلیتی کمیشن الحاج ایس ایم اے کاظمی منگل کی دوپہر، ہتھگواں تھانہ حلقے کے بھدری چوراہے پر سڑک حادثے میں جاں بحق ہوگئے۔ الہ آباد میں مرحوم کی

تدفین بدھ کو صبح 9 بجے رسول پور قبرستان میں کی گئی۔ ایس ایم اے کاظمی کی حادثاتی موت سے علمی، ادبی و سیاسی حلقوں اور وکلا میں غم و اندوہ کی لہر دوڑ گئی۔ سماجوادی پارٹی کے سربراہ ملائم سنگھ یادو اور وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو سمیت متعدد سرکردہ شخصیات نے تعزیت کا اظہار کیا ہے۔ ریاستی حکومت کے ایڈیشنل ایڈوکیٹ جنرل ظفریاب جیلانی، سینئر وکیل محمد وسیم، مشتاق احمد صدیقی، سید کفیل احمد ایڈوکیٹ، دلشاد حسین ایڈوکیٹ، خلیق احمد خاں، ایچ اے علوی، محمد شمیم ایڈوکیٹ، سینئر سرکاری وکیل اخلاق رضوی ایڈوکیٹ، ایس ایچ ابراہیم، وثیق الدین، فاروق احمد، رحمت اللہ وغیرہ نے مرحوم کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے اہل خانہ سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ مرحوم نے اقلیتی کمیشن کے چیرمین کے عہدے پر رہتے ہوئے اقلیتی فلاح و بہبود کے لیے متعدد کام کیے۔ دوسری جانب ترقی پسند مصنفین، علامہ اقبال اکادمی الہ آباد، آل انڈیا ایسوسی ایشن آف عربک ٹیچرس اینڈ اسکالرس و دیگر تنظیموں کی جانب سے ان کی رحلت پر تعزیت پیش کی گئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 نومبر 2014

معروف شاعر حاصل سنبھلی کا انتقال

نئی دھلی: معروف شاعر حاصل سنبھلی کا 82 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ حاصل سنبھلی کا شمار دہلی اور خصوصاً مشرقی دہلی میں ادب کے معماروں میں کیا جاتا تھا وہ 1932 میں ضلع سنبھل کے محلہ کوٹ عربی میں پیدا ہوئے۔ وہ ہمیشہ غزل کے ساتھ نعت پاک ضرور کہتے تھے ان کے کئی مجموعہ کلام منظر عام پر آچکے ہیں جس میں نگار رحمت، بہار رحمت اور منزل بہ منزل خاصے مقبول ہوئے۔ انھیں اردو اکادمی اور دیگر ادبی تنظیموں کی جانب سے ایوارڈ بھی مل چکے تھے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 8 نومبر 2014

راشد علی شفا کا انتقال

نئی دھلی: عالمی شہرت یافتہ شاعر اقبال اشہر کے بڑے بھائی کہنہ مشق شاعر راشد علی شفا کا ان کی رہائش گاہ سبھاش محلہ موج پور میں انتقال ہوگیا جس سے حلقہ علم و ادب میں غم و اندوہ کی لہر دوڑ گئی۔ ان کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹی ہے۔ حلقہ علم و ادب سے وابستہ لوگوں میں منصور عثمانی، اسلم شمسی، معین شاداب، شمس رمزی، سرفراز احمد، فراز دہلوی، اسلم دہلوی، آفتاب آذر، رؤف رضا، منیر ہمدم، قاصر سہوانی، جاوید مشیری، امیر امروہوی، سیف سحری او دیگر شعرا نے تعزیت پیش کی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 نومبر 2014

طاہر حسین ماہر کا انتقال

مرادآباد: شہر جگر کے بزرگ کہنہ مشق شاعر طاہر حسین ماہر کا منگل کی صبح نئی بستی واقع رہائش گاہ پر حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ مرحوم تقریباً 80 سال کے تھے۔ ان کے دو مجموعہ کلام بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔ شاعر طاہر حسین ماہر بجلی محکمہ میں جونیئر انجینئر کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد مسلسل ادبی خدمات میں مصروف تھے۔ بزم قمر مرادآبادی سمیت کئی ادبی تنظیموں سے بھی وابستہ رہے۔ ان کے انتقال پر عمائدین شہر نے طاہر حسین ماہر کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا اور مرحوم کی مغفرت نیز جملہ اہل خانہ کے واسطے صبر جمیل کی دعا کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی 26 نومبر 2014

شاعر مقصود حسین کا انتقال

نگینہ: مشہور شاعر مقصود حسین مقصود کا حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 68 برس کے تھے۔ ان کے انتقال کی خبر سنتے ہی شہر میں رنج و غم کی لہر دوڑ گئی ان کے انتقال پر ممبر اسمبلی منوج پارس، چیئرمین شیخ خلیل الرحمٰن، سابق ممبر اسمبلی ستیش کمار گوتم، کانگریس کے ضلع صدر بابو ڈونگر سنگھ، وشہر صدر سردار گردیال سنگھ، ڈاکٹر محمد داؤد، ڈاکٹر احتشام تشنہ، ماسٹر ممتاز احمد، تنویر اختر، بہار الدین بہار، سنیل ساحل، پروفیسر محمد عرفان وغیرہ نے سخت رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 نومبر 2014

خراج عقیدت

بہادر شاہ ظفر کو خراج عقیدت

مجاہد آزادی اور مغل سلطنت کے آخری حکمراں بہادر شاہ ظفر کو ان کے 152 ویں یوم شہادت کے موقعے پر زبردست

خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اترپردیش کی راجدھانی لکھنؤ کانپور، بریلی، اعظم گڑھ اور جونپور سمیت پوری ریاست میں لوگوں نے جلسے جلوس کا انعقاد کر کے شہید بہادر شاہ ظفر کی تصاویر اور مجسموں پر گلپوشی کی۔ جونپور میں پنوارا علاقے کے سراوا گاؤں میں واقع لال بہادر گپت میموریل پر ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن آرمی اور لکشمی بائی بریگیڈ کے کارکنوں نے شہید میموریل پر موم بتی اور اگربتی جلائی اور دو منٹ کی خاموشی رکھ کر اپنا زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ بریگیڈ کی صدر منجیت کور نے کہا کہ انگریزوں نے مغل سلطنت کے آخری حکمراں اور عظیم مجاہد آزادی بہادر شاہ ظفر کو پہلے بہت اذیت دی، بعد ازاں انھیں گرفتار کر کے رنگون کی جیل میں بند کردیا گیا۔ جیل میں بھی ان پر مظالم ڈھائے گئے۔ انگریز افسر انھیں بات بات پر کوڑے لگاتے تھے۔ سات نومبر 1862 کو انھوں نے رنگون کی جیل میں آخری سانس لی۔ رنگون کی جیل میں ان کا میموریل بنائے جانے کا مطالبہ کیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 نومبر 2014

سکندر احمد کی یوم پیدائش پر تقریب کا انعقاد

شولاپور: معروف نقاد اور دانشور سکندر احمد کی یوم پیدائش کے موقعے پر ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی فاؤنڈیشن اور ایس ایس اے آرٹس اینڈ کامرس کالج شولاپور کے شعبہ اردو کے زیر اہتمام 24 نومبر 2014 کو ایک جلسہ بعنوان بیادِ سکندر احمد منعقد کیا گیا۔ پروگرام کی ابتدا میں صدر شعبہ اردو ڈاکٹر محمد شفیع چوبدار نے پروگرام کی غرض و غایت بیان کی۔ فاؤنڈیشن کے صدر سلطان اختر نے اپنے والہانہ جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس موقعے پر بطور مہمان انجمن ڈگری کالج بیجاپور کے پروفیسر ڈاکٹر علیم اللہ حسینی اپنے توسیعی خطبے میں سکندر احمد کی گراں قدر علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ سکندر احمد کے معاصرین میں ان کا ہم پلہ فکشن کا کوئی دوسرا نقاد نظر نہیں آتا۔ نظامت اور رسم شکریہ کے فرائض ڈاکٹر غوث احمد شیخ نے انجام دیے۔

بذریعہ ڈاک، سلطان اختر، شولاپور، 27 نومبر 2014

مولانا ابوالکلام آزاد کا 126واں یوم پیدائش

مولانا آزاد قومی ہنر اکادمی کا افتتاح

نئی دھلی: ملک کے پہلے مرکزی وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کے 125 ویں یوم پیدائش کے موقعے پر مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ نے اقلیتوں بالخصوص ملک کے مسلمانوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ ہنر سے جوڑنے کے لیے مولانا آزاد قومی ہنر اکادمی کا افتتاح کیا۔ نئی دہلی ریلوے اسٹیشن سے متصل کیمپس فورڈ روڈ پر واقع مولانا آزاد بھون میں منعقدہ افتتاحی تقریب کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر ہپت اللہ نے کہا کہ اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہے کہ وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ ہنر بھی سیکھیں تا کہ روزگار حاصل کرنے میں کسی قسم کی دشواری پیش نہ آئے۔

مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ مولانا آزاد قومی ہنر اکادمی کا افتتاح کرتے ہوئے

قبل ازیں ڈاکٹر ہپت اللہ نے مولانا آزاد کے 125 ویں یوم پیدائش پر منعقد ہونے والی تقریب کا مولانا آزاد کی قد آور تصویر کی نقاب کشائی کرتے ہوئے افتتاح کیا اور گل ہائے عقیدت پیش کیے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد شروع سے اس بات کے قائل تھے کہ نوجوانوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ ہنر بھی سیکھنا چاہیے تا کہ انھیں روزگار حاصل کرنے کے لیے دشواری پیش نہ آئے۔ ڈاکٹر ہپت اللہ نے کہا کہ ہم تعلیم نسواں پر بھی کام کر رہے ہیں اور اقلیتی طبقہ سے تعلق رکھنے والی لڑکیاں جو کسی وجہ سے ڈراپ آؤٹ کر جاتی ہیں یعنی درمیان میں تعلیم چھوڑ دیتی ہیں انھیں روکنے پر کام کیا جا رہا ہے۔ تقریب میں قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات کے رکن اور معروف صحافی ظفر آغا، قومی شعبہ لسانیات کے چیئرمین پروفیسر اختر الواسع، نواڈکو کے ڈائریکٹر ڈاکٹر بدرالدین وغیرہ نے بھی شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 نومبر 2014

یومِ تعلیم پر صدرِ جمہوریہ کا خراجِ عقیدت

نئی دھلی: صدر جمہوریہ مسٹر پرنب مکھرجی نے مولانا ابوالکلام آزاد کی سالگرہ کے موقعے پر وگیان بھون میں تعلیم کے قومی دن کی تقریبات میں شرکت کی جس کا اہتمام انسانی وسائل کے فروغ کی وزارت نے کیا تھا۔ اس موقعے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے صدر جمہوریہ نے کہا کہ تعلیم کا قومی دن تقریب کا ایک ایسا دن ہے جب مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش کی سالگرہ منائی جاتی

ہے۔ ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا آزاد، آزاد ہندوستان میں تعلیم کے زبردست علمبردار تھے۔ وزیر تعلیم کی حیثیت سے ان کے سامنے تعلیمی نظام کو ایک قومی جذبے کے طور پر فروغ دینے کا زبردست چیلنج تھا جو کہ نوآبادیاتی نظام سے دور تھا۔ انھوں نے ایک نظام کا آغاز کیا، تا کہ تعلیم کے نصاب میں ایک قومی اپروچ اور انکوائری کے جذبے کو دل میں اتارا جا سکے۔ صدر جمہوریہ نے مولانا آزاد کو ایک ادارے کا معمار بتایا اور کہا کہ یونیورسٹی کی گرانٹس کمیشن انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی اور دیگر ادارے اپنی اصلیت کے لیے ان کی انتھک کوششوں کے تئیں ان کے احسان مند ہیں۔ ہندوستان میں سماجی مذہبی اور ثقافتی بین رشتے قائم کرنے کے لیے انھوں نے للت کلا اکادمی، سنگیت ناٹک اکادمی اور ساہتیہ اکادمی قائم کی۔ صدر جمہوریہ نے کہا کہ یہ تعلیم ہے کہ جس کی بدولت ترقی حاصل کی جا سکتی ہے۔ صدر جمہوریہ نے کہا کہ حالیہ دور میں تعلیم پر ہمارے اخراجات میں اضافہ ہوا ہے۔ مولانا آزاد کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اسکول ایسی تجربہ گاہیں ہیں جو ایک مملکت میں مستقبل کے شہری پیدا کرتی ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 نومبر 2014

مولانا آزاد کے مزار پر فاتحہ خوانی

نئی دھلی: امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ کے 126 ویں یوم پیدائش کے موقعے پر شاہجہانی جامع مسجد کے زیر سایہ

ان کے مزار پر فاتحہ خوانی کی تقریب منعقد کی گئی۔ علی الصباح معمول کے مطابق مولانا آزاد کے ذریعے قائم کردہ آئی سی سی آر نے ایک تقریب کا انعقاد کیا، جس میں اہم شخصیات نے مولانا آزاد کے افکار و خیالات پر نظر ثانی کی معروف شخصیات میں آئی سی سی آر کے ڈائرکٹر ستیش مہتا بھی موجود تھے۔ اس موقعے پر فیروز بخت احمد نے کہا کہ یہ افسوس کا مقام ہے کہ مولانا آزاد کو وہ مقام نہیں دیا گیا، جس کے وہ مستحق تھے۔ یونیورسٹی گرانٹ کمیشن اور کئی یونیورسٹیوں کی مولانا نے داغ بیل ڈالی مگر افسوس کا مقام ہے کہ انھیں کسی سازش کے تحت بھلا دیا گیا ہے۔ آج ان کی قربانیوں کو یاد کرنے والا کوئی بھی نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ مولانا ہی تھے کہ جنھوں نے ملک کو ہندو مسلم اتحاد کا ورثہ دیا کیونکہ ان کے ضمیر کے مطابق ہندوستان کی آزادی سے زیادہ ہندو مسلم اتحاد انھیں زیادہ عزیز تھا۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 نومبر 2014

مرکزی وزارت برائے اقلیتی امور کی جانب سے مولانا آزاد قومی ہنر اکادمی کے پہلے تربیتی پروگرام کے باقاعدہ آغاز کا ایک منظر

قومی ہنر اکادمی کے پہلے تربیتی پروگرام کا آغاز

نئی دہلی: ملک کے پہلے وزیر تعلیم اور معروف صحافی مولانا ابوالکلام آزاد کے 125 ویں یوم پیدائش کے موقعے پر مرکزی وزارت برائے اقلیتی امور کی جانب سے مولانا آزاد قومی ہنر اکادمی کے پہلے تربیتی پروگرام کا باقاعدہ آغاز کیا گیا اور اس میں داخلہ لینے والے بچوں کو داخلہ کارڈ تقسیم کیے گئے۔ واضح رہے کہ گزشتہ روز قومی ہنر اکادمی کی عمارت کا افتتاح عمل میں آیا تھا۔ اس تقریب میں مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل اسمرتی ایرانی، مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ، مرکزی وزیر برائے سماجی فلاح و بہبود تھاور چند گہلوت، وزیر مملکت برائے اقلیتی امور مختار عباس نقوی کے علاوہ وزارت کے سکریٹریز اور عہدیداران نے شرکت کی۔ قبل ازیں قومی کمیشن برائے اقلیتی لسانیات کے کمشنر اور معروف اسکالر پروفیسر اختر الواسع نے مولانا آزاد کی حیات اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی جبکہ استقبالیہ خطبہ ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ نے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے اقلیتی بچوں کو ہنر بھی دینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں خوشی ہے کہ آج اس کی شرعات ہوگئی ہے۔ ہنرمند نوجوانوں کو کارخانہ لگانے اور کاروبار شروع کرنے کے لیے قرض دینے کی بھی اسکیم رکھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ پہلے ایک لاکھ روپے کی قید تھی کہ جن کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ ہوگی صرف انھیں کو قرض دیا جائے گا لیکن اب اس کو بڑھا کر 6 لاکھ روپے سالانہ آمدنی والوں کو بھی قرض دینے کا اعلان کیا گیا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ فائدہ اٹھا سکیں۔ انھوں نے کہا کہ اس سے تقریباً 12 سے 13 کروڑ اقلیتی طبقے کے لوگ فائدہ اٹھا سکیں گے۔

محترمہ اسمرتی ایرانی نے کہا کہ 8 ویں کلاس میں جاکر جو ڈراپ آؤٹ ہوتا تھا اب وہ نہیں ہوگا کہ کیونکہ ہم نے گریجویشن تک مفت تعلیم کا اہتمام و انتظام کردیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے وہ پروگرام بنایا ہے جہاں علم ڈگری کی محتاج نہیں ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے کریڈٹ ٹرانسفر پروگرام بھی شروع کردیا ہے جس سے نوجوانوں کو فائدہ ہوگا۔ تھاور چند گہلوت نے کہا کہ مولانا آزاد کے یوم پیدائش پر شروع کیے گئے ہنر پروگرام کو ہمارا پورا تعاون رہے گا۔ مختار عباس نقوی نے کہا کہ اقلیتوں کے تعلق سے جو بھی پروگرام ہیں ان کو زمین تک پہنچانا ہماری ذمے داری ہے۔ انھوں نے کہا کہ اکثر اسکیمیں کاغذوں تک محدود رہ جاتی ہیں لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 نومبر 2014

اقلیتی اساتذہ کا سہ روزہ ورکشاپ

نئی دہلی: ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کے لیے سب سے اچھا خراج عقیدت یہ ہے کہ ان کی تعلیمی تحریک کو آگے بڑھایا جائے اور تعلیمی معیار بلند کرنے کی طرف خصوصی توجہ دی جائے، معاشرہ کی نشو ونما اور ترقی میں مدرس (ٹیچر) کا رول ریڑھ کی ہڈی کے مانند ہوتا ہے، لیکن آج استاذ اور شاگرد کے درمیان رشتہ ختم ہورہا ہے۔ ان خیالات کا اظہار اقلیتی تعلیمی اداروں کے اساتذہ کے سہ روزہ ورکشاپ کی اختتامی تقریب میں کیا گیا۔ ورکشاپ آل انڈیا کنفیڈریشن فار ویمن امپاورمنٹ تھرو ایجوکیشن نے اقلیتی تعلیمی کمیشن کی کمیٹی برائے تعلیم نسواں کے اشتراک سے منعقد کی۔ اس موقعے پر کنفیڈریشن کی صدر ڈاکٹر شبستاں غفار نے اعلان کیا کہ وہ ایک سال کے عرصے میں ملک بھر کے اقلیتی اداروں کے پانچ ہزار اساتذہ کو تربیت دے گی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 نومبر 2014

یومِ تعلیم کی تقریبات

کرنول:

حیدرآباد: بزم اردو کرنول کی جانب سے ڈاکٹر عبدالحق ایڈیڈ یو پی اسکول کرنول میں یوم قومی تعلیم کا انعقاد عمل میں لایا گیا۔ مہمان خصوصی مدیر بزم آئینہ جاوید اقبال جامعی تھے۔ پروگرام کی صدارت بزم اردو کرنول کے صدر فاروق بادشاہ نے انجام دی۔ جاوید اقبال نے بتایا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے قرآن کا کافی تفصیلی جائزہ لینے کے بعد علم کی اہمیت کو سمجھا اور وہ اپنی پوری زندگی علم کی ترقی کے لیے وقف کر بیٹھے۔ آج کل لوگ مولانا آزاد کو صرف مجاہد آزادی یا پھر پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اقبال نے طلبہ کو تاکید کی کہ وہ مولانا آزاد کی زندگی کو مشعلِ راہ بنائیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 12 نومبر 2014

دیگلور:

دیگلور: مولانا ابوالکلام آزاد ہائی اسکول و جونیر کالج دیگلور میں مولانا ابوالکلام آزادؔ کے یوم پیدائش پر 'یوم تعلیم' کے جلسے میں شیخ محمد، پرنسپل قاضی سید انصار علی، سید محسن علی ایڈوکیٹ، ڈاکٹر شیخ زبیر احمد صدر شعبہ اردو دیگلور کالج، محمد جیلانی ادارہ رکن اور حافظ شیخ ابراہیم خطیب نے شرکت کی۔ قاضی سید انصار علی ارمان پرنسپل و جوائنٹ سکریٹری نے یوم تعلیم کے موقعے پر طلبا و طالبات کو علم کی افادیت سے روشناس کراتے ہوئے کہا کہ موجودہ دور مسابقتی ہے۔ مولانا آزاد کی زندگی میں مصائب اور مسائل بہت آئے مگر انھوں نے کبھی ہمت نہیں ہاری۔ ڈاکٹر زبیر احمد نے مولانا ابوالکلام آزادؔ کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک جید عالم دین ہونے کے ساتھ مدبر سیاست داں بھی تھے۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 12 نومبر 2014

محبوب نگر:

محبوب نگر: مولانا آزاد تعلیم کو انسانی ترقی کی بنیاد سمجھتے تھے۔ انھوں نے بحیثیت وزیر تعلیم ملک کے ہر فرد کو صد فیصد تعلیم یافتہ بنانے کے لیے منصوبہ بندی کی اور لائحہ عمل بنایا۔ یو جی سی کی تشکیل ہوئی اور تعلیمی اداروں کو جدید ٹکنالوجی سے آراستہ کیا گیا جس سے آج ہمارا ملک ترقی کی سمت گامزن ہے ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر جی یادگیری پرنسپل ایم وی ایس ڈگری کالج محبوب نگر نے کہا کہ ہندوستان میں تعلیم کے میدان میں سمت و معیار کو متعین کرنے میں مولانا کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ آج ہندوستان میں تعلیم کا جو معیار ہمیں نظر آتا ہے وہ روشن دماغ اور وسیع النظر وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام کی ہی دین ہے۔ محمد وزیر نائب پرنسپل ایم وی ایس کالج نے بھی خراج عقیدت پیش کیا۔ روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 13 نومبر 2014

مولانا ابوالکلام آزاد اردو یونیورسٹی میں 'آزاد فورم' کے قیام کا منظر

اردو یونیورسٹی میں 'آزاد فورم' کا قیام

حیدر آباد: 20 نومبر مولانا ابوالکلام آزاد نہ صرف ایک ممتاز مجاہد آزادی، جید عالم دین، شعلہ بیان خطیب، بے باک صحافی اور بے بدل انشا پرداز تھے، بلکہ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں ان جیسے قد و قامت کا حامل کوئی اور وزیر تعلیم ملنا شاید ممکن نہیں۔ پروفیسر حمید خان، مولانا ابوالکلام آزاد چیئر، بابا صاحب امبیڈکر یونیورسٹی، اورنگ آباد نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں مولانا آزاد فورم برائے تخلیقی فکر کے افتتاحی اجلاس میں بحیثیت مہمانِ خصوصی اپنے خطاب میں ان خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر خواجہ محمد شاہد، نائب شیخ الجامعہ نے صدارت کی۔ افتتاحی اجلاس سنٹرل لائبریری آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔ جناب اے کے موہنتی، آئی پی ایس، مشیر گورنر تلنگانہ مہمانِ اعزازی مولانا ابوالکلام آزاد چیئر (مانو) نے طلبہ میں تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کی خاطر یہ فورم قائم کیا ہے۔ ڈاکٹر خواجہ شاہد، پرووائس چانسلر نے اپنی صدارتی تقریر میں طلبہ کو مشورہ دیا کہ وہ اس فورم سے استفادہ کرتے ہوئے آزادانہ فکر کو رواج دیں۔ فکر و عمل کے غیر روایتی انداز کو اپنانے کی وکالت کرتے ہوئے انھوں نے توقع ظاہر کی یہ فورم طلبہ کو ایک 'آزاد' راستہ دکھائے گا۔ پروفیسر آمنہ کشور، پروفیسر مولانا آزاد چیئر نے مہمانوں کا تعارف کروایا اور فورم کے 'لوگو' کی تیاری کے لیے مقابلے کا اعلان بھی کیا۔ میر ایوب علی خان، سینئر کنسلٹنٹ آزاد چیئر نے اپنی تقریر میں آزاد فورم کے قیام کو آزاد چیئر کے ایک اہم مقصد کی تکمیل سے تعبیر کیا۔

پریس ریلیز، عابد عبدالواسع، مانو، حیدر آباد، 20 نومبر 2014

لکھنؤ میں اگنو کی تعلیمی بیداری ریلی

لکھنؤ: ملک کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش کے موقعے پر اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، اگنو کے علاقائی مرکز لکھنؤ کے زیر اہتمام لکھنؤ میں متعدد تعلیمی بیداری پروگراموں کا انعقاد کیا گیا۔ اگنو کی جانب سے ڈی اے وی پی جی کالج میں طلبا کے اسکل ڈیولپمنٹ اور روزگار پر مبنی پروگراموں پر ایک مذاکرہ کا انعقاد کیا گیا۔ اس میں تقریباً 250 طلبہ و طالبات نے حصہ لیا۔ اس مذاکرہ کے توسط سے طلبا کو اپنے تعلیمی سطح میں اضافہ کرنے اور علمی اقدار کی اہمیت پر تفصیل سے غور کیا گیا۔ اس موقعے پر ایک تعلیمی بیداری مہم کا انعقاد کیا گیا۔ یہاں سب سے پہلے ایک ریلی نکالی، گئی جس میں تعلیم سے متعلق نعرے جیسے خوشبو ہو ہر پھول میں، ہر بچہ ہو اسکول میں، تعلیم سے ہے بہتر کل، پڑھیں پڑھائیں اور بنیں ماہر، تعلیم سب کا حق ہے، تعلیم سے کامیاب ہے دنیا، کو بلند آواز سے کہتے ہوئے مشعلی ٹولہ کی ہر گلی میں بیداری ریلی نے پھیری لگائی۔ اگنو علاقائی مرکز کی ڈائریکٹر ڈاکٹر منور ما سنگھ نے مقامی لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تعلیم ایسی وراثت ہے جس سے کئی نسلوں کی فلاح ہو جاتی ہے۔ اس پروگرام میں معاون رجسٹرار محمد رئیس صدیقی، وصی احمد، ارون برووا، اروند مشرا اور اگنو کے دیگر اہلکار موجود تھے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 12 نومبر 2014

مولانا آزاد کی یوم پیدائش کا اہتمام

سہارنپور: ہند گرلز انٹر کالج میں مولانا ابوالکلام آزاد کے 126 ویں یوم پیدائش پر سماجی تنظیم پرچم کے زیر اہتمام پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں کالج کی پرنسپل ڈاکٹر قدسیہ انجم نے مولانا ابوالکلام آزاد کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ مولانا آزاد ملک کے ایسے واحد بڑے لیڈر رہے تھے جو آخری دم تک دو قومی نظریے اور ملک کی تقسیم کے شدید مخالف تھے اور دو قومی نظریے اور ملک کی تقسیم کو وہ مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ نقصاندہ مانتے تھے۔ کالج کی منتظمہ اور پروگرام کے صدر ڈاکٹر ہری پرکاش شرما نے کہا کہ ملک کے لیے مولانا آزاد کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ بعد از مرگ حکومت ہند نے ان کو بھارت رتن کا اعزاز دے کر ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 نومبر 2014

علی گڑھ میں مولانا آزاد یادگاری خطبہ

علی گڑھ: ہندوستان کے اولین وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کے یومِ پیدائش پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تعلیمات کے زیر اہتمام 'قومی یومِ تعلیم' کے موقعے پر مولانا ابوالکلام آزاد یادگار خطبہ پیش کرتے ہوئے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے اسکول آف انٹرنیشنل اسٹڈیز کے پروفیسر سلیم قدوائی نے کہا کہ ملک کی آزادی

کے بعد ہندوستان کے اولین وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کی قیادت میں مولانا آزاد نے جدید ہندوستان کے لیے ایسی تعلیمی پالیسی مرتب کی جو ہندوستان کو مستحکم ملک بنانے میں معاون ثابت ہوئی۔ پرووائس اچانسلر بریگیڈیئر ایس احمد علی (ریٹائرڈ) نے کہا کہ تعلیم کے ذریعے قومی ترقی کے ساتھ عالمی سطح پر ہندوستان کو خودکفیل بنانے میں مولانا آزاد کا اہم رول ہے۔ شعبۂ تعلیم کی سربراہ پروفیسر سنیتا شرما نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا، ڈاکٹر سلمٰی قریشی نے خیر مقدم کیا۔ نظامت ڈاکٹر انیس بانو نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 نومبر 2014

گورکھپور میں جلسہ

گورکھپور: مولانا آزاد عربی، فارسی اور اردو کے بڑے عالم تھے پھر بھی قومی اور بین الاقوامی ضرورتوں کے پیش نظر وہ چاہتے تھے کہ انگریزی زبان بھی سیکھی جائے۔ مولانا آزاد کے یوم پیدائش کے موقعے پر ساجد علی میموریل کمیٹی کے زیر اہتمام منعقد ایک میٹنگ میں کمیٹی کے سرپرست محمد حامد علی نے اپنی صدارتی تقریر میں یہ بات کہی۔ سکریٹری محبوب سعید حارث پر افسانہ نگار آصف سعید اور سنتوش کمار چودھری کے علاوہ دوسرے شرکا نے بھی اظہارِ خیال کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 13 نومبر 2014

پریم چند رنگ شالہ میں یوم آزاد کے انعقاد کا منظر

مانو لکھنؤ کیمپس میں آزاد ڈے

لکھنؤ: اس وقت ہمارے سامنے سب سے بڑا چیلنج مولانا آزاد کے تصورات کو وقت کے سانچے میں ڈھالنا ہوگا۔ مولانا کی عبقریت یہ تھی کہ انھوں نے اپنی چشم بصیرت مستقبل کے جو اندازے قائم کیے وہ سچ ثابت ہوئے۔ ان خیالات کا اظہار مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے لکھنؤ کیمپس میں منعقد آزاد ڈے تقریب کے دوران معروف صحافی اور ادیب عابد سہیل نے صدارتی خطاب کے دوران کیا۔ ڈاکٹر وسیم بیگم نے مہمانوں کا خیرمقدم کیا۔ دانش اقبال نے تلاوت کی اور محمد حسن نے کلمات تشکر ادا کیے۔ عابد سہیل، ڈاکٹر وسیم بیگم اور کیمپس کے اساتذہ نے پروگرام اور مضمون نویسی میں حصہ لینے والے طلبہ کو سرٹیفکیٹ سے نوازا۔ عابد سہیل نے کہا کہ طلبہ کی صلاحیتیں قابل تعریف ہیں۔ انھوں نے مقالہ اور تقریر کرنے والے طلبہ کی حوصلہ افزائی اور ستائش کی۔ عابد سہیل نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کو مشورہ دیا کہ وہ دارالترجمہ کے طرز پر اصلاح سازی کے کام کو آگے بڑھائیں اور اسے صرف اردو تک محدود نہ رکھیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 13 نومبر 2014

بہار اردو اکادمی کی علمی تقریب

پٹنہ: بہار اردو اکادمی کے وسیع و عریض سیمینار ہال میں مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم ولادت کی مناسبت سے ایک شاندار علمی تقریب کا انعقاد ہوا۔ تعلیم کی اہمیت و افادیت اور مولانا آزاد کے افکار کی معنویت پر منعقدہ اس تقریب کی صدارت پروفیسر علیم اللہ حالی نے کی۔ سکریٹری اکادمی امتیاز احمد کریمی نے مولانا آزاد کی شخصیت وسوانح کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی۔
فخرالدین عارفی نے مولانا آزاد کو قومی یک جہتی کا علمبردار بتایا۔ اشرف استھانوی نے مولانا کو مساوات کا داعی اور عظیم محب وطن قرار دیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 12 نومبر 2014

کولکاتا میں یوم تعلیم

مانو ریجنل سینٹر کولکاتا میں 11 نومبر 2014 'قومی یوم تعلیم' کے موقعے پر منعقدہ تقریب کی صدارت ڈاکٹر امام اعظم نے اور نظامت شاہد اقبال نے کی۔ ڈاکٹر عرش منیر نے کہا کہ اردو یونیورسٹی سے مولانا آزاد کا نام جڑنا اس یونیورسٹی کے لیے فال نیک ہے۔ ڈاکٹر نسیم احمد (مدیر پندرہ روزہ 'دیار حبیب') اور مبصر مشتاق احمد حامی نے مولانا کے کردار پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر امام اعظم نے امام الہند کو خراج عقیدت کے طور پر چند قطعات پیش کیے۔ شاہد اقبال کے کلمات تشکر کے ساتھ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔ دیگر شرکا میں راحیل شاداب اور محمد اشتیاق (اسٹاف ریجنل سینٹر) موجود تھے۔

پریس ریلیز، امام اعظم، مانو ریجنل سینٹر کولکاتا، 30 نومبر 2014

پریم چند رنگ شالہ میں یوم آزاد

پٹنہ: پریم چند رنگ شالا میں منعقد 'مولانا ابوالکلام آزاد کی معنویت' کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ پروفیسر ارون کنول نے مذکورہ باتیں کہیں۔ انھوں نے یہ بات بھی تسلیم کی کہ اس ملک میں اقلیتوں کو بڑے کرب سے گزرنا پڑا ہے اور انھیں نامساعد حالات کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ اس موقعے پر آلوک دھنوا نے کہا کہ وہ ایک بڑے قائد، صحافی، ادیب اور دانشور تھے اور بڑے ہی دور اندیش تھے۔ انھوں نے تقسیم ہند کو روکنے کی بھرپور کوشش کی اور وہ ہندو مسلم اتحاد کے بھی زبردست حامی تھے۔ گاندھی سنگرہالیہ کے ڈائریکٹر اور گاندھی وادی رضی احمد نے کہا کہ مولانا آزاد اگر زندہ ہوتے تو موجودہ حالات کو دیکھ کر بے حد صدمہ ہوتا کہ ہندوستان عدم تشدد اور فاقہ کشی کے میدان میں صف اول میں کھڑا ہے۔ امتیاز احمد، ڈاکٹر قاسم خورشید، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، ڈاکٹر جاوید حیات، ڈاکٹر محمد فاروق انصاری، ڈاکٹر رام وچن رائے نے بھی خطاب کیا۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 12 نومبر 2014

اگنو میں جشن یوم تعلیم

نئی دہلی: قومی یوم تعلیم کے موقعے پر اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی میں بھی مولانا آزاد کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔ اگنو کے ریجنل سینٹر موہن کو آپریٹو میں جشن یوم تعلیم کا انعقاد ہوا۔ ڈائرکٹر ڈاکٹر سنجیو پانڈے نے یوم تعلیم کی اہمیت اور مولانا آزاد کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ موجودہ نظام تعلیم کی بنیاد مولانا آزاد ہی نے رکھی تھی۔ انھوں نے ہی آئی آئی ٹی بنایا، یو جی سی کا قائم کیا، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس میں وہ شامل رہے جبکہ دہلی یونیورسٹی کی فیکلٹی آف ایجوکیشن بھی انھوں نے ہی بنائی تھی۔ سنجیو پانڈے نے بتایا مولانا آزاد چاہتے تھے کہ سب کو تعلیم کے مواقع حاصل ہوں۔

روزنامہ 'خبریں'، دہلی، 12 نومبر 2014

مانو میں دوڑ برائے تعلیم اردو

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے زیراہتمام مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش تقاریب کے ایک حصہ کے طور پر ایک منفرد 'دوڑ برائے تعلیم و اردو' کا اہتمام کیا گیا۔ مولانا آزاد چیئر اور شعبۂ مینجمنٹ و کامرس کی زیر نگرانی منعقدہ دوڑ کا آغاز بائیو ڈائیورسٹی پارک (پکی باؤلی) میں صبح 7:15 بجے ہوا۔ ممتاز کرکٹر وی وی ایس لکشمن اور سینئر پولیس آفیسر عبدالقیوم خان نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ پروفیسر محمد میاں نے جھنڈی دکھا کر دوڑ کا افتتاح کیا۔ وی وی ایس لکشمن اور جناب اے کے خان مشعل تھامے کچھ دور تک طلبہ کے ساتھ دوڑ میں شامل رہے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد شاہد، پرووائس چانسلر اور پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ، رجسٹرار بھی اس موقعے پر موجود تھے۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 10 نومبر 2014

مولانا ابوالکلام آزاد اور ہندوستان

محمود آباد: مولانا آزاد، پنڈت جواہر لعل نہرو، مہاتما گاندھی کبھی نہیں چاہتے تھے کہ ملک تقسیم ہو، لیکن ملک تقسیم ہوا اور نقصان ہوا، اگر ملک تقسیم نہ ہوتا تو اور طاقتور ہوتا۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر رمیش دکشت سابق پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی نے کیا۔ وہ مولانا آزاد انسٹی ٹیوٹ آف ہیومنٹیز سائنس اینڈ ٹکنالوجی کے ہال میں 'مولانا ابوالکلام آزاد اور آزاد ہندوستان' کے عنوان سے منعقد سیمینار سے بحیثیت صدر خطاب کر رہے تھے۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے

'مولانا آزاد کی وراثت کی بازیافت' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کا منظر

سابق پروفیسر ڈاکٹر شارب ردولوی نے کہا کہ مولانا آزاد عظیم شخصیت کے مالک تھے، مولانا نے تعلیمی ٹکنالوجی اور سائنس کے فروغ میں جو خدمات انجام دی ہیں ان کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ سیمینار کی صدارت ڈاکٹر رمیش دکشت سابق پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی، بطور مہمانِ خصوصی، ڈاکٹر انیس انصاری سابق وائس چانسلر خواجہ معین الدین یونیورسٹی لکھنؤ، بطور مہمانِ اعزازی شارب ردولوی، سینئر صحافی پردیپ کپور، ڈاکٹر عارف نقوی، پروفیسر برلن یونیورسٹی نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5 دسمبر 2014

'مولانا آزاد کی وراثت کی بازیافت'

نئی دہلی: علم و آگہی، تاریخ، ثقافت اور اقلیتی مطالعات کے شعبے میں فعال قومی سطح کی تنظیم 'ایس ویژن' نے مولانا ابوالکلام آزاد کے 125ویں یوم ولادت پر 23 نومبر 2014 کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر، نئی دہلی میں 'وزارتِ ثقافت، حکومت ہند' کے تعاون سے 'مولانا ابوالکلام آزاد کی وراثت کی بازیافت' کے عنوان سے یک روزہ قومی سیمینار کا انعقاد کیا۔ سیمینار کا آغاز ایس ویژن کی صدر اور روح رواں ڈاکٹر مہر فاطمہ حسین کے تعارفی کلمات کے ساتھ ہوا، جس میں انھوں نے موضوع کی فکری اور عصری اہمیت کی جانب اشارہ کیا۔

معروف تاریخ داں اور دانشور پروفیسر ایس عرفان حبیب نے افتتاحی سیشن کی صدارت کی اور مولانا آزاد کو عصری معنویت کا حامل دانشور بتایا اور کہا کہ مولانا آزاد کو سیاسی لیڈر کہنے کے بجائے انھیں جوش اور جذبہ فراہم کرنے والا لیڈر کہنا بہتر ہوگا، جن کی تحریروں کی معنویت ہنوز برقرار ہے۔ سابق چیرمین نیشنل اقلیتی کمیشن اور ملک کے پہلے چیف انفارمیشن کمشنر مہمانِ خصوصی جناب وجاہت حبیب اللہ نے رام گڑھ سیشن میں مولانا آزاد کی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے تقریر کے مشمولات کو صحیح معنوں میں مولانا آزاد کی متمول وراثت سے تعبیر کیا۔ سیمینار میں مہمانِ ذی وقار کی حیثیت سے معروف گاندھیائی فکر کے حامل جناب انیل نوریا نے کہا کہ بہت کم عمری ہی میں مولانا آزاد قومی لیڈروں کی صف میں پہنچ چکے تھے۔ لیکن مولانا کو کانگریس میں ہمیشہ بڑے لیڈروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ مہمانِ ذی وقار ڈاکٹر زویا زیدی نے تسلیم کیا کہ ہمارے خاندان کی سیکولر فکر دراصل مولانا آزاد کی دین ہے۔ یہی سبب ہے کہ 1947 میں ہمارا خاندان ہندستان میں ہی رہا۔ انھوں نے مولانا آزاد کی شہرۂ آفاق تصنیف 'غبارِ خاطر' کے حوالے سے گفتگو بھی کی۔ جبکہ پروفیسر رضوان قیصر نے کلیدی خطبہ پڑھا، جس میں موصوف نے مولانا پر اپنے تحقیقی کام کا حوالہ دیتے ہوئے مولانا کی زندگی کے کئی پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ افتتاحی سیشن کے بعد پہلے سیشن کی صدارت پروفیسر سید عزیز الدین حسین اور پروفیسر شافع قدوائی نے کی۔ اس سیشن میں جناب شبیہ احمد (اڈوائزر مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن)، ڈاکٹر حسن امام، ڈاکٹر پرویز نذیر، ڈاکٹر اِتی بہادر اور جناب الیاس حسین نے مقالے پیش کیے۔ مقالہ نگاروں نے مولانا آزاد کی متنوع شخصیت پر تفصیلی گفتگو کی اور مولانا آزاد کے افکار کی عصری ناگزیت کا خلاصہ کیا۔

لنچ کے وقفے کے بعد دوسرے سیشن میں ڈاکٹر رضا حیدر، ڈاکٹر مشتاق صدف، جناب فرید احمد، جناب ذاکر حسین اور ڈاکٹر اخلاق آہن نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ یہ مقالے سلیل مشرا اور پروفیسر اسلم اصلاحی کی صدارت میں پڑھے گئے، جنھوں نے پیش کردہ مقالوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے موضوع کی معنویت پر بلیغ اشارے کیے۔

سیمینار کے تیسرے اور آخری سیشن کی صدارت ڈاکٹر ایم۔ انصار الحق نے فرمائی۔ آخری سیشن میں مقالہ نگار کی حیثیت سے ڈاکٹر اشتیاق احمد، ڈاکٹر ایم۔ سلیم، ڈاکٹر نازیہ خان، ڈاکٹر نوید جمال اور محترمہ مسرت نے مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی 24 نومبر 2014

انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں دستاویزی فلم کی نمائش

نئی دہلی: معمارِ قوم مولانا ابوالکلام آزاد کو ان کی 126 ویں یوم پیدائش کے موقعے پر خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے اسلامک کلچرل سینٹر میں ڈاکیو فلم، عاشق وطن: مولانا ابوالکلام آزاد کی نمائش کے موقعے پر خیر مقدمی کلمات ادا کرتے ہوئے فلم کی ہدایت کار ڈاکٹر لولین تھدانی نے کہا کہ مولا ناابوالکلام آزاد نے اپنی پوری زندگی ملک کی آزادی اور ترقی کے لیے نچھاور کردی۔ عاشق وطن مولانا آزاد ڈاکیومینٹری فلم بھی ایک چھوٹی سی کوشش ہے۔ مولانا کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے انھوں نے کہا کہ ان کے بیٹے کرمنئے نے انھیں ترغیب دی کہ سبھی مجاہدین آزادی پر ڈاکیومینٹری فلم ہے مگر مولانا آزاد کی حیات و خدمات پر نہیں ہے۔ اس لیے مولانا آزاد کی زندگی، آزادی اور ملک کی خدمات کے لیے سب کچھ قربان کرنے والے عظیم مجاہد پر فلم بننے کے لیے ریسرچ کیا گیا۔ جس میں سابق وزیر عارف خان، دانشور فیروز بخت احمد، آئی سی سی آر کے ڈپٹی ڈائریکٹر انور جلیل وغیرہ کے مولانا آزاد پر انٹرویو شامل ہیں۔ فلم میں ٹیگور انٹرنیشنل اسکول کے طلبہ و طالبات نے مولانا آزاد، نہرو، گاندھی، پٹیل آصف علی وغیرہ کا رول کیا ہے۔ فلم کی نمائش میں ڈاکٹر کرن بیدی، سابق وزیر اشونی کمار، مہاتما گاندھی کی پوتی تارہ بٹ گاندھی، انڈیا اسلامک کلچرل سینٹرل کے صدر سراج الدین قریشی، نائب صدر صفدر ایچ خان سمیت سرکردہ شخصیات نے شرکت کی۔

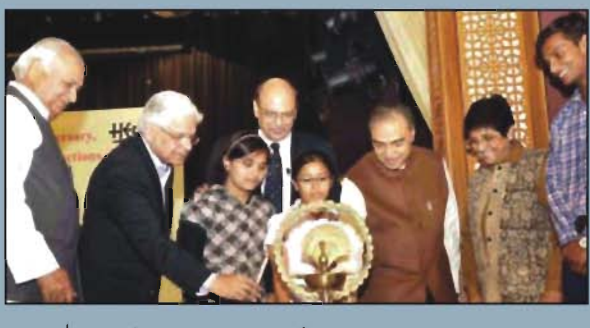

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 17 نومبر 2014

علامہ شبلی کا 100 واں یومِ وفات

دارالمصنّفین شبلی اکادمی میں صد سالہ تقریب

اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکادمی کی صد سالہ تقریب کے موقعے پر نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری نے بطور مہمان خصوصی بین الاقوامی سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے

کہا کہ دارالمصنفین ہماری وراثت کا اہم حصہ ہے، مسلمان اس کی حفاظت کریں۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت کا تقاضہ ہے کہ یہ ادارہ علم و دانش کے موتی بکھیرنے کے ساتھ ساتھ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے مناسب رہنمائی بھی کرے۔ نائب صدر حامد انصاری نے کہا کہ مولانا شبلی نعمانیؒ ایک قاموسی اور عبقری شخصیت تھے جو ایک ایسے عہد میں علم و ادب کے منظرنامے پر رونما ہوئے جو مسلمانانِ ہند کے لیے ایک نازک اور تغیر پذیر عہد تھا۔ ان کی زندگی، ان کے سفرنامے، ان کا حلقۂ احباب اور ان سب سے بڑھ کر ان کا فضل و کمال ایک متجسس ذہن کی گواہی دیتے ہیں۔ ان کے علمی شاہکار الفاروق کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور ان کی دوسری اہم تصانیف 'شعر العجم' بھی اپنی منفرد شناخت رکھتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ گزشتہ ایک صدی سے شبلی اکادمی نے علم و تحقیق، بطور خاص سیرت النبیؐ، اسلام کی ابتدائی تاریخ، قرآنیات، عہد وسطیٰ پر ترکیز کے ساتھ ہندوستانی تاریخ، اردو، فارسی اور عربی ادب اور ادبی شخصیات کے حوالے سے نہایت وقیع خدمات انجام دی ہیں۔ اس کی مطبوعات کا مجموعہ متاثر کن ہے اور ماضی و حال کی علمی کاوشوں کو نذرانہ ہے۔ جمہوریۂ ہند کے مسلمان اور ہندوستانی بجا طور پر اسے اپنی وراثت کا ایک اہم حصہ تصور کرتے ہیں۔ نائب صدر نے کہا کہ ہماری وسیع اور متنوع آبادی کا کوئی بھی حصہ بحیثیت شہری، حکومت سے چار بنیادی مطالبات کے تقاضے کا حق رکھتا ہے: سماجی امن، تحفظ اور تشخص کی حفاظت، مناسب تعلیم کے ذریعے امپاورمنٹ، روزگار اور ریاستی اسکیموں میں مناسب اور مساوی حصہ داری کیونکہ غیر مساوی معاشی مواقع، غیر مساوی، نتائج کا سبب بنیں گے اور نتیجتاً سیاسی قوت کے حصول میں عدم مساوات پیدا ہوگی۔ نیز فیصلہ سازی میں مناسب حصہ داری۔ 'سب کا وکاس، سب کے ساتھ' کا ہدف درست اور قابل قدر ہے اس کے لیے ایک مشترکہ نقطۂ آغاز اور مطلوبہ رفتار سے سب میں شانہ بشانہ چلنے کی صلاحیت ضروری ہے۔ شبلی اکادمی کے ڈائریکٹر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے اپنے استقبالیہ خطبے میں کہا کہ علامہ شبلی کے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا ہمیں عہد کرنا چاہیے کہ ہم ان کے اس مشن کی تکمیل کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے اور وطن عزیز کے مختلف طبقوں اور قوموں کے درمیان بھائی چارہ، اتحاد، یگانگت، یکجہتی اور محبت کا جو پیغام علامہ شبلی نعمانیؒ نے ایک صدی قبل دیا تھا، اس کو ہندوستان کے ہر گھر اور ہر فرد تک پہنچائیں گے۔ ریاستی حکومت کے نمائندہ کے بطور کابینی وزیر برائے جیل بلرام یادو نے نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ دارالمصنفین اور شبلی کالج اعظم گڑھ کی شناخت ہیں۔ علامہ شبلی نعمانیؒ نے ان اداروں کو جس مقصد کے لیے قائم کیا تھا یہ آج بھی اسی راہ پر گامزن ہیں۔ آخر میں دارالمصنفین شبلی اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں نے مہمان خصوصی نائب صدر حامد انصاری، حکومت اترپردیش کے نمائندے وزیر جیل بلرام یادو و دیگر مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس جلسے میں بڑی تعداد میں عمائدین شہر اور طلبہ و طالبات موجود تھے۔ نظامت شبلی اکادمی کے ڈائریکٹر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے کی۔

سیمینار کے دوسرے دن آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر اور دارالعلوم ندوۃ العلما کے ناظم مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے اپنے خطاب میں کہا کہ ملک میں ایک مرتبہ پھر 1857 جیسے حالات پیدا ہو رہے ہیں۔ لہٰذا علامہ شبلی وراثت کو مزید توسیع دیتے ہوئے مسلمانوں میں وسیع طور پر علم کی روشنی پھیلانے کی سخت ضرورت ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے سابق صدر پروفیسر اخترالواسع نے اس موقعے پر کہا کہ شبلی اکادمی کے 100 سال مکمل ہونے پر اس ادارے کو یونیورسٹی بنانے کا فیصلہ کر کے مولانا شبلی نعمانی کو سچا خراج عقیدت پیش کیا جا سکتا ہے۔ اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے سابق وائس چانسلر شمیم جے راجپوری نے کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ علامہ شبلی نعمانی کے شاگردوں میں سے سید سلیمان ندوی اور عبدالسلام ندوی جیسی شخصیات نے ان کے مشن کو آگے بڑھایا۔ امیر جماعت اسلامی ہند مولانا سید جلال الدین عمری نے کہا کہ کسی بھی قوم کا بڑا سرمایہ اس قوم کی اہم شخصیات ہوتی ہیں جو منارۂ نور کی طرح ہوتی ہیں۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 30 نومبر و یکم دسمبر 2014

شبلی نعمانی پر توسیعی خطبہ

اعظم گڑھ: محمد مسعود خاں ڈگری کالج منگراواں میں علامہ شبلی نعمانی کے تعلیمی مشن پر ایک توسیعی لکچر کا انعقاد کیا گیا جس میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر ابوسفیان اصلاحی نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ علامہ شبلی نعمانی اور سرسید احمد خاں ملت کے دو ایسے عظیم محسن تھے جنھوں نے مسلمانوں میں نہ صرف تعلیمی رجحان کو بڑھایا بلکہ سرسید نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور مولانا شبلی نعمانی نے شبلی کالج اور دارالمصنفین کو قائم کیا۔ اس کے علاوہ مدرسۃ الاصلاح بھی انھیں کی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ علامہ بچوں کے ساتھ ساتھ بچیوں کی تعلیم کے بھی زبردست حامی تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ جس ملک و قوم کی خواتین تعلیم یافتہ اور تہذیب یافتہ ہوتی ہیں وہ ملک مہذب کہلاتا ہے۔ ڈاکٹر محمد ارشد اعظمی نے کہا کہ علامہ شبلی نعمانی بیک وقت کئی شخصیتوں کے مالک تھے۔ پروگرام کی صدارت ڈاکٹر انیس احمد و نظامت ڈاکٹر محمد ارشد اعظمی نے کی۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5 دسمبر 2014

شبلی نعمانی پر دوروزہ قومی سیمینار کا افتتاح

لکھنؤ: خواجہ معین الدین چشتی اردو، عربی-فارسی یونیورسٹی لکھنؤ میں 'اردو اور فارسی ادب کے فروغ میں علامہ شبلی نعمانی کا حصہ' کے موضوع پر دوروزہ نیشنل سیمینار کا انعقاد کیا گیا پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے یونیورسٹی کی کوششوں کی ستائش کی اور اس سمت میں شبلی شناسی کی اس کوشش کو بہت مستحسن

دائیں سے: پروفیسر مجاور حسین رضوی، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، پروفیسر خان مسعود احمد، پروفیسر اختر الواسع اور پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

جس میں کلیدی خطبہ پروفیسر مجاور حسین رضوی نے پیش کیا۔ انھوں نے شبلی نعمانی کی ہمہ جہت شخصیت کے بعض اہم اور روشن پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر اختر الواسع، کمشنر برائے لسانی اقلیات، حکومت ہند نے کہا کہ شبلی ایک ایسی شخصیت ہیں جن کی عظیم تصنیف شعرالعجم آج بھی ہندوستان کے علاوہ ایرانی یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔ اس سے شبلی کی تاریخ کے موضوع پر گرفت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مہمان ذی وقار کی حیثیت سے قدم بتایا۔ اپنے خطاب میں انھوں نے شبلی نعمانی کی باغ وبہار شخصیت کا ذکر کیا اور ملک وقوم کے تئیں ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔ پروفیسر خواجہ اکرام نے یونیورسٹی اور کونسل کے بہتر روابط کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ پروگرام کی صدارت یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر خان مسعود احمد نے کی۔

افتتاحی پروگرام کے بعد سیمینار کے پہلے تکنیکی سیشن کی صدارت پروفیسر محمود الحسن نے کی جس میں ڈاکٹر عمیر منظر، ڈاکٹر شاہ محمد، پروفیسر علیم اشرف اور پروفیسر شافع قدوائی نے اپنے مقالات پیش کیے۔ شبلی سے پہلے اردو تنقید محض تذکروں اور نظریاتی مباحث پر مشتمل تھی۔ اسے باضابطہ تنقید کا عملی نمونہ بنا کر شبلی نے اپنے بعد کے ناقدین کے لیے ایک شمع ہدایت روشن کی۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر مجاور حسین رضوی نے کیا۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے اپنی گفتگو میں کہا شبلی نے حیدر آباد میں بیٹھ کر 'موازنۂ انیس و دبیر' تصنیف کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حیدر آباد میں داغ کا طوطی بولتا تھا، غزل اپنے بام عروج پر تھی۔ ایسے حالات میں مرثیہ جیسی متمول صنف کو تنقید وتبصرے کا موضوع بنایا۔ ڈاکٹر وسیم بیگم، ڈاکٹر خالد سیف اللہ، ڈاکٹر صالحہ رشید نے اپنے بیش قیمت مقالوں میں شبلی کے تنقیدی افکار پر گفتگو کی۔

ڈاکٹر سراج اجملی، ڈاکٹر امتیاز احمد، پروفیسر عید محمد انصاری، ڈاکٹر اشہد کریم، ڈاکٹر عباس رضا نیر، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر عمر کمال الدین، نے بھی اپنے مقالوں سے شبلی شناسی میں قابل قدر اضافہ کیا جبکہ پروفیسر ابن کنول نے شبلی کی مختلف جہات پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے پہلے سیشن کے صدارتی خطبے میں علامہ شبلی کو اردو تنقید کی عبقری شخصیت قرار دیا۔ سیمینار کے آخری سیشن میں پروفیسر شافع قدوائی نے گراں قدر معلومات افزا اور پرمغز صدارتی خطبہ پیش کیا۔ ڈاکٹر ثوبان سعید کے کلماتِ تشکر پر سیمینار کا اختتام ہوا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر ثوبان سعید، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، خواجہ معین الدین چشتی، اردو عربی-فارسی، یونیورسٹی، لکھنؤ، 30 نومبر 2014

علامہ اقبال کا 137 واں یومِ پیدائش

علی گڑھ میں سیمینار

علی گڑھ: علامہ اقبال صرف شاعر ہی نہیں بلکہ وہ ایک عظیم اسلامی فلاسفر تھے جس کا اثر ان کی شاعری میں بھی واضح طور پر نظر آتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر رضاء اللہ خاں نے ملت بیداری مہم کمیٹی علی گڑھ کے زیر اہتمام علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے یوم پیدائش کے موقعے پر 'اقبال اور مولانا رومی' موضوع پر منعقدہ سیمینار کی صدارت کرتے ہوئے کیا۔ ایم بی ایم سی کے سکریٹری جسیم محمد نے کہا علامہ اقبال کے تمام فلسفۂ حیات اور شاعری پر مولانا رومی کا اثر ہے۔ ڈاکٹر محمد شاہد نے کہا کہ علامہ اقبال پر رومی کے علاوہ مغربی فلسفیوں فریڈرک، ہینری اور گوئٹے کا بھی اثر تھا۔ این جمال انصاری نے کہا کہ علامہ اقبال کسی ایک زبان، تہذیب اور ملک کے شاعر نہیں تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 10 نومبر 2014

بلند شہر میں جلسہ اور سیمینار

میرٹھ: علامہ اقبال کی معنویت اس عہد میں یہ ہے کہ ان کے نظریات بالخصوص خودی اور جہد وعمل آج بھی قوموں کی ترقی و بقا کے لیے ضروری ہیں۔ ان خیالات کا اظہار صدر شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے خصوصی مقرر کی حیثیت سے انجمن شمع ادب، سیانہ، بلند شہر کی جانب سے منعقدہ قومی سیمینار بعنوان 'عہد حاضر میں علامہ اقبال کی معنویت' میں کیا۔ انجمن شمع ادب سیانہ کے زیر اہتمام علامہ اقبال کے یوم پیدائش کے موقعے پر مذکورہ عنوان پر مدرسہ تجوید القرآن، محلّہ قاضی خیل میں بھی یک روزہ قومی سیمینار کا اہتمام کیا گیا۔ اس میں مہمان خصوصی کے طور پر بدرالاسلام، مہمان اعزازی کے بطور پر سید افضل علی، طاہر علی سیفی، عباس احمد خاں اور مقالہ نگاران کے بطور محمد داؤد، ڈاکٹر آصف علی اور ڈاکٹر شاداب علیم شریک ہوئے۔

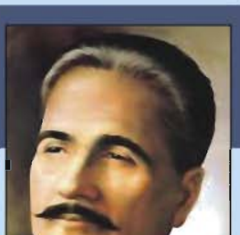

صدارت ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے اور نظامت ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے کی۔ اس موقعے پر ضلع بلند شہر میں اردو مضمون میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والے تعلیم وتربیت انٹر کالج، جلالپور کے طالب علم کو مومنٹو سے نوازا گیا۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 نومبر 2014

اعظم گڑھ میں جشن اقبال

مبارکپور، اعظم گڑھ: علامہ اقبال ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے تحت گرلس انٹر کالج میں جشن اقبال منعقد ہوا، جس کی صدارت ظفیر احمد انصاری اسسٹنٹ کمشنر سیل ٹیکس مئو، نظامت عامر فہیم نے کی اور بطور مہمان خصوصی ڈاکٹر شکیل صمدانی پروفیسر شعبۂ قانون علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تھے۔ چیئرمین نگر پالیکا ڈاکٹر شمیم احمد انصاری کے ذریعے استقبالیہ

پیش کرنے کے بعد ڈاکٹر شکیل صمدانی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ علامہ اقبالؒ کی شخصیت ایک ایسے مجموعہ علم ودانش کی تھی جس کی تابانی قیامت تک برقرار رہے گی۔ اسسٹنٹ کمشنر سیل ٹیکس مئوظفیر احمد انصاری، نسیم احمد ایڈوکیٹ بھیونڈی اور چیئرمین ڈاکٹر شمیم احمد انصاری نے بھی خطاب کیا۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 نومبر 2014

پٹنہ میں تقریب

پٹنہ: شاعر مشرق علامہ اقبال کے یومِ پیدائش کے موقعے پر راجدھانی کے انجمن اسلامیہ ہال میں پرائیویٹ اسکولس اینڈ چلڈرن ویلفیئر ایسوی ایشن کے زیر اہتمام تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں ریاست کے تقریباً 25 پرائیویٹ اسکولوں کے طلبا و اساتذہ کے علاوہ مقامی

لوگوں نے شرکت کی۔ مہمان خصوصی وزیر اقلیتی فلاح و بہبود نوشاد عالم نے عوام بالخصوص طلبا و طالبات کو اس تقریب کا مرکز گردانتے ہوئے انھیں اقبال کی تعلیمات اور پیغامات کو اپنے لیے مشعل راہ بنانے کی تلقین کی۔ اردو اکادمی کے سکریٹری امتیاز احمد کریمی، اشرف استھانوی، چلڈرن ایسوی ایشن کے صدر سید شمائل احمد نے خراجِ عقیدت ادا کیا۔ طلبا و طالبات نے اقبالیات پر مضامین اور مقالے پیش کیے۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 نومبر 2014

علی گڑھ میں جلسہ ومشاعرہ

علی گڑھ: علی گڑھ میں پرچم پارٹی آف انڈیا نے اپنی دیرینہ روایت کو برقرار رکھتے ہوئے شاعر مشرق حضرت علامہ اقبال کے یوم پیدائش کو بطور 'یومِ اردو' منایا۔ اس سلسلے میں ایک عوامی جلسے اور مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ہندوستان کے معروف ادیب پدم شری قاضی عبدالستار نے کی اور کلیدی خطبہ پروفیسر فرحت اللہ خاں نے پیش کیا۔ صدر جلسہ قاضی عبدالستار نے اس موقعے پر کہا کہ پرچم پارٹی کے ذریعہ تحفظ اردو کے لیے چلائی جانے والی تحریک یومِ اردو کا انعقاد کرنے کی روایت قابل ستائش ہے۔ علامہ اقبال کے پیغام کو آج کی نوجوان نسل کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ کلیدی خطبے میں پروفیسر فرحت اللہ خاں نے کہا کہ اردو ہماری گنگا جمنی تہذیب اور مشترکہ قومیت کی علامت ہے۔ جلسے کے سرپرست پرچم پارٹی کے قومی صدر سلیم پیرزادہ نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 11 نومبر 2014

غالب انسٹی ٹیوٹ میں 'مطالعاتِ اقبال کی نئی جہتیں' کے موضوع پر منعقدہ پروگرام میں مائک پر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، جبکہ اسٹیج پر دائیں سے ڈاکٹر رضا حیدر، ڈاکٹر سہیل عمر اور سید ضرغام رضا

غالب اکادمی دہلی میں سیمینار

نئی دهلی: شاعر مشرق علامہ اقبال کے یومِ پیدائش کے تعلق سے 'اردو زبان کا تحفظ اور ہماری ذمے داریاں' پر منعقدہ سیمینار میں کلیدی خطاب کرتے ہوئے اقلیتی کمیشن برائے تعلیمی ادارہ جات کے چیئرمین جسٹس سہیل اعجاز صدیقی نے کہا کہ زبانیں قوموں کا شجرہ ہوا کرتی ہیں۔ اردو کے فروغ کے لیے کمیشن 2007 سے کام کر رہا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ پرائمری اور سیکنڈری سطح پر اردو کی تعلیم کا جب تک انتظام نہیں ہوگا اردو کا فروغ نہیں ہوسکتا۔ کمشنر برائے لسانیات پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ اردو کا منظر نامہ بکھرا ہوا ہے اور اس کی جو صورت حال ہے اس کے لیے ہم سبھی قصوروار ہیں۔ صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ اردو زبان کو کوئی خطرہ نہیں۔ اردو رسم الخط کو خطرہ ہے۔ دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ مغربی کلچر اور ٹی وی کی بول چال ہماری روزمرہ کی زندگی میں اس قدر حاوی ہوگئی ہے کہ ہمارے بچے اردو لفظ کی صحیح ادائیگی نہیں کرپاتے۔ اردو کے فروغ اور تحفظ کے لیے عملی اقدامات کی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالحق، سید منصور آغا، اشرف، سراج الدین نقوی، عارفہ اقبال، جرمنی سے آئیں کلاڈیا پریکل، ہمالیہ ڈرگس کے ڈائرکٹر سید محمد فاروق اور دہلی وقف بورڈ کے چیئرمین چودھری متین احمد نے بھی خطاب کیا۔ روزنامہ 'خبریں' دہلی، 10 نومبر 2014

'اقبال اردو کے پانچ بڑے شاعروں میں شامل'

الہ آباد: نوراللہ روڈ واقع رنگولی گیسٹ ہاؤس میں مرکزی ادبی ادارہ 'اردو گھر' کی جانب سے اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ جلسے کی صدارت عالمی شہرت یافتہ ادیب پدم شری شمس الرحمان فاروقی نے کی انھوں نے صدارتی خطبے میں کہا کہ اردو نے عظیم الشان شعرا کو پیدا کیے ہیں۔ اردو زبان کے پانچ بڑے شعراء میں اقبال شامل ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ مغربی افکار و تہذیب کے حالات سے اکبر نے آگاہ کیا لیکن ان کا دائرہ ہندوستان یا ایشیا تک ہی محدود تھا، مگر اقبال کا دائرۂ فکر عالمی ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ عربی فارسی کے صدر پروفیسر عبدالقادر جعفری نے کہا کہ اقبال فکر اسلام کے ترجمان تھے۔ اسلامی اسکالر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے افکار اقبال پر ان کی فارسی اور اردو شاعری کے حوالے سے روشنی ڈالی اور کہا کہ وہ آفاقی شاعر تھے۔ محمد عبدالقدیر سینئر ایڈوکیٹ ماہر طنز و مزاح نگار فضل حسنین، کرنل سید محمد اختر وحشمت اللہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 نومبر 2014

غالب انسٹی ٹیوٹ میں اقبال پر خطبہ

نئی دهلی: اقبال کی شاعری انسانی فکر و خیال کو جھنجھوڑتی ہے اور بمقصد جدوجہد، خودشناسی، فکر انفس و آفاق اور دوام و تسلسل پر ابھارتی ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار ممتاز ماہر اقبالیات اور اقبال اکادمی لاہور پاکستان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد سہیل عمر نے 'مطالعات اقبال کی نئ جہتیں' کے موضوع پر خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اقبال کے بارے میں شمس الرحمٰن فاروقی نے پچھلے چند برسوں میں جو سوالات اٹھائے ہیں ان پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ انھوں نے فاروقی صاحب کے حوالے سے اُن سوالات پر بھی تفصیلی گفتگو کی۔ اس موقعے پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اقبال کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جن کی مقبولیت ملک اور سرحد سے بے نیاز ہوکر آفاقی ہوگئی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ڈاکٹر سہیل عمر کی نگرانی میں اقبال اکادمی نے کافی ترقی کی ہے یہی وجہ ہے کہ اقبال اکادمی کا شمار برصغیر کے بڑے علمی اداروں میں ہوتا ہے۔ پاکستان سفارت خانے کے سکریٹری اول سید ضرغام رضا نے ہندوستان میں اردو زبان وادب کے تئیں دی جانے والی سرگرمیوں پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اقبال کے حوالے سے پاکستان کے اندر پائے جانے والے ولولے پر روشنی ڈالی۔ آخر میں شاہد ماہلی نے تمام سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 نومبر 2014

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ٹی وی نیوز پروڈکشن فن اور طریقۂ کار

مصنف: سمیع الرحمٰن
صفحات: 217
قیمت: 93 روپے

کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائن

مصنف: خورشید عالم
صفحات: 180
قیمت: 144 روپے

دیوانِ بیدار

مرتب: پروفیسر نسیم احمد
صفحات: 256
قیمت: 122 روپے

اسلوبیاتی تنقید: نظری بنیادیں اور تجزیے

مصنف: پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ
صفحات: 500
قیمت: -/174 روپے

اکیسویں صدی میں اردو کا سماجی و ثقافتی فروغ

مرتب: پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین
صفحات: 549
قیمت: -/235 روپے

اکیسویں صدی میں اردو: فروغ اور امکان

مرتب: پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین
صفحات: 349
قیمت: -/163 روپے

عصری لغت

مصنف: پروفیسر عبدالحق
صفحات: 749
قیمت: 240 روپے

اردو لوک ناٹک: روایت اور اسالیب (حصہ اوّل)

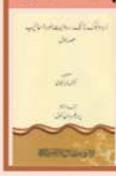

مصنف: کنول ڈبائیوی
ترتیب و ترمیم: پروفیسر ابن کنول
صفحات: 482
قیمت: 170 روپے

اردو لوک ناٹک: روایت اور اسالیب (حصہ دوم)

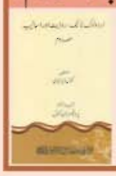

مصنف: کنول ڈبائیوی
ترتیب و ترمیم: پروفیسر ابن کنول
صفحات: 482
قیمت: 162 روپے

حصولِ آزادی کے لیے ہندوستان کی جدوجہد

مترجم: سعید احمد انصاری
صفحات: 680
قیمت: -/234 روپے

عربی ادب کی تاریخ (جلد سوم)

مصنف: عبدالحلیم ندوی
صفحات: 695
قیمت: -/178 روپے

عربی ادب کی تاریخ (جلد اوّل)

مصنف: عبدالحلیم ندوی
صفحات: 372
قیمت: -/112 روپے

انگریزی اصطلاحوں اور محاوروں کی جدید صحافتی فرہنگ

مصنف: سید راشد اشرف
صفحات: 493
قیمت: -/238 روپے

ابتدائی نفسیات

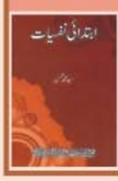

مصنف: سید محمد حسن
صفحات: 240
قیمت: -/94 روپے

بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا

مصنف: اختر اورینوی
صفحات: 347
قیمت: -/124 روپے

کاغذ کا واسدیو

مرتب: پریم ناتھ در
صفحات: 118
قیمت: -/63 روپے

اسلامی سماج

مصنف: ریوبن لیوی
مترجم: ڈاکٹر مشیر الحق
صفحات: 701
قیمت: -/224 روپے

ناول اور عوام

مصنف: رالف فاکس
مترجم: ڈاکٹر سید محمود کاظمی
صفحات: 186
قیمت: -/84 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, January-2015, Vol.17, Issue:01
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2014-16
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/12/2014
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, FAROGH-E-URDU-BHAWAN, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025 and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 80 GSM Art Paper produced by JK Editor :Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Tel : 49539000